تحقیقی مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی۔اُردو

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین کا نسائی شعور: تجزیہ و تحقیق

محقق:

غزل یعقوب

57-FLL/PHDURDU/S18

نگران:

ڈاکٹر حمیرا اشفاق

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو

شعبہ اردو

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

CENTRAL
LIBRARY
ISLAMABAD

Accession No. TH25432

PhD
89.439871
غزت

اردو ادب - مضمون نگاری
خواتین مضمون نگار
مضمون نگاری - تحقیق و تجزیہ
تہذیب نسواں

بسم الله الرحمن الرحيم

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **GHAZAL YAQUB**

Title of the Thesis: تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین کا لسانی شعور: تحقیق و تجزیہ

Registration No: **57-FLL/PHDURD/S18**

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Doctor of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee:

16/09/22

Dr. Kamran Abbas Kazmi
Chairperson
Department of Urdu, IIU
Islamabad

External Examiner 1:

16/09/22

Dr. Fozia Aslam
Professor
Department of Urdu, NUML
Islamabad

External Examiner 2:

Dr. Robina Shahnaz
Professor
Department of Urdu, NUML
Islamabad

Internal Examiner:

Dr. Saira Batool
Assistant Professor
Department of Urdu, IIU
Islamabad

Supervisor:

16/09/22

Dr. Humaira Ishfaq
Assistant Professor
Department of Urdu, IIU
Islamabad

الجامعة الإسلامية العالمية

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبہ اردو

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ غزل یعقوب رجسٹریشن نمبر 57-FLL/PHDURDU/S18 نے پی۔ ایچ۔ڈی۔ اُردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے تحقیقی مقالہ بعنوان **"تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین کا نسائی شعور: تجزیہ و تحقیق"** میری نگرانی میں رقم کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

نگران: ڈاکٹر حمیرا اشفاق

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

فہرست موضوعات

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	مقدمہ	
۱۔	**باب اوّل:**	
	نوآبادیاتی ہندوستان میں خواتین کی مجلاتی صحافت: اجمالی جائزہ	۱
	حوالہ جات	۳۳
۲۔	**باب دوم:**	
	تحریک تعلیم نسواں اور تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین کا نسائی شعور	۳۶
	حوالہ جات	۱۰۲
۳۔	**باب سوم:**	
	تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین کا نسائی شعور اور حقوق نسواں: برصغیر کی سماجی صورت حال کے تناظر میں	۱۲۲
	حوالہ جات	۱۶۲
۴۔	**باب چہارم:**	
	ازدواجی زندگی کے مسائل اور تربیت نسواں: تہذیب نسواں کی مصنفین کے افکار کی روشنی میں	۱۷۱
	حوالہ جات	۲۰۳
۵۔	**باب پنجم:**	
	آداب معاشرت اور تہذیب نسواں کی مصنفین کی سماجی آگاہی	۲۱۱
	حوالہ جات	۲۴۴
	ماحصل	۲۵۴
	کتابیات	۲۶۰
	ضمیمہ	۲۶۶

پیش لفظ

مغرب سے اٹھنے والی تعلیم و شعور نسواں کی تحریک نے مشرق کو بھی اپنی لپیٹ میں لیا۔ یہاں کے افراد نے ابتدا میں تو اس کی سخت مذمت کی لیکن بعد ازاں چند محسننین نسواں کی خدمات کے ثمر میں عورتوں کے لیے روایات کے پاس اور اقدار کے تحفظ کی سختی کم پڑنا شروع ہو گئی۔ اور انھیں بھی مردوں کی طرح اپنے جائز شرعی اور شہری حقوق ملنا شروع ہو گئے۔ ہندوستان کی مستورات کے حقوق کے حصول کے لیے کی گئی کوششوں میں اہم ترین، ان رسائل کا اجرا تھا جو خصوصی طور پر خواتین کے لیے شائع کیے جاتے تھے۔ کیونکہ ہندوستان کے سماجی ڈھانچے میں عورت کے لیے گھر سے باہر نکل کر تعلیم کا حصول ناممکن تھا اسی لیے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے ایسے رسائل جاری کیے گئے جو ان خواتین کو مذہبی ضرورتوں اور وقتی تقاضوں سے ہم آہنگ کر سکیں۔ ان جرائد میں ہر طبقے اور مکتب فکر کی عورت کے لیے معلومات موجود تھیں جو ان کی فکری آبیاری کے لیے موزوں تھی۔

یہ رسائل جن بنیادی مقاصد کے تحت اپنی خدمات سرانجام دے رہے تھے ان میں تعلیم نسواں، آزادی نسواں، مذہبی تعلیمات سے آگہی دلانا، ہر قوم و مذہب کی ہندوستانی عورتوں میں اتحاد اور ایکا پیدا کرنا، عورتوں کو معاش کے وسائل بتانا، عورتوں کو ترقی یافتہ ممالک کے حوالے سے معلومات فراہم کرنا تاکہ وہ اپنی حالت کو سنوارنے کی کوشش کریں۔ قدیم فرسودہ رسومات سے انحراف کرنے کی ترغیب دینا تاکہ وہ ہر برے رواج اور فضول خرچی اور بری عادت سے بچ سکیں اور اپنی ذات، اولاد، گھر اور اپنی قوم کی اصلاح کے لیے تیار رہیں۔

مندرجہ بالا تمام رسائل نے خواتین کی تعلیم و تربیت میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ انھیں باشعور بنانے اور وقتی تقاضوں کے مطابق اپنی زندگی کو بہتر بنانے میں مشعل راہ کا کام کیا یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ اگر ان رسائل کا اجرا نہ ہوتا تو ہم اردو کے منظر نامے پر اتنی نامور خواتین ابھر کر سامنے نہ آتی، جنھوں نے بعد ازاں ادب میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔

اسی سلسلے کی ایک کڑی تہذیب نسواں کا اجرا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ خواتین کے لیے جاری کیے گئے رسائل میں یہ پہلا رسالہ تھا جس کی ادارت ایک خاتون کر رہی تھی۔ ہم جنس ہونے کے ناطے ایک خاتون دوسری عورت کے مسائل کی نوعیت اور ان کے حل کے طریقے سمجھا سکتی ہے۔ اس سے پہلے خواتین کے لیے جاری کردہ رسائل کی ادارت مرد خود ہی کر رہے تھے جو عورت کی نسبت عورت کے مسائل کا اندازہ اس خوبی سے نہیں لگا سکتے جس طرح ایک عورت لگا سکتی ہے۔ تہذیب نسواں میں لکھنے والی خواتین بہتر سماجی شعور کی

حامل تھیں اس لیے انھوں نے اس دور کی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے نظریات کی پیشکش کی تا کہ اس دور کی خواتین کو باشعور بنایا جاسکے۔

زیر نظر تحقیق تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین کے نسائی شعور کی تحقیق اور تجزیے پر مشتمل ہے۔ مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن میں سب سے پہلے باب میں نو آبادیاتی ہندوستان میں خواتین کی صحافت کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب میں ہندوستان کی سماجی سیاسی صورت حال کو مد نظر رکھتے ہوئے خواتین کے لیے رسائل کے اجرا کی ضرورت اور اہمیت کو بطور خاص موضوع بنایا گیا ہے اور مختلف اوقات میں خواتین کے لیے جاری کیے گئے اخبارات ورسائل کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب دوم میں تحریک تعلیم نسواں اور تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین کے نسائی شعور کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ جس میں تہذیب نسواں میں لکھنے والی مضمون نگار خواتین کے انفرادی نسائی شعور کا جائزہ ان کے ماحول اور معاشرے کے تناظر میں لیا گیا ہے۔

باب سوم میں برصغیر کی سماجی صورت حال کو مد نظر رکھتے ہوئے تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین کے نسائی شعور اور حقوق نسواں کے حوالے سے ان کے افکار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب میں مغربی تحریک نسواں کے عوامل اور اس کے مشرق پر اثرات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے اور دیکھا گیا ہے کہ ہندوستانی عورت مغربی عورت کے افکار و نظریات سے کس حد تک متاثر ہے۔ اس کی فکر مغرب سے متاثر ہے یا اس کی فکر کے سوتے مشرقی تہذیب سے ہی پھوٹتے ہیں۔

باب چہارم نو آبادیاتی ہندوستان میں موجود عورت کی نجی زندگی کے مسائل کا احاطہ کرتا ہے۔ اس باب میں ازدواجی زندگی سے متعلق معاملات کو بطور خاص موضوع بنایا گیا ہے۔ ہندوستانی خواتین کو ان کے مذہبی اور معاشرتی حقوق دلانے کی کوششوں کا جائزہ تہذیب نسواں میں شائع شدہ مضامین کے تناظر میں لیا گیا ہے۔

باب پنجم میں آداب معاشرت کے حوالے سے تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین کی سماجی آگہی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس میں ان مصنفین کے سماجی اور معاشرتی شعور کا جائزہ لیا گیا ہے اور دیکھا گیا ہے کہ انھوں نے مشرقی عورت کو معاشرتی طور پر بہتر بنانے کے لیے کیا اقدامات کیے ہیں۔

تہذیب نسواں کا اجرا ۱۸۹۸ء میں ہوا اور یہ ۱۹۴۹ء تک جاری رہا۔ تقریباً ایک صدی پہلے کے رسائل کی کھوج اور ان تک رسائی ایک مشکل مرحلہ تھی لیکن اس مشکل کو سر احمد سلیم نے میرے لیے آسان بنایا اور اپنی لائبریری **ساؤتھ ایشین ریسورس اینڈ ریسرچ سینٹر** سے استفادے کا موقع فراہم کیا۔ جو رسائل وہاں دستیاب نہ تھے ان کے لیے **مشفق خواجہ آن لائن لائبریری** سے استفادہ کیا گیا ہے۔

میرے تعلیمی سفر میں مجھ پر سب سے بڑا احسان ڈاکٹر حمیرا اشفاق کا ہے انھوں نے مجھ میں لکھنے پڑھنے کا حوصلہ پیدا کیا اور بی۔ ایس (اردو) سے لے کر پی ایچ ڈی تک میرا ہاتھ تھامے رکھا اور مجھے کبھی کمزور نہ پڑنے دیا۔ اس مقالے کی تکمیل اس قدر آسان نہ تھی اگر ڈاکٹر حمیرا اشفاق جیسی بہترین نگران اور شفیق استاد کا ساتھ نہ ہوتا۔ جب جب میں کسی مرحلے پر پریشان ہوئی یا گھبرائی تب تب انھوں نے میری ہمت بڑھائی اور مجھ میں حوصلہ پیدا کیا کہ محنت اور لگن سے ہر کام آسان ہو جاتا ہے۔ ان کے ہمہ وقت تعاون اور پر خلوص محبتوں کے لیے شکریہ کا لفظ بہت چھوٹا ہے، میں اس قابل نہیں کہ الفاظ میں ان کا شکریہ ادا کر سکوں۔

شعبہ اردو کے تمام اساتذہ بالخصوص ڈین کلیہ زبان وادب، ڈاکٹر نجیبہ عارف کا بھی شکریہ۔ جنھوں نے خاکے کی تیاری کے مراحل میں مجھے اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔ مقالے کی ابتدا سے تکمیل تک میری رفیق کار ڈاکٹر غلام فریدہ کی مشاورت اور ڈاکٹر روبینہ پروین کی کام جلدی مکمل کرنے کی تلقین سے مجھے بہت مدد ملی۔ ڈاکٹر نعیمہ بی بی نے خاموشی سے بہت سے دفتری امور اپنے ذمے لے کر مجھے یکسوئی سے کام کرنے کا موقع دیا۔ ان سب کے لیے محبتیں اور نیک تمنائیں۔ میری شاگرد زاہدہ نور اور یسریٰ طاہر کی پر خلوص محبت اور تکنیکی مہارت بھی ہمیشہ میرے ساتھ رہی۔ ان کے لیے کامیابی کی دعائیں۔

میرے تایا ابو جناب علی محمد قریشی کا شکریہ بھی مجھ پر واجب ہے کہ انھوں نے آئی سی ایس کے امتحان کے بعد میری صلاحیتوں کو بھانپا اور انھیں درست سمت عطا کی۔ نا صرف یہ بل کہ اردو ادب سے تعارف میں میری رہنمائی بھی کی۔ ایم ایس میں داخلے سے لے کر پی ایچ ڈی کے مقالے کی تکمیل تک میری ساس کا بھرپور تعاون میرے ساتھ رہا۔ میری تعلیمی مصروفیات کے دوران تقدیس اور برہان کی ذمہ داری اپنے سر لے کر انھوں نے مجھ پر جو احسان کیا اس کا بدلہ میں شاید کبھی نہ چکا پاؤں۔ پاپا، امی کی دعاؤں، محبتوں اور عنایتوں کا شکریہ کہ انھوں نے اپنی تربیت سے میری فکر کو ایک مثبت سمت عطا کی اور ہر اس وقت میں میری رہنمائی کی جب مجھے ان کی مدد درکار تھی۔ چھوٹے بھائی سعود کی ہمہ وقت مدد کا شکریہ کہ جب جب اس کی ضرورت پیش آئی اس نے انکار نہیں کیا۔ آخر میں میرے شریک حیات ذوالکیف علی کا شکریہ کہ میری خواہش کا لحاظ رکھتے ہوئے میرے لیے پی ایچ ڈی کا مرحلہ سر کرنا ممکن بنایا۔ میری الجھنوں کو سمجھتے ہوئے میرا ساتھ دیا۔ میں جو ہوں انھی کے دم سے ہوں۔ میری پیاری اور بہت ہی سمجھدار بیٹی تقدیس اور ننھے برہان کے لیے محبتیں۔

غزل یعقوب

دسمبر ۲۰۲۱ء

باب اوّل:

نو آبادیاتی ہندوستان میں خواتین کی مجلاتی صحافت: اجمالی جائزہ

باب اوّل:

نو آبادیاتی ہندوستان میں خواتین کی مجلاتی صحافت: اجمالی جائزہ

انیسویں صدی زبان و ادب، خیالات و افکار، طرز معاشرت اور دیگر امور زندگی میں بڑی تبدیلی کا باعث ثابت ہوئی۔ جس کی بڑی وجہ ہندوستان پر انگریزی تسلط کا ہونا تھا کیونکہ انگریز ایک نئی تہذیب و ثقافت، طرز معاشرت اور زبان و بیان کے ساتھ آئے جس کا گہرا اثر ہندوستانی قلوب و اذہان پر ہوا۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ناکامی نے ہندوستانی مسلمانوں پر انتہائی برے اثرات مرتب کیے وہ نا صرف اپنے اندر کمزور ہوئے بل کہ انگریزی سامراج کے ظلم و تشدد کا بھی براہ راست نشانہ بنے۔

نو آبادیاتی ہندوستان میں بیک وقت پرانی تہذیب کمزور پڑ رہی تھی اور نئی تہذیب اپنی جڑیں مضبوط کر رہی تھی۔ جنگ آزادی کے بعد ہندوستان کی سماجی حالت کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزوں کے حکومت میں آجانے سے یہاں کے مقامی لوگ زبوں حالی کا شکار ہو گئے۔ اس فیصلہ کن صورت حال میں ہندوؤں نے انگریزوں سے مفاہمت کی پالیسی اختیار کی اور نتیجتاً انھیں مراعات وصول ہونا شروع ہو گئیں تاہم مسلمانوں نے اس بدلتی صورت حال کو قبول کرنے میں جلدی نہ کی جس سے انگریزوں کے دل میں مسلمانوں کے خلاف سختی آگئی۔ اس کا براہ راست اثر ان کے معاش پر بھی ہوا۔ مسلمانوں نے اقتدار چھن جانے کے غم و غصہ کی وجہ سے خود پر انگریزوں سے منسوب ہر شے کے در بند کر دیے۔ جس وجہ سے وہ وقتی تقاضوں سے آشنا نہ ہو سکے اور زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے۔ اس ضمن میں سب سے اہم تعلیم کا میدان تھا۔ مشنریوں کے ہندوستان کی تعلیمی ترقی کے حوالے سے کیے جانے والے اقدامات کسی طور بھی مسلمانوں کے لیے کار گر ثابت نہ ہوئے۔

ان سماجی سیاسی حالات و واقعات کے پیش نظر سر سید نے اس دور کے مردوں کی تعلیم و ترقی کا بیڑا اٹھایا اور انھیں جدید علوم و فنون سے ہم آہنگ کرنے کی کوششیں کی۔ سر سید احمد خان نے اس ضمن میں بہت سی اہم خدمات سر انجام دیں جن میں سر فہرست مختلف تعلیمی مراکز کا قیام اور ایسی سوسائیٹیز کا قیام تھا جن سے مسلمانوں کی فکر کو بہتر بنایا جا سکے۔ سر سید نے تہذیب الاخلاق کے ذریعے مضمون کے پیرائے میں اپنے نظریات کی پیشکش کی جس میں ان کے رفقا نے اہم کردار ادا کیا۔ اس دور میں جہاں مردوں کی تعلیم کی طرف توجہ دی جا رہی تھی وہیں فروغِ تعلیم نسواں کی کوششیں بھی جاری تھیں۔ لیکن اس کی بہت مخالفت کی گئی۔ مشنریوں کے کھولے گئے سکولوں میں ہندوستانی خواتین کی تعلیم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کیوں کہ انھیں یہ خطرہ لاحق تھا کہ غیر مذہب کی خواتین سے

میل جول میں خواتین اپنا مذہب تبدیل نہ کر لیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جب ہندوستان میں تعلیمی امور سر انجام دینا شروع کیے تو ابتدا میں انھوں نے بھی محض مردوں کی تعلیم کی طرف توجہ دی کیوں کہ انھیں معلوم تھا یہاں کی فضا خواتین کی تعلیم کے لیے موزوں نہیں ہے۔ ۱۸۱۹ء میں انھوں نے تعلیم نسواں کے لیے کوششیں شروع کیں لیکن تو بہت سے سماجی، مذہبی اور سیاسی معاملات رکاوٹ بنے جس کی ایک وجہ نجم السحر اعظمی کے مطابق:

مشنریوں کے ذریعے چلائے گئے اسکولوں میں اونچی ذات کے ہندو اور مسلمان اپنی لڑکیوں کو بھیجنا پسند نہیں کرتے تھے، کیوں کہ تبدیلی مذہب کا خطرہ تھا۔ خود برطانوی حکومت نے لڑکیوں کے سکول کی سرپرستی قبول نہیں کی تھی، کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان میں تعلیم نسواں کے خلاف تعصب کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ لڑکیوں کی تعلیم کی کوشش شدید رجحان پیدا کرے گی۔[1]

ہندوستان کی عوام تو ایک طرف سر سید احمد خان جیسے مدبر بھی خواتین کی تعلیمی ضرورت کو محسوس نہ کیا۔ وہ جہاں مردوں کی تعلیم کے زبردست حامی تھے وہیں انھوں نے خواتین کی تعلیم کو نا صرف غیر ضروری قرار دیا بل کہ اس کی شدید مذمت بھی کی۔ لیکن ان کے رفقائے کار میں سے حالی اور ڈپٹی نذیر احمد نے اس حوالے سے خاص خدمات سر انجام دیں۔ نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں جہاں عورت کی نجی زندگی اور ازدواجی زندگی کے معاملات کو بہتر بنانے، سماجی مسائل و مصائب سے تبرد آزما ہونے سے متعلق تعلیم دی وہیں ان سے پہلے مشنریوں نے بھی وقتی تقاضوں کے مطابق تعلیم نسواں کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ اس حوالے سے ولیم میور، ہنٹر، لارڈ بینٹنگ اور لارڈ ڈلہوزی کے نام سر فہرست ہیں۔ جنھوں نے قدیم رسومات سے انحراف کیا اور نئی راہیں متعین کیں۔ انھوں نے خواتین کے لیے سکولوں اور کالجوں کے قیام کی طرف توجہ دی جس کی ایک کڑی ہندوستانی خواتین کا پہلا تعلیمی ادارہ بیتھون کالج تھا۔ ۱۸۴۹ء میں تعلیم نسواں سے متعلق تاریخ ساز فیصلہ کیا گیا جس کے بعد خواتین کی رسمی تعلیم کے لیے اقدامات کیے گئے۔ لارڈ ڈلہوزی نے بنگال کی تعلیمی مجلس کو احکامات جاری کیے کہ اب سے عورتوں کی تعلیم کو بھی اس کی ایک شاخ قرار دیا جائے۔[2] ہندوستانی تعلیمی تاریخ میں ڈیوڈ ہیر کا نام بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ جنھوں نے انجمن اطفال کی بھرپور مالی معاونت کی۔ اس حوالے سے پروفیسر پالٹن کی خدمات بھی قابل ذکر ہیں جنھوں نے اسٹوڈینٹس لٹریری سوسائٹی قائم کی جس کے زیر سایہ لڑکیوں کے بہت سے سکول قائم کیے گئے۔ ولیم میور کو ہندوستانی عورتوں کی تعلیم سے گہری دلچسپی تھی۔ مدرستہ العلوم، علی گڑھ کے ایک جلسے میں اردو تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مصری مسلمانوں کی طرح یہاں کے لوگ بھی لڑکیوں کی جدید تعلیم کا بندوبست کریں۔ انھی کی تحریک پر ہندوستان میں مسلمان لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے ایسی کتابیں لکھی جانے لگیں جو انھیں

جدید تعلیم کی طرف مائل کر سکیں۔ اس سلسلے میں لکھی جانے والی کتب پر انعام بھی رکھا گیا تا کہ لوگ اس امر کو دلجمعی سے سرانجام دیں۔ انعام لینے والی کتب میں ڈپٹی نذیر احمد کی مراۃ العروس، بنات النعش، مولوی کریم الدین کی تذکرۃ النساء، محمد حسین خاں جج کی تہذیب نسواں اور محمد ظہور الدین خاں کی تعلیم نسواں قابل ذکر ہیں۔ جن سے خواتین کی تعلیم کے حوالے سے سماجی رویے اور سوچ میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ [۳]

ہندوستان میں تعلیمی اقدامات میں محض مردوں نے کوششیں نہیں کی بل کہ کچھ خواتین بھی اس پر عمل درآمد کر رہی تھیں۔ محمد امین زبیری ہندوستان میں خواتین کی تعلیم و ترقی کے لیے کیے جانے والے اقدامات کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> شروع میں گورنمنٹ اس کے بالکل خلاف تھی۔ صرف لیڈی ہیسٹنگس نے ذاتی طور پر مس کک کو اپنی طرف سے تھوڑی سی مدد دی (جنھوں نے کلکتہ اسکول جاری کیا تھا) پھر ان کی جانشین لیڈی لہرسٹ نے برائے نام امداد کی۔ [۴]

جنگ آزادی کے بعد مس کارپنٹر نے بھی تعلیم نسواں کے لیے اہم ترین اقدامات کیے۔ اس کے بعد تعلیم نسواں کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہو گئی اور متعدد سکول بنائے گئے اور ان میں تعلیم کی ترویج کے لیے کم فیسیں بھی رکھی گئی۔ ۱۸۸۲ء میں ہنٹر کمیشن نے نظام تعلیم نسواں میں بہت سی خرابیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھیں درست کرنے کی ہدایت دی اور مالی معاونت بھی کی علاوہ ازیں خواتین کی کم فیس وصول کرنے کا حکم بھی سختی سے دیا۔ اسی دوران مولوی سید امداد علی نے خواتین کے لیے مدرستہ العلوم کے اجرا کا فیصلہ بھی کیا لیکن بہ وجوہ اس کا ارادہ منسوخ کر دیا۔ ہندوستان میں تعلیم نسواں کے حوالے سے کیے گئے اقدامات میں سر فہرست مشنری ہی رہے۔ یہاں کے مقامی لوگوں نے اس امر کی طرف زیادہ توجہ نہ دی۔ سر سید احمد خاں نے بھی مسلم مستورات کے لیے تعلیم کا وہی دیرینہ طریقہ کافی سمجھا جو مشزیوں سے پہلے ہندوستان میں رائج تھا۔ وہ انھیں نیک، بردبار، محبت کرنے والی، تمام مشکلات کا بخوبی مقابلہ کرنے والی، بچوں کی بہتر پرورش کرنے والی اور گھر بار کا نظام سنبھالنے والی سے زیادہ کچھ نہ دیکھنا چاہتے تھے۔ اس کا اظہار انھوں نے ۱۸۸۴ء میں خاتونانِ پنجاب کے ایڈریس کے جواب میں ایک تقریر میں کیا۔ مزید یہ کہ سرسید خواتین کے لیے جدید طرز تعلیم کو پسند نہیں کرتے تھے اس کا اظہار بھی انھوں نے ایک تقریر میں کیا کہ

> میں تمھیں نصیحت کرتا ہوں کہ اپنا پرانا طریقہ تعلیم اختیار کرنے کی کوشش کرو وہی تمھارے لیے دین و دنیا میں بھلائی کا پھل دے گا اور کانٹوں میں پڑنے سے محفوظ رکھے گا۔ [۵]

اس صورت میں تعلیم نسواں کے علمبردار مولوی ممتاز علی اور شیخ عبد اللہ بھی خاموش نہ رہ سکے۔ انھوں

نے بھی صورت حال کو سمجھتے ہوئے تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے جدوجہد شروع کی۔ مصنفین نے خاص انداز میں اپنے نظریات پیش کیے۔ جس سے ان کے افکار و خیالات کو زمانے کے وضع کردہ اصول و ضوابط کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی گئی۔ وقتی ضروریات اور بدلتے رجحانات کو مد نظر رکھتے ہوئے اس امر کی طرف بھی خاطر خواہ توجہ دی جانے لگی کہ خواتین کو گھر کی چار دیواری میں مقید رکھنے سے معاشرہ مزید پستی کی جانب گامزن ہو جائے گا اس لیے مختلف افراد نے مختلف نوعیت کی کوششوں سے خواتین کی تعلیم و ترقی کے لیے مناسب اقدامات کیے۔ جن میں خواتین کے لیے ایسے رسائل کا انعقاد کیا گیا جو ان کی بنیادی تعلیم و آگہی کے لیے مددگار ثابت ہو سکیں۔ شروع میں مسلمانوں نے ان کی مذمت بھی کی لیکن شیخ عبداللہ اور مولوی ممتاز علی جیسے رہنماؤں کی بدولت خواتین کی تعلیم کی راہیں بھی کھلیں۔ جس سے انھیں امور خانہ داری اور اس طرح کے دیگر امور میں مہارت کے لیے تربیت دی گئی تاکہ وہ اپنی گھریلو ذمہ داریاں بہتر طور پر سرانجام دے سکیں۔ اس کا براہِ راست اثر اس دور کی خواتین پر بھی ہوا یوں وہ محض امورِ خانہ داری تک محدود نہ رہیں بل کہ جدید علوم سے واقفیت اور آگہی کی خواہاں بھی ہوئیں تاہم ہندوستان میں پردے کا خاص التزام کیا جاتا تھا اس لیے انھیں رسمی تعلیم کی اجازت نہ دی گئی۔ "بیسویں صدی میں خواتین کے ادب کا آغاز اصلاحی مضامین سے ہوتا ہے جن میں سادہ اور آسان پیرائے میں سماجی مسائل پر اظہار خیال کیا گیا۔ ابتدا میں مخصوص سماجی حالات و مسائل کے پیش نظر کئی خواتین فرضی ناموں سے لکھا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں جو لوگ ہندوستان کے منظر نامے میں نئی روشنی اور سوچ بکھیر رہے تھے، ان کے خاندان سے وابستہ خواتین بھی اصلی نام سے اپنی تخلیقات کو منظر عام پر لانے میں تذبذب کا شکار تھیں۔ جب سماج میں تبدیلی کی لہر چلی اور تحریک آزادیٔ نسواں کے زیر اثر صنفی عدم مساوات کے خلاف عوام میں بیداری آئی تو خواتین نے بھی نام کا پردہ ہٹا کر براہ راست سماج سے مخاطب ہونے کی کوشش کی۔"[۶] حاذق الخیری خواتین کے لیے کیے گئے اقدامات کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

> عورتوں کے حقوق کی لڑائی تو نصف صدی سے لڑی جا رہی ہے اور بہت سے مواقع پر جیتی بھی گئی ہے۔ کیوں کہ ایسا تو نہیں ہے کہ ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد پلک جھپکتے ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ پاکستانی عورتوں کی یہ فوج پیدا ہو گئی۔ پچھلے پچاس سال میں مسلمان قوم کے بڑے آدمیوں علامہ راشد الخیری، جسٹس کرامت حسین، شیخ عبداللہ نے عورتوں کے لیے جدوجہد کی ہے۔ ان کے ہاتھ میں قلم تھا۔ ان کے لیے سکول، کالج اور مدرسے کھولے ہیں۔[۷]

ہندوستان کی سماجی و سیاسی حالت کو مد نظر رکھتے ہوئے، خواتین کی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ایسے ادبی جرائد کی ضرورت کو محسوس کیا جانے لگا جو گھر بیٹھے خواتین کو ملکی و عالمی صورت حال سے واقفیت دلا سکیں

اور انھیں جدید علوم سے روشناس کروائیں۔اس کے پیش نظر بہت سے ادبی رسائل خاص طور پر خواتین کے لیے جاری کیے گئے۔ انیسویں صدی میں تہذیب نسواں کے اجرا سے پہلے بھی خواتین کے لیے متعدد اخبارات کا اجرا کیا گیا۔ جن سے خواتین کی تعلیم و ترقی کی راہ ہموار ہوئی ان اخبارات کی تفصیل ذیل میں ہے:

۱۔ مفید عام (آگرہ)، ۱۸۶۹ء:

منشی احمد خاں صوفی نے ۱۸۶۹ء میں آگرہ سے مفید عام جاری کیا۔ مفید عام پندرہ روزہ اخبار تھا جو مہینے میں دو مرتبہ شائع ہوتا تھا۔ جس میں دیگر خبروں کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی مضامین اور نامور شعرا کا کلام شائع ہوتا تھا۔ تعلیمی خبروں کے ساتھ ساتھ تعلیم نسواں سے متعلق معلومات بھی ہوتی تھیں اور مدارس نسواں کے لیے بھی عمدہ عمدہ مضامین لکھے جاتے تھے۔[۸] نو آبادیاتی ہندوستان کے سیاسی سماجی پس منظر کے پیش نظر مفید عام خواتین کے لیے مشعل راہ ثابت ہوا کیوں کہ اس اخبار میں پہلی مرتبہ خواتین کے حقوق کے حوالے سے مضامین درج کیے گئے تھے۔

۲۔ معلم (حیدرآباد دکن)، ۱۸۸۱ء:

رسالہ معلم ۱۸۸۱ء میں مولوی محب حسین کی ادارت میں حیدر آباد دکن سے شائع ہوا۔ ابتدا میں یہ رسالہ ہر مہینے شائع کیا جاتا تھا بعد ازاں اسے ہفتہ وار کر دیا گیا۔ جس میں خواتین کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے مضامین ملتے ہیں۔ اسے اس دور میں خواتین کے لیے جاری کیے گئے رسائل میں شمار تو نہیں کیا جا سکتا لیکن اس میں اس طبقے کے لیے مضامین ضرور شائع کیے جاتے رہے ہیں۔ یہ رسالہ مولوی محب حسین کی ادارت میں نکالا گیا۔ اسی بنیاد پر انھیں خواتین کے لیے لکھنے والے افراد میں نمایاں مقام بھی حاصل ہے۔ اس رسالے میں تعلیم نسواں، حقوق نسواں اور پردے کے حوالے سے مضامین ملتے ہیں۔ جو ان میں شعور و بیداری پیدا کرنے کے لیے موزوں ہیں۔ اسی رسالے کو ۱۸۹۴ء میں معلم نسواں کے نام سے جاری رکھا گیا۔ (جس کی تفصیل اسی باب میں ہے)۔

اس رسالے میں فلسفہ، اخلاقیات، سائنس، طب، تاریخ اور ادب کے حوالے سے مضامین ملتے ہیں۔ ان تمام تعلیمات کے ساتھ ساتھ طبقہ نسواں کی تعلیم و تربیت کی کوشش بھی اس رسالے میں کی گئی۔ خواتین کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ پردے سے متعلق مباحث بھی اس اخبار کی زینت بنے۔ یہ اخبار خالصتاً ادبی تھا اسی لیے زیادہ تر موضوعات ادبی ہی تھے لیکن خواتین کی اصلاح کے لیے "اخبار نسواں" عنوان سے ایک گوشہ خواتین کے لیے مختص کیا جس میں خواتین کو باخبر رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اس رسالے کی وجہ سے خواتین کے لیے ایک شاہکار نظم "مسدس نسواں" بھی منظر عام پر آئی جس میں پہلی مرتبہ خواتین کی خصوصیات کو عالمی تناظر میں پرکھنے، اولاد

پر والدین کے مزاج اور عادات کے اثرات، خواتین کی معاشرتی اور قومی حیثیت، فرسودہ رسوم و رواج اور روایات کی پاسداری، خواتین کی توہم پرستی اور معاشرے میں خواتین کے لیے پردے کی پابندی جیسے مسائل کا جائزہ لیا گیا۔اس اخبار میں عالمی خواتین کے تذکرے سے ہندوستانی خواتین میں یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش کی گئی کہ وہ بھی اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ملک و قوم کی ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکتی ہیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس اخبار کے ذریعے ہندوستانی مستورات کو سماجی صورت حال کے مطابق باشعور بنانے کی کوشش کی گئی۔

۳۔ گل دستہ نتیجہ سخن (کلکتہ)، ۱۸۸۲ء:

مولوی حکیم عبد الصمد کی ادارت میں ۱۸۸۲ء میں گلدستہ نتیجہ سخن کا اجرا ہوا۔ یہ گل دستہ ہر مہینے شائع ہوا کرتا تھا جس میں زیادہ تر ہندوستان کے امرا، والیانِ ریاست اور یورپ و انگلینڈ کے شاہی گھرانے کی خبریں مع تصویر شائع ہوتی تھی۔ تصاویر اور خبروں کے علاوہ ان کا کلام اور دیگر تحقیقی سر گرمیاں بھی شامل کی جاتی تھی۔

گل دستے میں میں ملکی اور عالمی حالات سے متعلق مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ اس میں نظم کا حصہ زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ "پردہ نشین مستورات اور طوائفوں کا طرحی اور غیر طرحی کلام شائع ہو تا تھا یہی اس گلدستے کی خصوصیت تھی"[۹] اس گلدستے نے تعلیم نسواں کے حوالے سے کوئی اقدام تو نہ کیا لیکن خواتین کو ایک ایسا پلیٹ فارم ضرور دیا کہ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کر سکیں۔ نمایاں لکھنے والی خواتین میں بی مشتری سلطان جہاں بیگم، بی سیرہ یہودن طوائف پری، بی خورشید جان طوائف، بی صلحہ یہودن طوائف معشوق اور بی شاداماں طوائف فتنہ کے نام شامل ہیں۔ اس گل دستے کو خصوصی طور پر تعلیم نسواں اور تربیت نسواں سے کوئی سروکار نہیں تھا لیکن اس میں لکھنے والی خواتین کی تحریریں اس دور کی مستورات کی فکر و آگہی کی ترسیل کے لیے بہت مفید ہیں۔

۴۔ گل دستہ پیام یار (لکھنؤ)، ۱۸۸۳ء:

یہ گلدستہ جون ۱۸۸۳ء میں منشی نثار احمد نثار کی ادارت میں جاری ہوا۔ یہ ماہانہ گلدستہ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوا کرتا تھا۔اس میں بھی نظم و نثر کے پیرائے میں خیالات کا اظہار کیا جاتا تھا۔ جس میں غزلیں اور ناول وغیرہ شائع کیے جاتے تھے ایک حصہ مضامین کے لیے بھی مختص تھا۔ اپنے دور میں اس گلدستے کو بہت پذیرائی ملی۔ حسن انتخاب اور مشاہیر کے کلام کی وجہ سے اسے اپنے دور میں بہت اہمیت حاصل رہی۔ مستورات کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس گلدستے میں اس دور کی بہت سی طوائفوں نے اپنا کلام شائع کروایا۔

۵۔ رفیق نسواں (لکھنؤ)، ۱۸۸۴ء:

ہندوستان میں خواتین کی تعلیم و ترقی کے فروغ کے لیے مشنریوں نے نمایاں خدمات سرانجام دیں جس کی

ایک کڑی رسالہ رفیقِ نسواں ہے۔ جس کا خاص مقصد خواتین میں شعور و آگہی پیدا کرنا تھا۔ اس کی تاریخ اجرا کے حوالے سے مختلف آرا ملتی ہیں۔ ۱۸۸۰ء میں لکھنؤ سے رفیق نسواں کے نام سے عورتوں کا پہلا رسالہ جاری ہوا۔ [۱] ڈاکٹر انور سدید اس کے اجرا کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

> عیسائی مشنریوں کی طرف سے ۵ مارچ ۱۸۸۴ء کو لکھنؤ سے اردو اور ہندی میں پندرہ روزہ "رفیق نسواں" اصلاحی اور تبلیغی ضرورتوں کے لیے جاری کیا گیا۔ [۱۱]

ڈاکٹر نسیم آرا نے بھی ۱۸۸۴ء میں اشاعت کی تائید کی ہے۔ رفیق نسواں نے خواتین کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے خصوصی معاونت کی۔ یہ رسالہ خاص طور پر عیسائی عورتوں کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے کے رسائل میں خواتین کے لیے مضامین تو ملتے تھے لیکن کوئی رسالہ ان کے لیے مخصوص نہ تھا۔ رفیق نسواں پندرہ روزہ اخبار تھا اور مہینے میں دو مرتبہ شائع ہوا کرتا تھا۔ اس کی مدیر مسز بیڈلی تھیں۔ ابتدا میں ڈرف ہندی زبان میں شائع ہوا کرتا تھا بعد ازاں ہندی اور بنگالی زبان میں بھی اشاعت ہوئی۔ مسز بیڈلی نے اخبار کے اداریے میں اس کی مندرجہ بالا زبانوں میں اشاعت کی وضاحت بھی پیش کی۔ [۱۲]

مسز بیڈلی نے اخبار کے اداریوں میں تعلیم و ترقی نسواں کی اہمیت کو بار بار واضح کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اردو کے علاوہ دیگر زبانوں میں اس کے اجرا کی کوشش بھی اسی مقصد کے تحت کی کہ جو خواتین اردو سے واقف نہیں ہیں وہ ہندی اور بنگالی میں اس کے مندرجات کا مطالعہ کر سکیں اور مندرجات پر غور و فکر کر کے اپنی حالت سنوار سکیں۔ اس کے لیے انھوں نے ایسی خواتین کو جو پڑھنا لکھنا جانتی ہیں، تاکید بھی کی کہ ان خواتین کو پڑھ کر سنایا کریں تاکہ وہ بھی شعور و آگہی حاصل کر سکیں۔ اس ضمن میں وہ لکھتی ہیں کہ "مجھ کو قوی امید ہے کہ اس پرچے کے ذریعے سے عورتوں کو وہ باتیں، جن کا جاننا ضروری ہے، سب معلوم ہو جائیں گی۔" [۱۳] اس رسالے میں امور خانہ داری، روپے پیسے کے خرچ اور اخراجات کا بہتر طریقے سے پورا کرنا، ازدواجی، نجی اور سماجی زندگی میں بہتری اور تربیت اطفال جیسے موضوعات پیش کیے گئے تاکہ ہندوستانی خواتین بہتر طور سے اپنی ذمہ داریاں نبھا سکیں۔ اس رسالے میں تمام مضامین اصلاحی نوعیت کے حامل تھے۔

۶۔ گل دستہ ناز، بمبئی، ۱۸۸۴ء:

یہ گلدستہ ۱۸۸۴ میں بلقیس جہاں بیگم نے بمبئی سے شائع کیا۔ اس کی مدیر ناظمہ بیگم تھیں۔ اس میں بھی طوائفوں کا کلام شائع کیا جاتا تھا۔ تاریخ کی کتب میں اس گل دستے مختصر تعارف تو ملتا ہے لیکن اس کے بارے میں زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں نہ ہی کوئی پرچے دستیاب ہے۔

۷۔ اخبار النسا (دہلی)، ۱۸۸۴ء:

سید احمد دہلوی نے اگست ۱۸۸۴ء میں خواتین کی تعلیمی ترقی اور شعور و بیداری کے لیے رسالہ اخبار النسا کا اجرا کیا۔ جس میں خواتین کی تحریریں بھی شامل کی گئیں۔ اس رسالے میں خانگی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ ذہنی نشوونما پر بھی خاص طور پر توجہ دی گئی۔ رسالے میں خواتین کی تحریریں شامل ہونے کی وجہ سے سید احمد دہلوی کو برا بھلا بھی کہا گیا لیکن وہ اس خدمت پر ڈٹے رہے۔ ڈاکٹر انور سدید اس کے مندرجات کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

> اخبار النسا نے مشرقی تہذیب کی نگہداشت کی اور قدامت، جہالت اور کم علمی کے اندھیروں کو دور کرنے میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔۔۔۔ خواتین کو تلقین کی جاتی تھی کہ وہ حیا اور شرافت کا دامن نہ چھوڑیں اور خانگی مناقشات سے بچیں۔"[۱۴]

یہ رسالہ مہینے میں تین مرتبہ شائع ہوا کرتا تھا جس کا مقصد خواتین کے حقوق و فرائض کا تعین تھا۔ اخبار النسا کو کسی خاص طبقے اور مذہب کی خواتین کے لیے مختص نہ کیا گیا بل کہ تمام ہندوستانی مستورات کو فائدہ پہنچانے کے لیے جاری کیا گیا۔ اس اخبار میں عورتوں کی اصلاح اور بہتری کے لیے مفید مضامین کا سلسلہ شروع کیا گیا، جن کی زبان صاف، سادہ، سلیس اور عام فہم ہوا کرتی تھی تاکہ کسی بھی طبقے کی خواتین کے لیے مفاہیم کی ترسیل مشکل نہ ہو۔ موضوعات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو تعلیم نسواں، روایات کی پاسداری، امور خانگی داری اور نظام زندگی کی بہتری، اور خانگی زندگی کی بہتری اس کے اہم موضوعات تھے۔ معاصر صورت حال کے حوالے سے ان مضامین نے خواتین کو بہتر شعور عطا کیا اور ایک بڑا طبقہ اس سے مستفید ہوا۔

۸۔ گلدستہ چراغ کعبہ (بمبئی)، ۱۸۸۵ء:

بلقیس جہاں بیگم نے ۱۸۸۵ میں بمبئی سے ناظمہ بیگم کی ادارت میں جاری کیا۔ یہ نعتیہ گلدستہ تھا۔ اس رسالے کے حوالے سے تاریخی کتب میں بھی زیادہ معلومات نہیں ملتی، نہ ہی اس کا کوئی شمارہ میسر ہے۔

۹۔ شریف بیبیاں (لاہور)، ۱۸۹۳ء:

منشی محبوب عالم نے ۱۸۹۳ء میں خواتین کے لیے شریف بیبیاں کا اجرا کیا۔ جس کے سرورق پر یہ عبارت درج ہوا کرتی تھی "تعلیم نسواں کا ماہوار رسالہ جس میں عقلمند لائق بیٹی، سلیقہ شعار نیک بخت بی بی اور مہربان ماں بننے کی ہدایات درج ہوتی ہیں"[۱۵] جیسا کہ اس عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ یہ رسالہ خواتین کی تربیت کے لیے جاری کیا گیا جس میں انھیں اچھی ماں، بہو اور بیٹی بننے کے لیے ہدایات دی جاتی تھیں۔ علاوہ ازیں اس میں معلومات عامہ

اور سماجی معاملات و مسائل سے آگہی کی تربیت بھی دی گئی اور انھیں سماجی اعتبار سے باشعور بنانے کی کوششیں بھی کی گئیں۔ منشی محبوب عالم نے اس رسالے کے اجرا کے مقاصد ان الفاظ میں بیان کیے:

> رسالہ شریف بیبیاں جاری کرنے سے غرض یہ ہے کہ ہندوستان کی لاکھوں بے زبان مخلوقات (فرقہ نسواں) کی خانہ داری کی تعلیم سے متعلق ایسے امور اس میں درج کیے جائیں کہ جس سے نہ صرف ہر ایک گھرانہ بہشت کا نمونہ بن جاوے، بل کہ آئندہ نسل کے اٹھان میں بھی اس سے مدد ملے۔"[1]

مندرجہ بالا اقتباس سے رسالے کے اجرا کی اہمیت اور وضاحت ہو جاتی ہے کہ یہ رسالہ ہندوستانی مستورات کی تعلیم و ترقی کے لیے جاری کیا گیا تھا۔ اس میں تواتر سے ایسے مضامین شائع کیے جاتے تھے جو خواتین کو اپنی حالت بہتر بنانے اور سماج میں بہتر حیثیت دلانے میں معاون تھے۔ رسالے کے مستقل مضامین میں "ممتاز عورتیں"، "زنانہ بہادری کی مثالیں"، امور خانہ داری"، روئے زمین کی عورتیں" اور "شریف بیبیاں" شامل ہیں۔ رسالے میں نا صرف ہندوستانی خواتین کی امثال کے ذریعے مستورات کی تربیت اور ان میں حوصلہ پیدا کیا جاتا تھا بل کہ عالمی سطح پر خواتین کی ترقی اور ان کے کارہائے نمایاں سے بھی ترغیب دلانے کی سعی کی جاتی تھی۔ دیگر موضوعات میں تعلیم نسواں، اسلام میں عورت کا مقام و مرتبہ، تربیت اطفال، امور خانہ داری، آرائش و زیبائش اور اخلاقی تربیت شامل تھے۔

۱۰۔ معلم نسواں (حیدر آباد دکن)، ۱۸۹۴ء:

مولوی محب حسین نے ۱۸۹۴ء میں معلم کو معلم نسواں کا نام دیا۔ جس میں بطور خاص خواتین کے حوالے سے مندرجات پیش کیے گئے۔ جن میں پردہ، عورتوں کی فلاح و بہبود، بچے کی پرورش اور نگہداشت، اور تعلیم و حالت نسواں کے حوالے سے موضوعات پیش کیے گئے۔ اس رسالے میں خواتین مصنفین کی تحریریں بھی شائع ہوئیں۔ رسالے کی غرض و غایت کے بارے میں مولوی محب حسین نے اشتہار معلم نسواں میں لکھتے ہیں کہ:

> "اس کا موضوع عورت ہے جس کی ہر ایک حالت سے بحث کی جاتی ہے اس کی غایت ترقی تعلیم و تہذیب نسواں ہے اور جس کی ضرورت ملک و ملت کو بہت ہے۔"[2]

معلم نسواں میں ہندوستانی نظام میں رائج مسائل نسواں کو بطور خاص پیش کیا گیا۔ اس ضمن میں پردے کے حوالے سے بات کی جائے تو معلم نسواں کے مصنفین میں زیادہ تر نے اسلامی شعار کے مطابق زندگی کے بسر ان کی اہمیت کو واضح کیا۔ انھوں نے پردے کو بھی اسلامی شریعت کے مطابق ترویج دینے کی حمایت کی۔ ان کے مطابق پردے کے نام پر عورتوں کو مقید رکھنا ان کے انسانی حقوق کی پامالی ہے۔ دیگر موضوعات میں عورتوں کی تعلیم، طرزِ

معاشرت، نکاح، مہر اور طلاق کی بخشش، تعدد ازدواج، حقوق نسواں، عورت اور مرد کے یکساں سماجی حقوق، اسلامی شعار زندگی کے مطابق زندگی کا بسر ان، اور تہذیب و تمدن شامل ہیں۔

۱۱۔ تہذیبِ نسواں (لاہور)، ۱۸۹۸ء:

شعور نسواں کے لیے کی گئی کوششوں میں سے اہم ترین کاوش تہذیب نسواں کا اجرا تھا۔ مولوی ممتاز علی کے ساتھ ان کی اہلیہ محمدی بیگم نے بھی خواتین کے لیے بہت سے کام کیے جن میں سے ایک تہذیب نسواں کی ادارت تھا۔ اس کے لیے بہت سے مرد اور خواتین مصنفین نے اپنی اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ایسا ادب تخلیق کرنا شروع کیا جو خواتین کی تعلیم و ترقی کے لیے مفید ہو۔ مختلف مصنفین نے نظم و نثر (افسانوی و غیر افسانوی) میں اپنے اپنے خیالات کی عکاسی کی اور تعلیم نسواں کے لیے راہ ہموار کی گئی۔ سماجی حالات کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ مولوی ممتاز علی اور محمدی بیگم کا اہم ترین کارنامہ ہے کہ انھوں نے خواتین کی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے نہ صرف خود عملی قدم اٹھایا بل کہ آئندہ آنے والی خواتین کے لیے بھی شعور و آگہی کی راہیں ہموار کیں۔ محمدی بیگم اس عہد کا ایک باشعور حوالہ ہیں۔ جنھیں اپنے گرد و نواح کے معاملات کے ساتھ ساتھ عالمی مسائل سے آگہی بھی تھی۔ انھیں اس بات کا احساس تھا کہ عورت کو سماجی اعتبار سے باشعور ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں تہذیب نسواں کو خاص اہمیت اس لیے بھی حاصل ہے کہ یہ اس سلسلے کی ابتدائی کڑی ہے۔ اور دوسری اہم بات یہ کہ یہ رسالہ محمدی بیگم کی ادارت میں شائع ہوتا تھا جو ۱۸۹۸ء میں ایک عورت کے حوالے سے کافی اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ اس دور میں عورت کے نام کا پردہ بھی جائز تھا۔ تہذیب نسواں کے حوالے سے محمدی بیگم کی خدمات کو حاذق الخیری اپنے ایک مضمون میں یوں سراہتے ہیں:

> قرۃ العین حیدر نے سچ کہا تھا کہ "ایسا تو نہیں تھا کہ ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد پلک جھپکتے ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ پاکستانی عورتوں کی یہ فوج پیدا ہو گئی ہے۔ مگر ایسا نہیں تھا اور ہمیں اپنے محسنوں کو نہیں بھولنا چاہیے جن کی دور اندیشی، حوصلے اور لگن سے یہ ممکن ہو سکا۔ ورنہ وہ زمانہ جب محترمہ محمدی بیگم نے آنکھ کھولی تو اس وقت قلم سنبھالنا ایسا تھا کہ لکھنا پڑھنا تو درکنار کوئی عورت یا لڑکی لکھنا بھی چاہے تو اسے اپنے نام سے پردہ کرایا جاتا تھا مثلاً زاہدہ خاتون شیروانیہ (زخ ش)، بلقیس بیگم (و۔ا یعنی والدہ اخلاق)۔۔۔۔[۱۸]

انیسویں صدی کے اواخر میں ہندوستان میں رہتے ہوئے اس کے سماجی ڈھانچے سے انحراف و بغاوت کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ جو لوگ اس دور میں مسلمانوں کی ترقی کے حامی اور نمائندگان تھے انھوں نے بھی تہذیب نسواں کے اجرا اور محمدی بیگم کی ادارت کو سخت ناپسند کیا۔ جس کی ایک مثال سر سید احمد خان کی ہے۔ سر سید جہاں

مسلمان مردوں کی تعلیم کے حق میں تھے وہیں وہ خواتین کی جدید تعلیم کی مخالفت بھی کیا کرتے تھے۔ مولوی ممتاز علی تہذیب نسواں کے اجرا اور اس کے نام کے انتخاب کی بابت لکھتے ہیں کہ جب تہذیب نسواں کے اجرا کا مرحلہ آیا تو میں نے اور میری اہلیہ نے سرسید سے محض نام کی مشاورت کرنا ضروری جانا کیوں کہ اگر ان سے رسالے کے اجرا کا مشورہ لیا جاتا تو وہ ہرگز اس کی اجازت نہ دیتے۔ مولوی ممتاز علی کے رسالے کے نام کے استفسار پر سرسید کا جو جواب موصول ہوا اس کا لب لباب یہ تھا:

> مشفق و محبی مولوی سید ممتاز علی تسلیم۔ عنایت نامہ ملا۔ اگرچہ آپ نے اس باب میں مجھ سے مشورہ نہیں لیا کہ اخبار جاری کرنا مناسب ہے یا نہیں، بل کہ صرف اس کے نام کی بابت دریافت کیا ہے، لیکن چاہے آپ میرا مشورہ پسند نہ کریں، میں یہی کہوں گا کہ آپ عورتوں کے لیے اخبار جاری نہ کریں۔ آپ یقین کریں کہ آپ اسے جاری کر کے پچھتائیں گے اور تکلیف، نقصان اور سخت بدنامی کے بعد اسے بند کرنا پڑے گا۔ لیکن آپ اگر ان سب باتوں کو سمجھ لینے کے بعد جاری کریں تو جو نام آپ نے مجھے لکھ کر بھیجے ہیں، ان میں سے مجھے کوئی بھی پسند نہیں آیا۔ میری رائے میں اگر کوئی اخبار مستورات کے لیے جاری ہی کیا جائے تو اس کا نام تہذیب نسواں ہونا چاہیے۔[۱۹]

مندرجہ بالا اقتباس سے سرسید کے تعلیم نسواں کے حوالے سے تحفظات واضح ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی پیش گوئی درست ثابت نہ ہو سکی، تمام تر مخالفت کے باوجود تہذیب نسواں نے تقریباً نصف صدی تک اپنی صحافتی خدمات سرانجام دیں اور متعدد ایسے نام پیدا کیے جو اردو ادب کے افق پر پوری آب و تاب سے چمکے۔ (شعور و بیداری نسواں کے ضمن میں تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین کی نگارشات کا مفصل احوال آئندہ ابواب میں پیش کیا گیا ہے۔)

۱۲۔ سفیر قیصر (میرٹھ)، ۱۹۰۰ء:

محمد نذیر سعد نے ستمبر ۱۹۰۰ء میں میرٹھ سے سفر قیصر جاری کیا۔ رسالے کی ایڈیٹر نامعلوم خاتون ہیں۔ اس میں تعلیم نسواں کو خاص اہمیت دی گئی اور خواتین کے نجی معاملات کو بہتر بنانے اور ان کی ذہنی نشوونما کی کوششیں بھی کی گئی تھیں۔ تہذیب نسواں کی اشاعت کے بعد یہ پہلا رسالہ ہے جس میں خواتین کی تعلیم و ترقی کے لیے برملا اظہار اور پرزور کوششیں کی گئیں۔ رسالے کے سرورق پر تعلیم نسواں کی عبارت درج کی گئی ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اجرا کا مقصد ہی تعلیم و تربیت نسواں ہے۔

موضوعات کے حوالے سے بات کی جائے تو تمام تر موضوعات خواتین کی تربیت اور تعلیم کے لیے رقم کیے

گئے ہیں ۔ جن میں تعلیم نسواں،اصلاحِ نسواں،امور خانہ داری کی انجام دہی، آدابِ معاشرت،اخلاقیات اور پردے سے متعلق مباحث شامل ہیں۔

۱۳۔ پردہ عصمت (لکھنؤ)، ۱۹۰۰ء:

ماہوار پردہ عصمت ۱۹۰۰ء میں مولانا عبدالحلیم شرر نے جاری کیا۔رسالے میں مدیر کا نام درج نہیں کیا جاتا تھا اس لیے معلوم نہیں ہو سکا کہ کس کی ادارت میں شائع ہوا کرتا تھا۔ حقوق نسواں کے حوالے سے شرر کی خاص اہمیت ہے انھوں نے اپنی دیگر تحریروں بدر النسا کی مصیبت اور آغا صادق کی شادی میں بھی اسلام میں پردے کے تصور اور ہندوستان میں اس کی سختی سے پابندی کے حوالے سے لکھا ہے۔ وہ خواتین کے غیر شرعی پردے کے حق میں نہیں تھے۔ جہاں شرعی حدود سے تجاوز کرتی صورت نظر آئی انھوں نے اس کی خوب مخالفت کی۔ اس رسالے میں بھی اسلامی احکامات کے مطابق خواتین کے ساتھ روا رکھا جانے والا سلوک اور ان کے حقوق پر بہت سے مضامین لکھے گئے۔ ڈاکٹر نسیم آرا کے مطابق شرر تاریخ،ادب اور علوم دینیہ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ حضرت علامۃ العصر نذیر حسین محدث سے علم حدیث پڑھی تھی،اس لیے پردے کی اہمیت اور اس کی شرعی حدود و قیود سے خوب واقف تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ خواتین کی تعلیمی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ پردہ ہے،جو انھیں مسجدوں اور مدرسوں میں نہیں جانے دیتا،اس لیے انھوں نے غیر شرعی پردے کی مخالفت میں یہ رسالہ نکالا۔[20]

مندرجہ بالا سطور سے شرر کے جس فکری رویے کی عکاسی ہوتی ہے وہی کے مقاصد میں واضح ہوا ہے۔ اس رسالے پر انھیں سخت تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن وہ اپنے مقصد پر ڈٹے رہے اور تعلیم نسواں کی راہیں ہموار کرتے رہے۔ پردہ عصمت کی اشاعت کے محرکات بیان کرتے ہوئے شرر لکھتے ہیں:

> پردہ عصمت کو دیکھ کر مرد جس قدر بھڑکتے ہیں، تعلیم یافتہ باعصمت خواتین نہیں بھڑکتیں۔ اس سے وہ غور کرتی ہیں،اپنی مجبوریوں کو دیکھتی ہیں،اسلام کی دی ہوئی آزادیوں کا اندازہ کرتی ہیں،اپنے حقوق کا خیال کرتی ہیں اور سب کے بعد خاموش رہتی ہیں،لیکن خاتمے پر ان کے سینے سے ایک آہ بھی نکل جاتی ہے۔ جس کو ہم یہاں بیٹھے بیٹھے سن لیتے ہیں، مگر افسوس کہ ان کے شوہر اور عزیز نہیں سن پاتے۔[21]

پردہ عصمت کے اجرا کا اہم ترین مقصد شریعت اسلامی کے مطابق عورتوں کے حقوق سے آگہی دینا تھا۔ جس میں سب سے زیادہ اہمیت ہندوستان میں رائج پردے کے مسائل کو دی گئی۔ شرر کے مطابق پردے کے بے جا سختی عورتوں کے لیے علم و آگہی کے تمام در بند کر دیتی ہے اور وہ سماجی معاملات و مسائل سے بنرد آزما ہونے

کے لیے مردوں کی مرہونِ منت رہتی ہیں۔

۱۴۔ جلبابِ ناموس (لکھنؤ)، ۱۹۰۱ء:

۱۹۰۱ء میں محمد یوسف وحشی نے لکھنؤ سے ماہنامہ جلبابِ ناموس جاری کیا۔ یہ رسالہ پردہ عصمت کے جواب میں لکھا گیا۔ پردہ عصمت میں جہاں غیر شرعی پردے کی مخالفت میں مضامین درج کیے گئے وہیں اس کی مخالفت میں جلبابِ ناموس میں پردے کی حمایت پر مضامین لکھے گئے۔ خاص طور پر ایسے مضامین احاطہ تحریر میں لائے گئے جن سے پردہ عصمت کے مضامین کا جواب دیا جا سکے۔ ڈاکٹر نسیم آرا اس کے مندرجات کے حوالے یوں رقمطراز ہیں:

> پردہ ظلم ہے یا بے پردگی، پردہ اور ہمارے ریفارمر، پردے کے مخالف اور تاویلوں کے ہتھکنڈے (قسط وار)، علمائے دولتِ عثمانیہ کی سوانح عمریاں (مسلسل)، مراسلات، اس میں مختلف لوگوں کی آرا جو پردے یا رسالہ پردہ عصمت سے متعلق ہوتی تھیں۔ عورت کی آزادی کا نتیجہ یہ تمام عنوانات پردہ عصمت کے جواب میں ہی ہیں۔ اس کے علاوہ بعض ایسی کتابوں پر ریویو ہیں جو پردے کی مخالفت اور خواتین کی آزادی پر لکھی گئیں۔ [۲۲]

جلبابِ ناموس میں خاص طور پر ایسے مضامین درج کیے گئے جو مستوراتِ ہند کے لیے پردے کی مروجہ سختی کو برقرار رکھنے کی حمایت میں تھے۔ اس رسالے کے مصنفین نے خاص طور پر ایسے مضامین تحریر کیے جن سے خواتین کے دل میں پردے کی عظمت ابھارا جا سکے۔ انھوں نے پردہ عصمت میں شامل غیر شرعی پردے کے خلاف مضامین کو ایک پروپیگنڈا قرار دیا اور اسے اسلامی روایات پر ایک وار قرار دیا۔ ان مصنفین نے اسلامی احکامات اور روایات کو اپنانے اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کی اہمیت کو ابھارنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس رسالے میں تمام تر توجہ پردے کی افادیت، ضرورت اور اہمیت اجاگر کرنے پر صرف کی گئی۔

۱۵۔ شمس النہار (دہلی)، ۱۹۰۲ء:

کٹر روایت پسند نو آبادیاتی ہندوستان میں ۱۸۹۸ء میں ایک خاتون کی زیر ادارت تہذیب نسواں کا اجرا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ لوگوں نے جہاں اس کی مخالفت کی وہیں انھوں نے محمدی بیگم اور ان کے خاندان کو برا بھلا کہنے سے بھی گریز نہ کیا۔ اسی مقصد کے پیش نظر دہلی کی ایک طوائف کی ادارت میں شمس النہار کا اجرا کیا گیا۔ جس کا مقصد یہ بتانا تھا کہ شریف بیبیوں کے نام اخباروں اور رسالوں کی زینت نہیں بنتے۔ ہفت روزہ شمس النہار بی اللہ دی نزاکت کے نام سے ۱۹۰۲ء میں جاری ہوا اور اس میں محض مولوی ممتاز علی کے اہل و عیال کو تحقیر و تذلیل کا نشانہ بنایا گیا۔ امداد صابری کے مطابق یہ اخبار دہلی مسجد تہور خاں سے ۱۹۰۲ء میں وجود میں آیا۔ اس کی

ایڈیٹر بی اللہ دی نزاکت تھیں۔ یہ اخبار طبقہ نسوانِ بازاری کا ترجمان تھا۔ "[۲۳]

شمس النہار کے اجرا کا اصل مقصد محمدی بیگم کی توہین تھا۔ اس اخبار نے جہاں محمدی بیگم کو ہدف تنقید بنایا وہیں اس کے مضامین سے اردو میں خواتین کو اردو مضمون نگاری کی بھی جگہ ملی اور خواتین کے اسلوب اور انداز بیان کو سراہا جانے لگا۔

۱۶۔ خاتون (علی گڑھ)، ۱۹۰۴ء:

شیخ عبد اللہ ہندوستان میں تعلیم نسواں کے آغاز میں کی جانے والی کوششوں میں سب سے نمایاں اہمیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اس دور میں مستورات کی تعلیم کے اقدامات کیے جب سرسید سمیت متعدد اہم شخصیات اس کے مخالف تھیں۔ انھوں نے اپنی بیگم کے ساتھ مل کر اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی کوششیں کی جس کی ایک کڑی رسالہ خاتون کا اجرا ہے۔ ماہنامہ خاتون جولائی ۱۹۰۴ء میں شیخ عبد اللہ کی ادارت میں شائع ہوا۔ یہ رسالہ اپنے سے بیشتر نکلنے والے نسوانی رسائل معلم نسواں، شریف بیبیاں، تہذیب نسواں، سفیر قیصر وغیرہ میں نہ صرف ممتاز تھا بلکہ بعد کے نکلنے والے رسالوں پر بھی فوقیت رکھتا تھا اور اپنے مقاصد میں بھی بڑی حد تک کامیاب ہوا۔ "[۲۴] رسالے میں ایسے متعدد موضوعات پر لکھا گیا جس سے مستورات قدیم فرسودہ رسومات اور توہمات سے بچ سکیں اور انھیں روشن خیال بنایا جاسکے۔ انور سدید کے مطابق "النسا اور تہذیب نسواں کی طرح رسالہ خاتون نے اس دور کی مسلمان عورتوں کو روشن خیال بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ "[۲۵] اس کے اداریے میں اس کے مقاصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں خاتون ایک ماہوار رسالہ ہو گا جس میں صرف عورتوں کے مضامین ہوا کریں گے۔ تعلیم نسواں کی ضرورت مختلف پیرایوں میں ثابت کرنے کے علاوہ ہماری بڑی کوشش یہ ہو گی کہ ہم عورتوں میں اعلیٰ اور پاکیزہ خیالات کی جو ان کی ذات اور ان کی حالت کے مناسب ہوں شائع کریں گے۔ "[۲۶] خاتون کو خاص طور پر مستورات کے مسائل کی عکاسی کے لیے شائع کیا گیا تا کہ ان کے بہتر حل سے خواتین ہند کی حالت درست کی جاسکے۔ اس فکر کی عکاسی شیخ عبد اللہ کی درج ذیل تحریر سے ہوتا ہے۔ ہندوستان میں مردوں کے مقابلے میں خواتین کی حالت زار بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ۔۔۔ مسلمان عورتوں کے لیے کوئی مستقل اور قابل وقعت انتظام موجود نہیں ہے۔ بحیثیت انسان وہ ہماری توجہ اور غور کی مستحق ہیں، بحیثیت مسلمان وہ ہماری ہمدردی کی حق دار ہیں اور بحیثیت عورتوں کے کے، یعنی ہماری شریک حال اور چولی دامن کا ساتھ ہونے کی حیثیت میں ان کا ہمارا معاملہ ایک ہے، کچھ جدا نہیں۔ جس قدر مردوں کی حالت پر توجہ کی ضرورت ہے، اسی

قدر عورتوں کی حالت پر۔ ہم نے اس ضرورت کا لحاظ کرنا اپنا فرض سمجھا ہے اور ہم نے اپنا فرض
ادا کرنے کی صورت "خاتون" کا جاری کرنا ضروری قرار دیا۔"[۲]

رسالہ خاتون کے اجرا کا خاص مقصد طبقہ اناث کو علم و ہنر کے تمام میدانوں میں مردوں کے دوش بدوش کھڑا کرنا تھا۔ زندگی کے دیگر میدانوں کی طرح تعلیمی حوالے سے بھی اس بات پر زور دیا گیا کہ مردوں کی طرح عورتوں کی رسمی تعلیم کا باقاعدہ انتظام کیا جائے۔ خاتون کے اجرا سے پہلے بہت سے زنانہ رسائل کا اجرا ہو چکا تھا لیکن اس رسالے کی انفرادیت یہ تھی کہ اس میں پہلی مرتبہ خواتین کی رسمی تعلیم کی اہمیت باور کروائی گئی، نا صرف یہ بل کہ اس کے لیے عملی کوششیں بھی کی گئی۔ اس رسالے میں نا صرف خواتین کی رسمی تعلیم کی حمایت اور سفارش کی گئی بل کہ زنانہ مدارس کے قیام اور نصاب کی تشکیل کے حوالے سے بھی مضامین درج کیے گئے۔ تعلیم کے علاوہ جس موضوع کو زیادہ فوقیت دی گئی وہ ہندوستان میں رائج پردے کا نظام تھا۔ ہندوستانی مستورات کو پردے کی تہہ میں چھپا کر علم و آگہی کے تمام در بند کر دیے گئے تھے لیکن خاتون میں ایسے مضامین لکھے گئے جو شرعی پردے میں رہتے ہوئے خواتین کی رسمی تعلیم کی حمایت میں تھے۔ ان مضمون نگاروں کے نزدیک پردہ محض ایک رکاوٹ تھا جو بلا وجہ خواتین کی تعلیمی ترقی کو روکنے کے لیے حائل کیا جا رہا تھا۔

اس رسالے میں خواتین کو یہ آزادی تھی کہ وہ اپنے خیالات کا برملا اظہار کر سکیں اس لیے اس میں ایسے مضامین بھی کثرت سے ملتے ہیں جن میں خاتون میں شائع کیے گئے مضامین پر، چاہے وہ رسالے کے مندرجات کے حق میں ہو یا مخالفت میں تنقید بھی ملتی ہے۔

۱۷۔ مشیر مادر (لاہور)، ۱۹۰۵ء:

۱۹۰۵ء میں محمدی بیگم کی ادارت میں ماہنامہ مشیر مادر کا اجرا لاہور سے ہوا۔ اس سے پہلے محمدی بیگم کی ادارت میں مولوی ممتاز علی نے تہذیب نسواں کا اجرا بھی کیا جو تمام طبقہ نسواں کے لیے معلومات کا ذریعہ تھا لیکن مشیر مادر خاص طور پر ماؤں کی تربیت کے لیے جاری کیا گیا۔ اس رسالے میں بچوں کی اخلاقی و جسمانی تربیت، ان کی نگہداشت اور شخصیت سازی کے حوالے سے سلیس زبان میں مضامین لکھے گئے۔ مولوی ممتاز علی نے جتنی ضرورت تعلیم نسواں کی سمجھی اس سے زیادہ ضروری ماؤں کا تربیت یافتہ ہونا سمجھا۔ اسی لیے انھوں نے مشیر مادر کے اجرا سے ماؤں کی باقاعدہ تربیت کا آغاز کیا۔ انھیں اس بات کا ادراک تھا کہ بچے کی تربیت اور نشو و نما میں کوئی کمی ابتدائی چند سالوں میں رہ جائے تو پوری عمر کی ریضت اس کا ازالہ نہیں کر سکتی اسی لیے انھوں نے خواتین کو تربیت اطفال کے اطوار سکھانے کے لیے اہم قدم اس رسالے کی صورت اٹھایا اور اس میں ایسے مضامین شائع کیے گئے جو بچے متعلق چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے مسئلے کے حل کے لیے کار آمد ثابت ہو سکیں۔ رسالے

کے اجرا کے مقاصد بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ:

> ۔۔۔ہر ایک عورت اپنے بچوں کی خیر مناتی اور ان کی جیتی جاگتی زندہ تصویر دیکھنے کی خواہش مند پائی جاتی ہے، مگر افسوس کہ ہمارے ہندوستان کی مستورات کے لاڈ پیار اور اس کی خوشی صرف چند روز اور بے بنیاد ہوتی ہے۔۔۔ان کو اس تعلیم و تربیت سے کچھ واقفیت نہیں ہوتی، جس کے ذریعے سے وہ خوشی دیرپا ہو سکے۔۔۔غرض بچوں کی تربیت کے لیے خواہ وہ اخلاقی ہو، یا جسمانی کوئی ایسی بات نہیں رہنی چاہیے کہ کسی ماں کو معلوم ہو اور اس رسالے میں شائع نہ ہوئی ہو۔[۲۸]

مشیر مادر میں جہاں خواتین کو بچوں کی تربیت کی ترغیب دی وہیں بچوں میں اعلیٰ اوصاف اور بہتر اخلاقی صفات پیدا کرنے کے لیے بھی مضامین درج کیے۔ انھوں نے ماؤں کو ہدایت کی کہ صغر سنی سے ہی بچے کی اخلاقی تربیت شروع کر دیں تاکہ بڑے ہو کر وہ اعلیٰ اوصاف و ارفع اقدار کا حامل ہو۔ اس رسالے میں زیادہ تر مضامین اور تحریریں عورتوں کی لکھی ہوئی ملتی ہیں۔ خیالات کو سادہ، سہل اور سلیس انداز میں پیش کیا گیا ہے تاکہ ہر طبقے کی مستورات اس سے استفادہ حاصل کر سکیں۔ یہ رسالہ بہت کم وقت تک جاری رہ سکا، مولوی ممتاز علی کی علمی و ادبی مصروفیات کی بنا پر اسے زیادہ دیر تک جاری نہ رکھا گیا۔

۱۸۔ پردہ نشین (آگرہ)، ۱۹۰۶ء:

مسز خاموش نے آگرہ سے ۱۹۰۶ء میں پردہ نشین کا اجرا کیا۔ رسالے کے اجرا کے حوالے سے مختلف قسم کی آرا ملتی ہیں امداد صابری[۲۹] اور انور سدید[۳۰] نے اس کے اجرا کا سنہ ۱۹۰۷ بتایا ہے۔ جو کہ درست نہیں ہے رسالے کے اجرا کا درست سنہ ۱۹۰۶ء ہے۔ تربیت نسواں کے باب میں پردہ نشین خاص اہمیت کا حامل ہے جس میں خواتین کے لیے پردہ، امور خانہ داری، حب الوطنی اور خانہ داری سے متعلق مضامین پر قلم اٹھایا گیا۔ رسالے کے سرورق پر اس کے مقاصد ان الفاظ میں درج ہیں:

> پردہ کی تائید کے ساتھ ہندوستان کی پردہ نشین مستورات میں تعلیم پھیلانا، انھیں روشن خیالی۔ حب الوطنی۔ قومی ہمدردی پیدا کرنا۔ ان کو خانہ داری دستکاری اور تربیت اطفال کے اہم اور ضروری طریقوں کی طرف توجہ دلانا۔[۳۱]

سرورق پر اس عبارت کے علاوہ اکبر الہ آبادی کی رباعی (ع بے پردہ جو نظر آئیں چند بیبیاں)[۳۲] بھی درج ہے جس سے اس کی غرض و غایت کے بارے میں مزید وضاحت ہو جاتی ہے۔ پردے اور اس کی بحثوں کے علاوہ اصلاح رسوم معاشرہ پر بھی متعدد مضامین لکھے گئے۔ اس رسالے میں ہندوستانی معاشرتی ڈھانچے میں رائج پردے کے نظام کی حمایت میں مضامین لکھے گئے۔ یہ رسالہ تعلیم نسواں کی حامی تھا لیکن تمام تر معاشرتی قیود کے ساتھ تعلیم

نسواں کے فروغ کی اہمیت کو سراہا گیا۔ اس کے مندرجات میں ایسے مضامین بھی شامل ہیں جو خواتین کی روشن خیالی اور آزادیِ اظہار کے حق میں ہیں لیکن سماجی دائرہ کار میں رہتے ہوئے اس کے اطلاق کی کوشش کی حمایت کی گئی ۔ دیگر موضوعات میں اصلاحِ معاشرت اور اصلاحِ رسوم کو خاص اہمیت دی گئی اور خواتین کو توہم پرستی سے نجات دلانے کی کوشش بھی کی گئی۔

۱۹۔ عصمت (دہلی)،۱۹۰۸ء:

شیخ محمد اکرام تعلیم نسواں کے زبردست حامیوں میں سے تھے انھوں نے تعلیم نسواں کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے ماہنامہ عصمت کا اجرا ۱۹۰۸ء میں کیا۔ جس کا مقصد مستورات میں لکھنے اور پڑھنے کا ذوق پیدا کرنا تھا۔ انھوں نے عصمت میں اس طرح کے مضامین لکھے، جس سے خواتین لکھنے اور پڑھنے کی طرف راغب ہونے کے ساتھ ساتھ دین و دنیا سے واقف ہو سکیں۔ نا صرف یہ بل کہ عصمت میں ایسے موضوعات پر بھی لکھا گیا جن سے خواتین کو گھر بیٹھے ملکی اور عالمی صورت حال سے آگاہ ہونے کا موقع میسر آسکے۔ اس لیے ایسے مضامین چھاپے گئے جن میں ان کی ملکی بہنوں اور دیگر خواتین کے ملکی اور غیر ملکی سطح پر انجام دیے گئے کارہائے نمایاں سے باخبر رہنے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے کی خو بھی پیدا ہوئی۔ اس کی تفہیم ذیل کی سطور میں ہوتی ہے:

> اس کے پاس اس بات کو معلوم کرنے والے ذرائع بھی بہت کم ہیں کہ دوسری ملکی بہنیں کیا کر رہی ہیں۔ اگر کہیں بعض خواتین علم سے بہرور ہو کر ترقی کر بھی رہی ہیں تو ان کی اکثر بہنیں اس حال سے واقف نہیں۔ ورنہ ایک کی ترقی دوسری کے لیے ترغیب کا باعث ہو۔ عصمت اس ترقی کے تمام حالات مختلف ذرائع سے جمع کر کے ان کی طرف دوسری خواتین کو متوجہ کرے گا اور گھروں میں بیٹھے بیٹھے تبادلہ خیالات کا ذریعہ ہو گا۔[۲۲]

عصمت میں ایسے مضامین شائع کیے گئے جن میں معاشرتی مسائل اور ان کی اصلاح، سلیقہ شعاری، امور خانہ داری، بچوں کی تربیت، خواتین کے حقوق و فرائض، تاریخ سے واقفیت، تہذیب و تمدن اور طرز معاشرت جیسے متنوع موضوعات پر قلم اٹھایا گیا۔ ماہنامہ عصمت کی اہمیت واضح کرتے ہوئے علامہ راشد الخیری یوں رقمطراز ہیں:

> خواتین کے واسطے "عصمت" میں دینی اور دنیاوی دونوں قسم کی فلاح و بہبود ملحوظ ہے۔ کنواری لڑکیوں کو عصمت بتائے گا کہ کنوارپنے کی زندگی ان کو کس طرح گزارنی ہے۔ ماں باپ کا ادب، بہن بھائیوں کی خدمت، بڑوں کی تعظیم چھوٹوں سے محبت ان کا فرض منصبی ہے۔۔۔۔ عصمت بتائے گا کہ انھیں گھر میں کس طرح رہنا ہے۔ روپے کا مصرف کیا ہے۔ خاندان کے ساتھ کس

طرح بسر کرتی ہے۔۔۔۔[۳۴]

عصمت میں مختلف تحقیقی اور تنقیدی تحریروں کے ذریعے عالم نسواں کی ترقی، تعلیم نسواں کی حمایت، خواتین کی کردار سازی اور ان میں لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ جس سے لکھنے والیوں کی ایک ایسی کھیپ تیار ہوئی جس نے بعد ازاں اردو ادب میں اپنا نام منوایا۔ شیخ محمد اکرام رسالے کے پہلے مدیر تھے وہ اس کے اجرا کے مقاصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

۱۔ حرم کی حرمت قائم رکھنا۔

۲۔ عالم نسواں کی ترقی۔

۳۔ تعلیم نسواں کی حمایت۔

۴۔ معلوماتِ عامہ وخاصہ۔

۵۔ علمی، ادبی، تاریخی، معاشرتی، سوشل غرض ہر قسم کے مضامین کا ذخیرہ فراہم کرنا۔

۶۔ زنانہ لٹریچر کو وسعت دینا۔[۳۵]

عصمت کے اجرا کا ایک خاص مقصد خواتین کا ایک ایسا طبقہ پیدا کرنا تھا جو اپنے تجربات اور مسائل کو مد نظر رکھتے ہوئے دیگر ہندوستانی مستورات کو آگاہ کر سکیں تاکہ وہ ان سے سبق لے کر اپنی زندگی کو بہتر انداز میں بسر کرنے کے لائق ہو سکیں۔ اس میں ایسے مضامین شائع کیے گئے کہ خواتین اپنے حقوق سے واقف ہو جائیں اور اپنے جائز حقوق حاصل کرنے کے لیے تگ ودو کر سکیں۔ اس رسالے کے ذریعے خواتین میں یہ شعور بھی پیدا کیا گیا کہ وہ اپنی معاشی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کسی دوسرے پر انحصار کرنے کی بجائے خود کوشش کریں اور ایسا ذریعہ معاش اپنائیں کہ خود مختار ہو سکیں۔ اس کے علاوہ خواتین کی سماجی و قومی خدمات کے حوالے سے بھی مضامین شائع کیے گئے تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے قومی و ملکی خدمات سر انجام دے سکیں۔ عصمت نے خواتین میں یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش کی کہ وہ کسی طور بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ رب تعالیٰ نے انھیں گوناگوں صلاحیتوں سے نوازا ہے بس انھیں اپنی صلاحیتوں کی کھوج لگا کر انھیں درست سمت دینے کی ضرورت ہے۔ وہ ایک عام انسان کی حیثیت سے تمام تر انسانی حقوق کے حصول کا استحقاق رکھتی ہیں۔ اگر وہ کوشش کریں تو کوئی شخص بھی انھیں اس حق سے محروم نہیں کر سکتا۔ اپنے حقوق کے حصول کے ساتھ خواتین کو ان کے فرائض سے بھی متعارف کروایا گیا تاکہ وہ تمام تر رشتے بخوبی نبھا سکیں۔

یہ رسالہ ۱۹۰۸ء سے تاحال (۲۰۲۰ء) اپنے فرائض انجام دے رہا ہے۔ اس کا شمار ان رسائل میں ہوتا جنھوں نے خواتین کی تعلیم وترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔

۲۰۔شریف بی بی (لاہور)،۱۹۰۹ء:

منشی محبوب عالم کی نگرانی میں ۱۹۰۹ء میں ماہنامہ شریف بی بی کا اجرا ہوا۔ جس کی مدیر ان کی بیٹی فاطمہ بیگم تھی۔ اس سے قبل ۱۸۹۳ء میں شریف بیبیاں کا آغاز بھی کیا گیا، اسی کا نام بدل کر شریف بی بی رکھا گیا۔ (اس کی تفصیل اوپر کی سطور میں بیان کی جاچکی ہے) اس میں خواتین کی تعلیم و تربیت اور وقتی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے خاص طور پر مضامین لکھے گئے۔ ان مضامین میں طرز معاشرت، تربیت اطفال، تعلیم کی ضرورت و اہمیت، توہم پرستی اور ان کے رد کے طریقے وغیرہ جیسے موضوعات پر لکھا گیا۔ ان مضامین کے لیے خاص طور پر ایسی زبان اور انداز بیان اختیار کیا گیا کہ یہ خواتین کی سمجھ میں باآسانی آجائیں۔ تاکہ وہ اس سے متاثر ہو سکیں۔ رسالے کے سرورق پر شریف بیبیاں کی طرح یہ عبارت درج ہوا کرتی تھی "اس میں سعادت مند لائق بیٹی، سلیقہ شعار عقلمند بی بی، مہربان تجربہ کار ماں بننے کی ہدایات ہوتی ہیں"[۲۶] شریف بی بی میں شریف بیبیاں والے مستقل موضوعات کور کھا گیا۔ جن میں "ممتاز عورتیں"، "روئے زمین کی عورتیں"، "انتظام خانہ داری"، "تربیت اطفال"، "دستر خوان"، "زنانہ خبریں" اور "شریف بیبیوں کی محفل" وغیرہ شامل ہیں۔

شریف بیبیاں کی نسبت شریف بی بی کا معیار زیادہ بہتر تھا۔ اس کی ایک خوبی یہ تھی کہ اس میں لکھاری خواتین کی تعداد بڑھ گئی تھی اور اس دور کے نامور مرد لکھنے والے بھی اپنے خیالات کی عکاسی کیا کرتے تھے۔

اس رسالے میں خواتین کو امور خانہ داری اور ازدواجی زندگی کے جھمیلوں تک محدود نہ رکھا گیا بل کہ ملکی و سیاسی صورت حال کے مطابق ان کی ضرورت کا احساس دلایا گیا۔ اس میں خواتین کے ووٹ کے حق، ملک کی سیاسی سرگرمیوں سے ہم آہنگی اور ان میں خواتین کے حقوق کو بطور خاص موضوع بنایا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ خواتین کی اعلیٰ درجے کی رسمی تعلیم کے مسئلے پر بھی بات کی گئی اور خواتین کی اعلیٰ تعلیم کی حمایت کی گئی۔ شریف بی بی نے خواتین میں تحرک پیدا کیا کہ وہ اپنے مسائل کے حل کے لیے کوشاں ہوں اور اپنے حقوق کے حصول کے لیے تگ و دو کریں۔

۲۱۔الحجاب (بھوپال)،۱۹۰۹ء:

جون ۱۹۰۹ء میں محمد یوسف قیصر بھوپالی نے بھوپال سے الحجاب کا اجرا کیا۔ اجرا کا ایک مقصد خواتین میں لکھنے کی صلاحیت پیدا کرنا تھا اسی لیے آسان اور عام فہم زبان میں تمام تر نظریات پیش کیے گئے تاکہ اسلوب کسی کے سمجھنے کی راہ میں رکاوٹ نہ بننے پائے۔

الحجاب میں معاصر رسائل کی طرح خواتین کے مسائل اور ان کے حقوق کو بطور خاص موضوع بنایا گیا۔ جن میں تعلیم و ترقی نسواں سر فہرست تھا۔ اس کے علاوہ اصلاحِ رسوم، اصلاحِ معاشرت، اسلامی شعار اور تعلیمات کے ذریعے زندگی کا بسر ان جیسے موضوعات پر بھی متعدد مضامین درج کیے گئے۔ اس رسالے کا مقصد بھی خواتین کو ہر شعبہ زندگی میں کامیاب کرنا تھا۔ اس رسالے میں خواتین کو عالمی صورت حال سے متعارف بھی کروایا گیا تا کہ وہ جدید وقتی تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر اپنی زندگی کو بہتر بنا سکیں لیکن ایسے کسی بھی عمل کے اپنانے کی ممانعت کی گئی جو اسلامی نظریات اور روایات کے مخالف ہو۔

یہ رسالہ اس حوالے سے بھی خاص اہمیت کا حامل ہے کہ اس کے ذریعے ہندوستانی مستورات کو مغرب اور عالمی ادب سے متعارف کروانے کی سعی کی گئی۔ رسالے میں مغربی ادب سے تراجم بھی پیش کیے گئے جس سے مغربی علوم و فنون سے واقفیت کا ایک در وا ہوا۔ رسالے کی اہم لکھنے والیوں میں زہرہ فیضی اور رابعہ بیگم شامل ہیں۔

۲۲۔ تمدن (دہلی)، ۱۹۱۱ء:

شیخ اکرام اور علامہ راشد الخیری کو خواتین کا محسن کہا جاتا ہے۔ انھوں نے تعلیم نسواں کے حوالے سے گراں قدر خدمات سر انجام دیں دیگر ادبی رسائل کی طرح تمدن کا اجرا بھی خاص طور پر خواتین کے حق میں آواز اٹھانا تھا۔ اس میں صرف خواتین کی تعلیم و تربیت کے لیے مضامین نہیں لکھے جاتے تھے بل کہ ان کی آواز اور مسائل کو معاشرتی سطح پر اہمیت دلانے کی کوشش کی گئی تھی۔ رسالے میں خواتین کے ساتھ ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک اور زیادتیوں کو بھی خاص طور پر موضوع بنایا گیا۔ تعدد ازدواج، مردوں کی بد سلوکیوں اور عورتوں کے حقوق کے حوالے سے برتی جانے والی غفلتوں کو بھی اجاگر کیا گیا۔ یہ رسالہ برائے خواتین نہیں تھا بل کہ مردوں کو خواتین سے متعلق معاملات سکھانے اور ان کے حقوق و فرائض سے متعلق تربیت دینے کے لیے جاری کیا گیا۔ اپنے مندرجات کی وجہ سے ہندوستانی قدامت پسند معاشرے میں اپنا وجود قائم رکھ سکنا تمدن کے لیے آسان نہ تھا اسی بنیاد پر یہ رسالہ جلد بند کر دیا گیا۔

۲۳۔ احمدی خاتون (قادیان)، ۱۹۱۲ء:

ماہنامہ احمدی خاتون شیخ یعقوب علی تراب احمدی کی ادارت میں جاری ہوا۔ یہ رسالہ خاص طور پر احمدی خواتین کی تعلیم و تربیت کے لیے شائع کیا گیا۔ جس کے مقاصد میں خواتین کی دینی تربیت کے ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی شامل تھی کہ وہ خانگی امور کو بطریق احسن سنبھال پائیں اور اپنے فرائض سے رو گردانی نہ کریں۔ امداد صابری اس کے مقاصد ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

اس رسالے کے اغراض و مقاصد میں عورتوں میں تعلیمی اور مذہبی مذاق اور دین داری کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کرنا تھا۔ تاکہ وہ ایک سعادت مند بیٹی، شریف بیوی اور سلیقہ شعار والدہ بننے کی قابلیت پیدا کر سکیں۔[۳۷]

یہ رسالہ خاص طور پر احمدی خواتین کی تعلیم و تربیت کے لیے نکالا گیا تھا۔ لیکن اس کے مندرجات میں حقوق نسواں کی بابت جو بحث کی گئی اس سے دیگر طبقات کی مستورات کو بھی رہنمائی ملی۔

۲۴۔ ظل السلطان (بھوپال)، ۱۹۱۲ء:

محمد امین زبیری نے ۱۹۱۲ء میں بھوپال سے ظل السلطان کا اجرا کیا۔ اسے نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ رسالے کے اجرا کا مقصد بھی تعلیم نسواں، تربیت اطفال حقوق و فرائض، اخلاقیات اور معلومات عامہ سے واقفیت تھا۔ اس میں لکھنے والوں کا طرز بیان بھی دیگر رسائل کی طرح سادہ اور سلیس تھا تاکہ مستورات کے لیے کسی قسم کی کوئی دشواری نہ ہو۔ پہلے شمارے میں اس کے اجرا کے مقاصد بیان کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ، اس رسالے کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی خواتین میں اشاعتِ تعلیم کی جائے۔ تربیت و پرورشِ اولاد سے متعلق بحثیں کی جائیں اور ان کے لیے مفید معلومات کا ذخیرہ باہم پہنچایا جائے اور علمی مضامین شائع کیے جائیں۔[۳۸]

تعلیم و تربیتِ نسواں کے علاوہ تعلیمی، تمدنی، معاشرتی، مذہبی، طبی، سائنسی اور ادبی مضامین سے عورتوں کی فکری آبیاری کا سامان بہم پہنچانے کی سعی کی گئی۔ ظل السلطان میں امور خانہ داری، خانگی معاملاتِ زندگی، ازدواجی زندگی کے مسائل اور ان کا حل، تعدد ازدواج، پرورش اطفال، اخلاقیات پر مبنی مضامین، اصلاحِ رسوم اور بہتر طرز معاشرت کے حوالے سے بھی افکار پیش کیے گئے تاکہ خواتین ان سے سبق حاصل کر کے اپنی زندگی کو بہتر بنا سکیں۔ رسالے میں عورتوں کے حقوق سے متعلق اسلامی احکامات کو بطور خاص پیش کیا گیا تاکہ عورتوں کو ان کے حقوق سے واقفیت دلانے کے ساتھ ساتھ مردوں کو باور کروایا جا سکے کہ وہ کسی بھی طور خواتین کی حق تلفی کرتے ہوئے اسلامی احکامات سے منحرف نہ ہونے پائیں۔ اس رسالے کے ماخذات میں اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ تمام تر سماجی مسائل کی وجہ کم فہمی اور جہالت ہے۔ اگر جہالت کے خاتمے کی کشش کی جائے تو متعدد سماجی مسائل اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔

۲۵۔ پیام امید (ایٹہ)، ۱۹۱۴ء:

یہ رسالہ ۱۹۱۴ء میں سماجی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے جاری کیا گیا۔ رسالے کی مدیر آزاد بیگم تھی۔ یہ محض مستورات سے منسوب نہیں تھا بل کہ اس میں مرد و زن کے لیے معلومات موجود تھیں اور انھیں سماجی اعتبار

سے مضبوط بنانے اور سماجی ضرورتوں کے مطابق تربیت دینے اور روشن خیال بنانے کے لیے مضامین لکھے گئے۔

۲۶۔ سہیلی (دہلی)، ۱۹۱۵ء:

علامہ راشد الخیری نے شعور نسواں کے لیے جو کوششیں کی ان میں سے ایک اہم نام ہفتہ وار سہیلی کا اجرا بھی ہے۔ جو انھوں نے ۱۹۱۵ء میں دہلی سے جاری کیا۔ راشد الخیری نے لڑکیوں کی خود اعتمادی اور انھیں اس بات کا یقین دلانے کے لیے کہ وہ بھی پڑھ لکھ سکتی ہیں بہت سے ایسے مضامین خود لکھے جو خواتین کے فرضی ناموں سے تھے اور اس کا مثبت اثر ان کی سوچ اور فکر پر بھی ہوا۔ ۱۹۱۶ء میں عصمت بل ڈپو کے دفتر میں آگ لگ جانے کی وجہ سے یہ زیادہ دیر تک نہ چل سکا اور بند کر دیا گیا۔ بعد ازاں ۱۹۲۲ء میں دوبارہ جاری کیا گیا جس کی مدیر واجدہ بیگم تھیں۔

اپنے مقاصد کے پیش نظر سہیلی کے موضوعات بھی تقریباً وہی تھے جو عصمت میں تھے۔ اس میں بھی خواتین کی تعلیم و ترقی، امورِ خانہ داری، عالمی صورت حال سے آگاہی، تربیتِ اطفال، خانگی زندگی سے متعلقہ مسائل اور ان کے حل کی تجاویز، ملکی و معاشرتی ترقی وغیرہ کے حوالے سے مضامین لکھے گئے۔ جن کا اولین مقصد ہندوستانی خواتین کو ہر شعبہ زندگی میں تاق کرنا تھا تا کہ وہ دیگر اقوام کی طرح اپنے حقوق کا تحفظ کر سکیں اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ملک و ملت کی خدمت کر سکیں۔ سہیلی میں معاشرتی مسائل کو بھی خاص جگہ دی گئی۔ ہندوستانی مستورات کی توہم پرستی اور فرسودہ رسوم و رواج کے نقصانات سے آگاہ کیا گیا۔ اس رسالے میں مشرق و مغرب کی ان خاص خواتین کا تعارف و احوال بھی درج کیا جاتا تھا جو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ملک و ملت کی خدمت کر رہی ہیں اور معاشرے میں اہم مقام حاصل کر چکی ہیں۔ یہ رسالہ اپنے مقاصد اور موضوعات کے حوالے سے خاص اہمیت کا حامل تھا لیکن ملکی صورت حال کے پیش نظر زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکا اور بند کر دیا گیا۔

۲۷۔ دائی (دہلی)، ۱۹۱۹ء:

فروری ۱۹۱۹ء میں دہلی سے ماہنامہ دائی کا اجرا سلطان جہاں بیگم چنگیزی کی ادارت میں ہوا۔ جس میں تعلیم نسواں اور ان کی تربیت کے حوالے سے مضامین درج کیے گئے۔ اس رسالے کو اپنے دور میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہ ہو سکی لیکن خواتین کی ادبی صحافت میں اس کا شمار ضروری ہے۔

۲۸۔ استانی (دہلی)، ۱۹۱۹ء:

خواجہ حسن نظامی اور ان کی زوجہ لیلیٰ بانو نے ۱۹۱۹ میں استانی کا اجرا کیا۔ رسالے کا تمام انتظام و انصرام

خواجہ حسن نظامی خود کیا کرتے تھے اور ادارت کے فرائض ان کی اہلیہ کے ذمے تھے۔ جس میں خواتین کی تعلیم و تربیت کے علاوہ ان میں سیاسی شعور پیدا کرنے کی سعی بھی کی گئی۔ یہ رسالہ محض خواتین کی تربیت کے لیے مخصوص نہ تھا بل کہ بچوں کی تربیت اور آگہی کے لیے بھی مضامین شائع کیے جاتے تھے۔ ہر رسالے کے سرورق پر طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلۃ درج تھا اور اس کے نیچے یہ عبارت درج ہوا کرتی تھی 'عورتوں اور بچوں کا ماہوار رسالہ جو مصور فطرۃ حضرت خواجہ حسن نظامی کی نگرانی میں ہر چاند کی پہلی کو نکلتا ہے'[۳۹] اس رسالے میں تعلیم نسواں اور سیاسی مباحث کے علاوہ پردہ، اسلامی تعلیمات کی پابندی، تربیتِ اطفال، بچوں کی شخصیت کی تعمیر، اصلاحِ معاشرت، خانگی معاملات اور اخلاقی اقدار کی درستی کے حوالے سے مضامین ملتے ہیں۔

۲۸۔ نسائی (دہلی)، ۱۹۱۹ء:

محمد عباس حسین نے طبقہ نسواں میں شعور و آگہی پیدا کرنے کے لیے ۱۹۱۹ء میں پندرہ روزہ نسائی کا اجرا کیا۔ رسالے کی معاون مدیرہ کے طور پر نذر سجاد حیدر نے بھی اپنی خدمات سرانجام دیں۔ اس رسالے نے خواتین میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کے لیے اہم خدمات سرانجام دیں۔ مضامین کو دیگر جرائد کی طرح سلیس زبان میں لکھا جاتا تھا۔ اس رسالے نے خواتین کی سیاسی و سماجی بیداری میں اہم ترین کردار ادا کیا۔ نا صرف یہ بل کہ خواتین کو یہ باور کروانے کی کوشش بھی کی کہ سماجی اعتبار سے مضبوط ہونے کے لیے اقتصادی طور پر مضبوط ہونا ضروری ہے۔ اس رسالے نے خواتینِ ہند کو قومی اور بین الاقوامی معلومات فراہم کر کے ان کے شعور اور معلومات میں وسعت پیدا کرنے کی سعی کی۔

۲۹۔ النساء (حیدر آباد، دکن)، ۱۹۲۰ء:

۱۹۲۰ء میں صغریٰ ہمایوں مرزا نے حیدر آباد دکن سے ماہ نامہ النساء جاری کیا۔ اس رسالے نے قومی سطح پر خواتین کی تعلیم و ترقی کے لیے اہم امور سرانجام دیے۔ اس ماہوار رسالے نے عورتوں اور لڑکیوں کے لیے معاملاتِ زندگی کو بہتر طریقے سے سرانجام دینے کی تربیت کی۔ النساء میں اسلامی شعار کے مطابق معاملات سرانجام دینے کے بارہا ترغیب دی گئی جو اس کا اولین مقصد بھی تھا۔ اس کی وضاحت ذیل کے ادارتی اقتباس سے بھی ہوتی ہے:

> پیاری بہنو! وقت تھوڑا ہے اور کام بہت ہے۔ ہم کو ہر وقت یہ خیال اپنے دل میں رکھنا چاہیے کہ ہم مسلمان ہیں۔ ہمارا کوئی کام شرع سے باہر نہ ہو۔ صرف نام کے مسلمان بننے سے فائدہ نہیں بل کہ اصلی دینداری وہی ہے کہ ہمارے گھر دینداری کا پورا نمونہ ہوں۔ ہمارا ہر کام ایسا ہو جو خدا اور

رسول مقبول کی سند سے باہر نہ ہو۔"

اس رسالے سے خواتین میں لکھنے اور پڑھنے کا شوق پیدا کیا گیا۔ اس میں خواتین کی تعلیمی، تمدنی، معاشرتی ضروریات کے حوالے سے آگہی دی گئی۔ علاوہ ازیں عورتوں کے حقوق، حق رائے دہی، آزادی اظہار جیسے موضوعات پر بھی مضامین کا سلسلہ ملتا ہے۔ رسالے کے نمایاں لکھنے والوں میں نوشابہ خاتون، محترمہ مرزا مہدی کوکب، زہرہ اختر، بیگم انوری، قیصری بیگم اور مسز یاور علی کے نام سرفہرست ہیں۔

۱۹۲۰ء تا ۱۹۴۷ء میں خواتین کی ادبی صحافت کا اجمالی جائزہ:

مندرجہ بالا رسائل اپنے دور میں خواتین کی تعلیم و تربیت کے لیے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ تمام رسائل اس لیے بھی اہم ہیں کیوں کہ انیسویں صدی اواخر اور بیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں میں ہندوستانی مستورات کی حالت کسی طور بہتر نہ تھی۔ وہ ہر اعتبار سے پستی کا شکار تھیں، انھیں اپنے جائز انسانی اور شرعی حقوق سے بھی کوئی آگہی حاصل نہ تھی۔ لیکن بیسویں صدی کی خواتین کی صحافت سے ہندوستانی خواتین میں شعور و بیداری پیدا کرنے کی سعی کی گئی تا کہ وہ اپنے حق سے لیے آواز اٹھا سکیں اور اپنی زندگی بہتر طریقے سے گزار سکیں ۔ ۱۹۲۰ء کے بعد ہندوستانی مستورات کا ایک ایسا باشعور طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو اپنے گرد و نواح میں اپنی معلومات اور شعور و ادراک کے ذریعے بہتری لا سکتی تھیں۔ یہ سلسہ یہیں ختم نہیں ہوا بل کہ تا حال کسی نہ کسی صورت میں مستورات کی علمی و فکری آبیاری کا کام سرانجام دے رہا ہے۔ اوائل میں نکالے گئے خواتین کے رسائل میں لکھنے والی متعدد خواتین اور حضرات نے بعد میں ہندوستانی عورت کے حق کے لیے آواز اٹھائی اور اس سلسلے میں بہت سے رسائل کا اجرا بھی کیا۔ جن کا مختصر تعارف حسبِ ذیل ہے:

۱۹۲۲ء میں خورشید خواجہ صاحبہ کی ادارت میں ہفتہ وار ہند کا اجرا ہوا۔ یہ رسالہ محض طبقہ اناث کے لیے مخصوص نہ تھا، اس میں مرد اور عورتوں دونوں کے لیے سیاسی معاملات و مسائل کے حوالے سے خبریں پیش کی جاتی تھیں۔ رسالے کے دو صفحات خواتین کے لیے وقف تھے تا کہ وہ بھی اپنے نظریات کی ترسیل کر سکیں۔

مریم بیگم نے وقتی تقاضوں کے مطابق ۱۹۲۲ء میں حیدرآباد سے خواتین کی خانگی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے خادمہ کا اجرا کیا۔ جو اردو کی معروف ادیب صغرا ہمایوں مرزا کی والدہ تھیں۔ اس رسالے میں مرد اور عورتیں دونوں خواتین کی تربیت کے لیے مضامین لکھا کرتے تھے لیکن ان کا معیار دیگر معاصر رسائل کی طرح بلند نہ تھا۔ مضامین میں زیادہ تر مضامین عورت کی خانگی ذمہ داریوں اور تربیتِ اولاد سے متعلق تھے۔

اہلیہ ولی الدین (مولوی محب حسین کی صاحبزادی) نے ۱۹۲۳ء میں خادمہ کا اجرا کیا۔ جس میں علمی، ادبی

اور مذہبی مسائل کو بطور خاص موضوع بنایا گیا۔ اس رسالے میں تہذیب و تمدن کے موضوع کو بھی خاصی اہمیت حاصل رہی۔

بٹالہ سے نکالا گیا رسالہ استانی ،۱۹۱۹ء میں خواجہ حسن نظامی کے نکالے گئے رسالے استانی کی توسیع تھا۔ جو مالی مسائل کی وجہ سے بند کر دیا گیا تھا۔ اسی کو ۱۹۲۳ء میں احمد وجودی نے بٹالہ سے دوبارہ جاری کیا تھا۔

بیگم صدیق انصاری نے ۱۹۲۳ء میں کلکتہ سے ماہنامہ حور کا اجرا کیا۔ جس کے سرورق پر "مسلم خواتین کی ادبی سہیلی" درج تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ رسالہ مسلمان خواتین کی تعلیم و تربیت کے لیے جاری کیا گیا تھا۔ انور جہاں اور سرور جہاں نے ۱۹۲۴ میں بھوپال سے آفتاب نسواں کا اجرا کیا جو مالی مسائل کی بنا پر چند شماروں کے بعد بند کر دیا گیا تھا۔ ۱۹۲۴ء میں امرتسر سے رضیہ خاتون کی ادارت اور افتخار النساخدیجہ بیگم کی سرپرستی میں سہیلی کا اجرا ہوا۔ دیگر حلقہ ادارت میں نوشابہ خاتون قریشی، اور زہرہ بتول کے نام شامل ہیں۔ اس میں تعلیم نسواں اور اس سے متعلقہ موضوعات پر مضامین درج کیے جاتے تھے۔ یہ رسالہ ۱۹۳۰ میں لاہور منتقل ہو گیا۔ امتیاز فاطمہ بیگم تاج نے ۱۹۲۶ء میں سرتاج کا اجرا کیا۔ اس رسالے میں بھی تعلیم و شعور و نسواں کے حوالے سے مضامین پیش کیے گئے اور مغربی تہذیب کے معائب اور ان کے منفی پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا گیا۔ ۱۹۲۶ء میں علی گڑھ سے ماہنامہ معین نسواں کا اجرا عطیہ بیگم کی ادارت میں ہوا۔ اس رسالے میں عصری حالات و واقعات کو شگفتہ پیرائے میں پیش کیا جاتا، جو اس کا سب سے نمایاں وصف تھا۔ انور سدید نے اپنی کتاب "پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ" میں اس کا علاقہ علی گڑھ لکھا ہے۔ ماہنامہ حرم بیگم، عبدالغفور کی ادارت میں ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا۔ اس میں حقوق نسواں کی حمایت کے ساتھ ساتھ مغربی تعلیم کے معائب کو نمایاں کیا گیا۔ علمی، تہذیبی اور معاشرتی مضامین کی اشاعت کے علاوہ امور خانہ داری پر بھی توجہ دی گئی۔[۳] اس میں تاریخ کے حوالے سے مقالات بھی لکھے جاتے رہے علاوہ ازیں اصلاح رسوم اور طب کے حوالے سے بھی مفید معلومات درج کی گئیں۔

نور جہاں (امرتسر / گوجرانوالہ / لاہور)، اسلامی احکامات کے مطابق تعلیم نسواں کے لیے جاری کیا گیا۔ جو ۱۹۲۶ء میں امرتسر سے جاری ہوا۔ اگست ۱۹۲۸ء میں اس کا دفتر گوجرانوالہ منتقل ہوا تو وہاں سے باقاعدگی سے چھپتا رہا پھر ستمبر ۱۹۲۹ء میں لاہور سے چھپنا شروع ہوا۔ دہلی سے خواجہ حسن نظامی کی ادارت میں تبلیغ نسواں کا اجرا ہوا۔ یہ رسالہ خواتین میں تعلیم کا شوق، معاشرتی رسوم و رواج کی درستی، مذہبی اقدار کی پابندی کے حوالے سے شعور و آگہی پیدا کرنے کے لیے شروع کیا گیا۔ صالحہ خاتون کی ادارت میں ۱۹۲۶ء میں عفت کا اجرا ہوا۔ رسالے کے اجرا کے اسباب دیگر رسائل کی طرح ترقی عالم نسواں اور ان کی تربیت تھا۔ احمدی بیگم نے ۱۹۲۶ء میں کانشی پور سے ہفتہ وار خاتون کا اجرا کیا۔ رسالہ مصباح ۱۹۲۷ء میں قادیانی خواتین کے لیے

نکالا۔ اس کا مقصد قادیانی مذہب کی تبلیغ تھا۔ علاوہ ازیں اصلاح رسوم اور تعلیم و تربیت نسواں کے حوالے سے بھی مضامین لکھے جاتے تھے۔ اس کے مدیر قاضی محمد ظہیر الدین اکمل تھے۔ رسالہ نسیم دہلی سے راشد الخیری نے ۱۹۲۷ء میں خاص طور پر والدین کی جائیداد میں لڑکیوں کا حق اور ان کے شرعی حصے کے حصول کے لیے جاری کیا ۔ اس میں ایسے مضامین لکھے گئے جو اسلام کے مطابق والدین کے ترکے میں بیٹیوں کے حق کی حمایت کرتے تھے۔ علاوہ ازیں جائیداد اور وراثت کے حقوق پر مفصل بحثیں کی گئیں۔ تہذیب فاطمہ عباسی نے ۱۹۲۷ء میں اخلاق نسواں کا اجرا کیا۔ اس میں سائنس، مذہب، طب وغیرہ کے حوالے سے مضامین درج کیے گئے۔ ۱۹۲۷ء میں راشد الخیری نے بنات کے نام سے خواتین کے لیے ایک ماہوار رسالے کا اجرا کیا۔ جو ان کے مدرسہ تربیت گاہ بنات کے افکار کی ترجمانی کرتا تھا۔ اس میں مذہب کے حوالے سے لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کو خاص اہمیت دی گئی تھی۔ شاہ محمد عمیر نے ۱۹۲۷ء میں بہار سے رہبر کا اجرا کیا۔ یہ رسالہ بیوہ خواتین کے حقوق اور ان کی رہبری کے لیے نکالا گیا تھا۔ لاہور سے ۱۹۲۸ء میں رضیہ ہاجرہ کی ادارت میں ثریا کا اجرا ہوا۔ یہ رسالہ کم سن لڑکیوں کے لیے رشد و ہدایت کا پیامبر ثابت ہوا۔ جس میں ان کے پڑھنے لکھنے اور گھریلو معاملات سکھانے کی سعی کی گئی۔ محمد عبدالغفار الخیری نے ۱۹۲۸ء میں دہلی سے الفلاح کا اجرا کیا۔ اس میں دینی اور دنیاوی فلاح و بہبود کے حوالے سے مضامین درج کیے گئے۔ جس میں مذہبی تعلیم کو زیادہ اہمیت دی گئی اور اسی حوالے مضامین کا اندراج کیا گیا۔ بی ایل رلیارام کی ادارت میں ۱۹۲۹ء میں اتحادِ مادراں کا اجرا ہوا۔ یہ رسالہ خاص طور پر عیسائی خواتین کے لیے جاری کیا گیا تھا۔ مولوی سید محمد رضی نے ۱۹۲۹ء میں عفت کا اجرا کیا جس کی مدیرہ امۃ الزہرا بیگم حیا تھیں۔ جس میں تاریخی، مذہبی، سماجی، معاشرتی اور ادبی مضامین پیش کیے گئے۔ مضامین کے لیے سادہ اور سلیس زبان کو اہمیت دی گئی۔ اس رسالے میں معاشرتی مسائل کی عکاسی کے ساتھ ساتھ مسائل نسواں کے حل اور حقوق نسواں کے حصول کے حوالے سے بھی اہم خدمات سرانجام دی گئیں۔ خورشید اقبال حیا کی ادارت میں ۱۹۲۹ء میں میرٹھ سے خاتون مشرق کا اجرا ہوا۔ جس میں اصلاح نسواں کے حوالے سے مضامین ملتے ہیں۔ نور جہاں بیگم ناز دہلوی اور کلثوم فرید بیگم دہلوی کی ادارت میں خاتون کا اجرا ہوا۔ جو خواتین کی ذہنی، اخلاقی اور معاشرتی تربیت کے لیے کارگر ثابت ہوا۔ خواجہ حسن نظامی نے استانی اور تبلیغ نسواں کی طرح عورتوں کا اخبار بھی خاص طور پر طبقہ اناث کی فلاح و بہبود کے لیے جاری کیا اس اخبار کے اجرا کے مقاصد اور ان کی تفصیل سرورق پر ان الفاظ میں درج ہے:

- **تعلیم کا مطلب:** ہندوستانی اقوام کی عورتوں میں ایسی تعلیم پھیلانے کی کوشش کرنا جس سے ان کا مذہب اور پرانی تہذیب قائم رہے اور وہ نئے زمانے کی ہر نئی چیز سے خبردار بھی ہو جائیں۔

- **آزادی کا مطلب:** عورتوں کے دماغ اور ذہن کو ہر قسم کی نامناسب قید سے آزاد کرنا اور پرانے زمانے کے توہمات اور نئے زمانے کی فضولیات سے چھڑانا اور بچانا اور ان کے سیاسی و تمدنی حقوق کو حاصل کرنا اور مردوں کے ناجائز دباؤ سے عورتوں کو جائز طریقے سے نجات دلانا۔
- **اتحاد کا مطلب:** ہر قوم و مذہب کی ہندوستانی عورتوں میں اتحاد اور ایکا پیدا کرنا۔ ایک دوسرے کے مذہب اور معاشرت اور رواج سے آگاہ کر کے باہمی ملاپ بڑھانا۔ عورتوں میں بالحاظ قوم و مذہب ایک دوسرے کی مدد کرنے کا جذبہ پیدا کرنا۔ ان کے ذریعے ہندوستان کو ایک قوم بنانا۔
- **ترقی کا مطلب:** مذہب اور پرانی تہذیب اور نئی تہذیب کی اچھی باتوں کے ذریعے سب عورتوں میں عملی ترقی کے طریقے رائج کرنا، بے کار اور لاوارث عورتوں کو معاش کے وسائل بتانا اور ہندوستانی عورتوں کو ترقی یافتہ دنیا کی اونچائی تک پہنچانے کی کوشش کرنا۔
- **اصلاح کا مقصد:** ہندوستانی عورتوں کو ہر برے رواج اور فضول خرچی اور بری عادات سے بچانا اور ہر عورت کو اپنی ذات اور اپنے بچوں اور اپنے گھر اور اپنی قوم کی اصلاح کے لیے تیار کرنا اور جن چیزوں سے اصلاح ہوتی ہو ان کی دلیری کے ساتھ حمایت کرنا۔ "[۴۴]

۱۹۳۰ء میں نسوانی دنیا کا اجرا شوکت علی فہمی کی ادارت میں ہوا۔ اس میں بھی خواتین کی اصلاح کو مد نظر رکھتے ہوئے مضامین لکھے جاتے تھے۔ کنیز فاطمہ حیاؔ نے ۱۹۳۰ء میں ماہنامہ حیا کا اجرا کیا۔ جس میں تعلیم و تربیت اور اصلاح نسواں کے حوالے سے مضامین لکھے جاتے تھے۔ آنسہ جمال کی ادارت میں ۱۹۳۱ میں ماہنامہ حریم خواتین کے لیے جاری ہوا۔ منی لال گردھن نے ۱۹۳۱ء میں لاہور سے گر ہستی کا اجرا کیا۔ اس میں خواتین کی خانگی ذمہ داریوں کو خاص طور پر مد نظر رکھا گیا۔ علاوہ ازیں ان کی آرائش و زیبائش، سماجی اور معاشرتی اصلاح اور میاں بیوی کے باہمی معاملات و مسائل اور حقوق و فرائض پر لکھا گیا۔ سیدہ بیگم خویشگی نے ۱۹۳۱ء میں حیدرآباد سے ہمجولی کا اجرا کیا۔ جس میں تعلیم نسواں اور خانگی امور کو بہتر بنانے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ عنایت عارف نے ۱۹۳۱ء میں لاہور سے ماہنامہ مسلمہ کا اجرا کیا۔ صادقہ قریشی نے ۱۹۳۲ء میں دکن سے سفینہ نسواں کا اجرا کیا۔ ۱۹۳۴ میں رسالہ جوہر نسواں کا اجرا کیا جس کا مقصد عورتوں کو گھریلو دستکاری وغیرہ سکھانا تھا۔ مولانا عبدالحق عباس جالندھری نے ۱۹۳۲ء میں مسلمہ کا اجرا جالندھر سے کیا۔ جس میں مذہب، اخلاقیات، سماجی و معاشرتی معاملات سے آگہی، سیاسی شعور کی بیداری اور تربیت اطفال جیسے موضوعات کے حوالے سے لکھا جاتا رہا۔

بیسویں صدی میں خواتین کا مقبول ترین رسالہ زیب النساء ہے۔ جس کا اجرا ۱۹۳۴ء میں لاہور سے ہوا۔ "اس کا بنیادی مقصد مسلمان خانہ دار خواتین کی ادبی اور سماجی رہنمائی تھا اور اس مقصد کو اس رسالے نے بڑی خوش اسلوبی سے حاصل کیا۔۔۔زیب النسا نے خواتین کے جذباتی ادب کو پروان چڑھانے میں خصوصی خدمات سرانجام دیں۔"[۳۳] زینب خاتون (دختر منشی محبوب عالم) نے ۱۹۳۴ میں بمبئی سے ہفتہ وار خاتون کا اجرا کیا جو ۱۹۴۱ میں لاہور منتقل کر دیا گیا۔ اس میں بیداری نسواں کے لیے مضامین لکھے گئے۔ حبیب بلقیس بیگم کی ادارت میں ۱۹۳۴ میں مستورات کا اجرا کان پور سے ہوا۔ اس میں خاص طور پر مذہبی معاملات و مسائل، اصلاح رسوم معاشرہ، اخلاقی اقدار کی پاسداری، تربیت اطفال، وغیرہ جیسے موضوعات پر لکھا گیا۔ فاروقی بیگم کی ادارت میں ۱۹۳۴ میں رہبر نسواں کا اجرا دہلی سے ہوا۔ رسالے میں حقوق نسواں کی حفاظت، مشرقی روایات کی پاسداری، مغربی تہذیب کی اندھا دھن تقلید سے گریز اور اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے جیسے موضوعات پر متعدد مضامین لکھے گئے۔ جوہر نسواں کا اجرا خاتون اکرم کی یاد میں کیا گیا۔ جس کی ترتیب و تدوین عذیر فاطمہ، آمنہ نازلی اور خدیجہ بائی کیا کرتی تھیں۔ خواتین کی شعور و بیداری کے لیے نکالے گئے دیگر رسائل کی طرح اس کا مقصد بھی خواتین کی سماجی حالت کو بہتر بنانا، انھیں فرسودہ رسومات سے نکال کر بلند خیال بنانا اور اپنی دینی تعلیمات کا پاس رکھتے ہوئے جدید تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کے طریقے سکھانا تھا۔ اس میں ان کے حقوق و فرائض کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ اس کا اجرا ۱۹۳۴ء میں دہلی سے ہوا۔ ظہور فاطمہ بیگم (ارشد صاحبہ) کی ادارت میں ۱۹۳۴ میں بھوپال سے بانو کا اجرا ہوا۔ اس کا مقصد بھی خواتین کی حالت کو بہتر بنانا تھا۔ پشاور سے ۱۹۳۴ء میں عبدالمجید اصغر کی ادارت میں خادم نسواں کا اجرا ہوا۔ جس میں تربیت نسواں کو مد نظر رکھتے ہوئے مختلف اصناف میں خیالات کی ترسیل کی جاتی تھی۔ ج۔ ب بیگم کی ادارت میں نسوانی دنیا کا اجرا ۱۹۳۵ میں لاہور سے ہوا۔ اس کے اجرا کا مقصد طبقہ اناث کی ترقی اور ان میں شعور و بیداری پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اخلاقی و مذہبی تربیت کرنا بھی تھا۔ یہ رسالہ اسلامی روایات کی پاسداری کرتے ہوئے انہی نقوش پر خواتین کی تربیت کے امور سر انجام دے رہا تھا۔ اہم لکھنے والی خواتین میں محترمہ شفیق بانو، محترمہ جمیلہ بیگم، محترمہ کنیز فاطمہ حیاؔ، محترمہ رضیہ بیگم ارشد وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں سید فرید جعفری مچھلی شہری کی ادارت میں لیلیٰ کا اجرا دہلی سے ہوا۔ دیگر معاونین میں سیدہ نیر نور اللہ غازی پوری، وزیر بیگم، آمنہ دیوی پریاگی، مس اختر حسین، شوکت دلہن، مخفی بیگم، مس گوہر اقبال حور، شکنتلا دیوی اور زہرہ جعفری اس کی باقاعدہ مضمون نگاروں میں بھی شامل ہوتی ہیں۔ اس میں نظم و نثر کے پیرائے میں تربیت نسواں کا کام کیا گیا۔ معاشرتی مسائل کے حوالے سے خاص طور پر لکھا گیا۔ ع۔ س نازک (زوجہ امتیاز حسن) صنف نازک کی مدیرہ قرار پائیں۔ انھوں نے عنایت احمدی بیگم کے تعاون سے

رسالے کی ترتیب و تدوین کی۔ اس میں زیادہ تر مضامین خواتین لکھاریوں کے ہوتے تھے۔ جن میں خواتین کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اس کا اجرا ۱۹۳۵۱ء میں لاہور سے ہوا۔ بیگم مولانا محمد علی جوہر کی سرپرستی میں ۱۹۳۵ میں دہلی سے صدائے نسواں کا اجرا کیا گیا۔ انور بزمی الٰہ آبادی اس کے ایڈیٹر اور امۃ الکریم صاحبہ امۃ اس کی نگران مقرر ہوئی۔ رسالے کے اجرا کے مقاصد میں ایک مقصد خواتین ہند کو مغرب کی اندھادھند تقلید سے باز رکھنا اور مشرقی روایات سے جڑے رہنے کی ترغیب دینا تھا۔ اگست ۱۹۳۷ میں راجہ غلام احمد مزمل نے صدائے نسواں کا نام تبدیل کر کے آواز نسواں رکھ دیا۔ ۱۹۳۶ء میں ش۔ا شمیم جالندھری کی ادارت میں الزہرا کا اجرا جالندھر سے ہوا۔ رسالے کے اجرا کا مقصد تعلیم نسواں کا فروغ اور اصلاح معاشرہ تھا۔ اختر النسا کی ادارت میں ۱۹۳۶ میں ماہنامہ جہاں آرا کا اجرا بریلی سے ہوا۔ ماہنامہ طبیب نسواں کا اجرا ۱۹۳۷ء میں ڈاکٹر سعید احمد بریلوی کی ادارت میں دہلی سے ہوا جس کی معاونت کے فرائض سلطان دلہن آمنہ خاتون نے انجام دیے۔ اپنے نام کے مصداق رسالے نے خواتین کے لیے طبیب کا سا کام کیا۔ اس نے روحانی معالج کا کردار ادا کرتے ہوئے ہندوستانی خواتین کے اذہان سے ان آلائشوں کو اتار پھینکنے کا کام کیا جو ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ تھیں۔ طبیب نسواں نے خواتین کی اصلاح اور بیداری میں نمایاں خدمات سر انجام دیں، بعد ازاں اس رسالے کو ہمجولی کا نام دے دیا گیا جس کا تذکرہ اگلی سطور میں کیا جائے گا۔ دونوں رسائل نے خواتین کی تعلیمی، تمدنی، اخلاقی اور معاشرتی اصلاح کے حوالے سے اہم کردار ادا کیا۔ خاتون سرحد پشاور سے ۱۹۳۷ء میں ش۔ت بنت میاں غلام صمدانی مرحوم کی ادارت میں جاری ہوا۔ اس میں خواتین کے حقوق و فرائض سے متعلق مضامین کے علاوہ بچوں کی تربیت، معاشرتی ترقی اور شعور و بیداری نسواں کے حوالے سے مضامین درج کیے جاتے تھے۔ سحر صاحبہ کی ادارت میں بمبئی سے ۱۹۳۷ میں ماہنامہ تنویر کا اجرا ہوا۔ جس میں خواتین کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ بلند حوصلگی کی تربیت بھی دی گئی۔ فہمیدہ خاتون فرحت اور نور النسا بیگم کی ادارت میں ۱۹۳۸ء میں دہلی سے خاتون مشرق کا اجرا ہوا۔ جس میں تعلیم اور آزادی نسواں کے حوالے سے مضامین تحریر کیے گئے۔ نمایاں لکھنے والوں میں نفیس فاطمہ صدیقی، غزالہ اشفاق، منظورہ اختر، مس شہناز، قمر شبنم مظہری، حمیدہ خانم، فاطمہ انیس بریلوی، صالحہ عابد حسین اور مہر النسا مہر کے نام قابل ذکر ہیں۔ عبد الحفیظ صاحب نے ۱۹۳۸ء میں دکن سے رسالہ معلومات کا اجرا کیا۔ جس میں بیگم حفیظ نے خواتین کی تعلیم و ترقی کے لیے اپنی خدمات سر انجام دیں۔ اس دور میں حیدر آباد کی خواتین کے حوالے سے کی جانے والی کوششوں کے بارے میں طیب انصاری یوں رقمطراز ہیں۔ بیگم حفیظ حیدر آباد کی تاریخ میں صحافت میں منفرد مقام کی حامل ہیں۔ بیگم حفیظ کی اردو صحافت سے وابستگی یقیناً

اس زمانے میں خواتین کے لیے دعوت عمل کا باعث بنی ہوگی۔[44] شیخ اکرام نے اپنی بیگم مسز محمد اکرام کے تعاون سے ۱۹۳۹ء میں انیس نسواں کا اجرا لاہور سے کیا۔ اس کے مقاصد کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

انیس نسواں اس غرض سے جاری کیا گیا ہے کہ مسلم خواتین کو اپنے مذہب کی طرف متوجہ کرے اور ان کو نئی تہذیب کی زد سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے، اس لیے انیس نسواں کا مقصد اولیں قرآن مجید کے مطالب اور معارف کی وضاحت ہوگا۔۔۔۔دوسرا مقصد ان رسوم مذموم کی تخریب کے لیے عملی تدابیر کا اختیار کرنا ہے جو مسلمانوں کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہیں اور مسلمانوں کا کسی طرح پیچھا نہیں چھوڑ تیں۔ تہذیب مغرب کے جدید کرشمے جو وقتاً فوقتاً اخبارات میں چھپتے رہتے ہیں، وہ بھی ناظرات انیس نسواں کی ضیافت طبع کے لیے پیش ہوتے رہیں گے۔۔۔"[45]

مندرجہ بالا اقتباس کے مطابق انیس نسواں نے اپنی خدمات پیش کیں۔ رسالے میں وقتاً فوقتاً سورہ النساء، سورہ فاتحہ اور سورہ البقرۃ کے مفاہیم و مطالب کو سہل انداز میں پیش کیا جاتا رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات اور روایات و رسومات کو بھی خاص طور پر پیش کیا گیا۔ اقبال سلمٰی نے ۱۹۳۹ء میں سہاگ کے نام سے ایک رسالے کا اجرا لاہور سے کیا۔ جس میں اسلامی تقاضوں کے مطابق تعلیم اور تربیت نسواں کی کوششیں کی گئی۔ اس رسالے میں خواتین کی معاشرتی اور سماجی ترقی اور اخلاقی برتری کے حوالے سے بھی متعدد مضامین لکھے گئے علاوہ ازیں نجی معاملات کو خوش اسلوبی سے سرانجام دینے کی تربیت بھی کی گئی۔ ڈاکٹر سعید احمد دہلوی اور سلطان دلہن آمنہ خاتون نے طبقہ نسواں کے لیے طبیب نسواں کا اجرا کیا تھا۔ اس کے بعد دہلی سے ۱۹۳۹ء ہمجولی کا اجرا بھی ان کا کارنامہ خاص ہے۔ جسے طبیب نسواں کا ہی ایک سلسلہ سمجھنا چاہیے۔ حمیدہ خانم نے ۱۹۳۹ء میں لاہور سے رفیق نسواں کا اجرا کیا۔ جس میں خواتین کی تعلیمی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہانیاں لکھی گئیں۔ اس میں اصلاحی پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے تعلیم نسواں کا کام جاری رکھا گیا۔ رفیق نسواں میں لکھنے والوں میں عصمت چغتائی، رقیہ بیگم، ناصرہ خانم، بلقیس جہاں اور ثریا جبیں کے نام سرفہرست ہیں۔

حور (لاہور) ۱۹۴۰ء میں امۃ اللہ قریشی کی ادارت میں جاری ہوا۔ اس رسالے نے گھر دار خواتین کو سماجی مسائل و معاملات سے ہم آہنگ کرنے کی سعی کی۔ شعاع اردو ۱۹۴۱ میں کراچی سے جاری ہوا۔ اس کی مجلس ادارت میں جہاں بانو بیگم، بشیر النساء شفیق بانو شفیق، زینت ساجدہ، آنسہ وحیدہ عزیز اور میمونہ تسنیم شامل تھیں۔ اس میں بھی تعلیم نسواں کی حمایت کی گئی۔ حمیدہ بیگم نذیر کی ادارت میں ۱۹۴۱ء میں سری نگر سے ماہنامہ نرگس کا اجرا ہوا۔ اس میں بھی خواتین کے حقوق کے حوالے مضامین ملتے ہیں۔ ۱۹۴۰ء میں صحۃ النسا بیگم اور صغرا

بیگم کی ادارت میں مومنہ کا اجرا حیدر آباد، دکن سے ہوا۔ جس سے مذہبی تعلیم اور اصلاح معاشرہ کی تحریک کو فروغ ملا۔ یہ اس دور میں مسلم خواتین کی تعلیم و تربیت کے فرائض نبھا رہا تھا۔ اس میں تواتر کے ساتھ اسلامی احکامات اور درس قرآن ہوا کرتا تھا۔ حمید النسا (حمیدہ عسکری عثمانیہ) نے ۱۹۴۴ء میں خیابان دکن کا اجرا حیدر آباد دکن سے کیا۔ اس سے نوجوان طبقے میں علمی اور ادبی حوالوں سے نمایاں تبدیلی رونما ہوئی۔ قدامت پسندی کی جگہ جدت پسندی نے لے لی اور خواتین روشن خیال ہوئی۔ اس رسالے نے خواتین میں علمی و ادبی ذوق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس رسالے میں اسلام میں پردے کا تصور، شادی کے معاملے میں لڑکی کی پسند خواتین کی تعلیمی ضروریات وغیرہ کے موضوع پر مضامین لکھے جاتے تھے۔ اہم مضمون نگار خواتین میں حمید النسا، م ف بیگم صاحبہ، حفیظ النسا بیگم، رضیہ فاطمہ، صغریٰ فاطمہ، غفور النسا بیگم، عصمت النسا بیگم، زہرا فاطمہ، نفیسہ بیگم، ع۔ س صاحبہ اور تہمینہ عزیز کے نام شامل ہیں۔ نگہت صاحبہ کی ادارت میں ماہنامہ دل کش کا اجرا یوپی (امروہہ) سے ۱۹۴۴ء میں ہوا۔ اس میں فن مصوری کی ترویج کے لیے اقدامات کیے گئے۔ صغریٰ بیگم کی ادارت میں ۱۹۴۵ میں کلکتہ سے ماہنامہ تجلی کا اجرا ہوا۔ ۱۹۴۶ء میں عبداللہ ملک اور عائشہ عبداللہ نے لاہور سے ماہنامہ نسوانی دنیا کا اجرا کیا۔ جس میں ترقی پسند نظریات کی پیشکش کی گئی اور انھیں خوب سراہا بھی گیا۔ ابو سلیم محمد عبدالحئی نے ۱۹۴۷ء میں رام پور سے الحسنات کا اجرا کیا۔ اس کے اجرا کے مقاصد میں مستورات کی دینی اصلاح، جدید تعلیم سے واقفیت اور آداب معاشرت وغیرہ شامل ہیں۔ اس رسالے نے خواتین کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے مناسب اقدامات کیے۔ بیگم عبدالحفیظ صاحبہ کی ادارت میں ۱۹۴۷ میں دکن سے ہفتہ وار حریت کا اجرا ہوا۔ ۱۹۴۷ میں حیدر آباد، دکن سے احمد مکی نے داستان کا اجرا کیا۔ زینب انور کی ادارت میں ۱۹۴۷ میں ماہنامہ بانو کا اجرا ہوا۔ جس کا مقصد خواتین کی اصلاح اور عام معاملات زندگی کے حوالے سے تربیت کرنا تھا۔

ماہنامہ حرم ۱۹۴۷ء میں ظہیرہ بدر کی ادارت میں شائع ہوا۔ اس رسالے کا مقصد خواتین کو سماجی طور پر بہتر بنانا تھا۔ شفیق بریلوی نے ۱۹۴۷ء میں کراچی سے خاتون پاکستان کا اجرا کیا۔ جس میں اس دور کے جدید تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے مضامین تحریر کیے گئے۔

انیسویں اور بیسویں صدی کے ہندوستان کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہاں کی تعلیمی صورت حال مناسب نہ تھی عورت اور مرد دونوں طبقے زبوں حالی کا شکار تھے۔ ابتدا میں مردوں کے لیے تعلیمی سرگرمیاں تو شروع ہوئیں لیکن خواتین کو یکسر نظر انداز کیا گیا اسی صورت حال کو مد نظر رکھتے ہوئے چند محسنین نے تعلیم نسواں کے حوالے سے اقدامات کیے۔ مشنریوں نے ان کی رسمی تعلیم کے لیے سکولوں کا انتظام تو کیا لیکن نو آبادیاتی ہندوستان کی فضا خواتین کی رسمی تعلیم کے حق میں نہ تھی انھیں چار دیواری میں رہتے ہوئے اپنی دیرینہ رسومات کو

مد نظر رکھتے ہوئے اپنی تعلیمی سرگرمیاں پوری کرنا پڑتی تھی، جو مذہبی تعلیم اور گھر داری کے سوا کچھ نہ تھی۔ اس صورت حال کو مد نظر رکھتے ہوئے اس مسئلہ کا حل ایسے رسائل و جرائد کا اجرا قرار دیا جو ہندوستانی معاشرتی تناظر میں کارگر ثابت ہو۔ اس لیے ایسے رسائل جاری کیے گئے جو ان خواتین کی مذہبی ضرورتوں اور وقتی تقاضوں سے ہم آہنگ تھے۔ ہر مکتب فکر اور مذہب کی عورت کے لیے ان کے اصول و قواعد کے مطابق رسائل جاری کیے گئے جن میں مسلمان خواتین کے لیے جاری کیے گئے رسائل نسبتاً زیادہ تعداد میں موجود ہیں جب کہ عیسائی اور احمدی خواتین کی تعلیم و ترقی کے لیے بھی متعدد رسائل جاری کیے گئے۔ احمدی خاتون اور مصباح خاص طور پر احمدی خواتین کی تعلیم و تربیت کے لیے جاری کیے گئے۔ رفیق نسواں اور اتحاد مادراں نے عیسائی خواتین کی تربیت کا کام کیا۔ ہندو اور مسلمان چوں کہ ایک ہی سماجی ڈھانچے کا حصہ تھے اس لیے بہت سے رسائل نے ان دونوں مذاہب کی خواتین کے لیے تعلیمات دیں۔ مندرجہ بالا تمام معلومات کے حوالے سے یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ تمام رسائل نے ہر مکتب فکر اور ہر مذہب کی عورت کے لیے تعلیم و تربیت اور شعور و آگہی کی کوششیں کی۔

تمام رسائل چند بنیادی مقاصد کے تحت اپنی خدمات سرانجام دے رہے تھے جن میں تعلیم نسواں، آزادی نسواں، مذہبی تعلیمات سے آگہی دلانا، ہر قوم و مذہب کی ہندوستانی عورتوں میں اتحاد اور ایکا پیدا کرنا، عورتوں کو معاش کے وسائل بتانا، عورتوں کو ترقی یافتہ ممالک کے حوالے سے معلومات فراہم کرنا تاکہ وہ اپنی حالت کو سنوارنے کی کوشش کریں۔ قدیم فرسودہ رسومات سے انحراف کرنے کی ترغیب دینا تاکہ وہ ہر برے رواج اور فضول خرچی اور بری عادت سے بچ سکیں اور اپنی ذات، اولاد، گھر اور اپنی قوم کی اصلاح کے لیے تیار رہیں۔

مندرجہ بالا تمام رسائل نے خواتین کی تعلیم و تربیت میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ انھیں باشعور بنانے اور وقتی تقاضوں کے مطابق اپنی زندگی کو بہتر بنانے میں مشعل راہ کا کام کیا یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ اگر ان رسائل کا اجرا نہ ہوتا تو ہم اردو کے منظر نامے پر اتنی نامور خواتین نہ دیکھ پاتے جنھوں نے ادب میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ ان رسائل نے جن امور کے حوالے سے خواتین میں شعور و آگہی پیدا کرنے کی کوشش کی ان میں خاص طور پر خواتین کا حقِ تعلیم، حقِ رائے دہی، آزادی اظہار، پردے کی بے جا اور غیر شرعی سختی، اسلام میں حقوقِ نسواں خاص طور پر اہمیت کے حامل تھے۔ علاوہ ازیں تربیتِ اطفال، عورت کی خانگی ذمہ داریاں، رشتۂ ازدواج سے متعلقہ مسائل اور عورت کی سماجی اور اقتصادی زندگی جیسے موضوعات کو بھی بطور خاص پیش کیا گیا تاکہ ہندوستانی مستورات ہر شعبہ زندگی میں بہتری لاتے ہوئے اپنا تشخص قائم کر سکیں اور اپنی انفرادیت منوا سکیں۔

حوالہ جات

۱۔ نجم السحر اعظمی، علامہ راشد الخیری :شخصیت اور ادبی خدمات(دہلی:ادارہ بزم خضر راہ، ۲۰۰۰ء): ص ۴۵۔

۲۔ محمد امین زبیری،مسلم خواتین کی تعلیم (کراچی:آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس،۱۹۶۱ء) : ص۶۵،۶۶۔

۳۔ فرحت جہاں،بیسویں صدی میں خواتین کی غیر افسانوی نثر :ایک مطالعہ (دہلی:براؤن بک پبلی کیشنز،۲۰۱۵ء): ص۱۴،۱۵۔

۴۔ محمد امین زبیری،مسلم خواتین کی تعلیم، ص۶۵۔

۵۔ ایضاً، ص۸۵۔

۶۔ فرحت جہاں، ص۷۔

۷۔ حاذق الخیری، "محمدی بیگم اور تہذیب نسواں"مشمولہ سیدہ محمدی بیگم اور ان کا خاندان (لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۸): ص۱۶۔

۸۔ نسیم آرا،اردو صحافت کے ارتقا میں خواتین کا حصہ (پاکستان:انجمن ترقی اردو) : ص۱۱۴۔

۹۔ ایضاً، ص۱۲۲۔

۱۰۔ نجم السحر اعظمی، ص۴۵۔

۱۱۔ ڈاکٹر انور سدید،پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ (اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۲) : ص۳۰۲۔

۱۲۔ رفیق نسواں، جلد۱، شمارہ۲(۲۴ اپریل ۱۸۸۵ء): ص۲۔

۱۳۔ "مسز بیڈلی"مشمولہ رفیق نسواں، جلد۱، شمارہ۲(۲۴ اپریل ۱۸۸۵ء): ص۳۔

۱۴۔ انور سدید، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ ۔ص۳۰۳۔

۱۵۔ شریف بیبیاں،(لاہور:مطبع خادم التعلیم،جون ۱۸۹۵ا): سرورق۔

۱۶۔ منشی محب عالم،شریف بیبیاں(ستمبر ۱۸۹۳ء): ص۹۔

۱۷۔ مولوی محب حسین،معلم نسواں، جلد۱۱، نمبر۴(ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ): اشتہار معلم نسواں۔

۱۸۔ حاذق الخیری، ص۱۷۔

۱۹۔ تہذیب نسواں (لاہور،۶جولائی۱۹۱۸ء):ص۴۲۴۔

۲۰۔ نسیم آرا، ص۱۸۵،۱۸۶۔

۲۱۔ مولانا عبدالحلیم شرر،پردہ عصمت،جلد۱،شمارہ۲(لکھنو،یکم رمضان۱۳۱۸ھ):ص۲۔

۲۲۔ نسیم آرا، ص۱۸۹۔

۲۳۔ امداد صابری،تاریخ صحافت اردو(جلد چہارم)،(دہلی:یونین پریس اردو بازار،۱۹۷۴):ص۱۹۹۔

۲۴۔ نسیم آرا، ص۲۰۰۔

۲۵۔ انور سدید، ص۳۰۴۔

۲۶۔ شیخ عبداللہ،خاتون ،جلد۱،نمبر۱(علی گڑھ،جولائی۱۹۰۴)۔

۲۷۔ شیخ عبداللہ، خاتون،جلد۱،نمبر۱(علی گڑھ،جولائی۱۹۰۴ء):ص۳۔

۲۸۔ مولوی ممتاز علی،مشیر مادر،جلد۱(۱۹۰۵ء):ص۲-۱۔

۲۹ امداد صابری، ص۲۵۴۔

۳۰۔ انور سدید، ص۳۰۵۔

۳۱ پردہ نشین۔جلد۱،نمبر۱،۱۹۰۶۔

۳۲۔ پردہ نشین،جلد۱،نمبر۱(۱۹۰۶ء)۔

۳۳ شیخ محمد اکرام،"عصمت"مشمولہ عصمت(جلد۱،نمبر۱،جون۱۹۰۸،دہلی):ص۔

۳۴۔ علامہ راشد الخیری، ص۱۸۔

۳۵۔ عصمت،جلد۱،نمبر۱(دہلی،جون۱۹۰۸ء):ص۳۔

۳۶۔ شریف بی بی،جلد۱،نمبر۴،اکتوبر۱۹۰۹،سرورق۔

۳۷۔ امداد صابری،تاریخ صحافت اردو(جلد۵)،(دہلی:جدید پرنٹنگ پریس،س ن):ص۲۷۱۔

۳۸۔ ظل السلطان،جلد۱،نمبر۱،۱۹۱۲

۳۹۔ سہیلی،جلد۲،نمبر۶(دہلی،ماہ ذی الحجہ۱۳۳۸ء):سرورق۔

۴۰۔ قیصری بیگم،النساء،جلد۲،نمبر۱۰(حیدرآباد دکن،۱۹۲۰ء):ص۵۔

۴۱۔ انور سدید، ص۳۰۷۔

۴۲۔ ہفتہ وار عورتوں کا اخبار،جنوری۱۹۳۰،دہلی۔

۴۳۔ انور سدید۔ ص۳۰۹۔

۴۴۔ طیب انصاری۔حیدر آباد میں اردو صحافت(۱۸۵۷ تا۱۹۵۹)،(حیدرآباد:اعجاز پرنٹنگ پریس،۱۹۸۰)،:ص۲۲۶تا۲۲۷۔

۴۵۔ شیخ محمد اکرام،(انیس نسواں،دہلی،جلد ا،نمبر ا،۱۹۳۹):ص۵۔

باب دوم:

تحریک تعلیم نسواں اور تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین کا نسائی شعور

باب دوم:

تحریک تعلیم نسواں اور تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین کا نسائی شعور

سماج مختلف النوع اور منفرد الطبع اشخاص سے مل کر بنتا ہے، جن کا انداز فکر ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اور سماجی حالات وواقعات سے متعلق نظریات کے بارے میں افتراقات ومماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ یہ افراد علم و فن، صنفی معیارات، طبقاتی امتیازات، سیاسی معاملات، مروجہ عقائد و افکار اور تعلیمی معاملات کے حوالے سے انفرادی نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ زندگی کے معاملات کو دیکھنے اور ان سے نبٹنے کے لیے ہر شخص نے اپنے خاص پیمانے وضع کر رکھے ہیں اور اس حوالے سے ان کی اپنی ایک رائے موجود ہے۔ جنھیں اس شخص کا انفرادی شعور کہا جاسکتا ہے اور یہی انفرادی شعور جب سماج کے حوالے سے دیکھا جائے تو فرد کا سماجی شعور بن جاتا ہے۔ اسی تناظر میں اگر اس آگہی کو محض خواتین تک مخصوص کیا جائے تو یہ شعور نسواں کہلائے گا۔

مغرب جو جدید علوم وفنون میں سب سے آگے ہے اور انسانی حقوق کے پاسبان کے طور پر صف اول میں کھڑا نظر آتا ہے۔ اس نے بھی خواتین کے بنیادی حقوق کو قبول کرنے میں تاخیر کی۔ انیسویں صدی تک وہاں کی خواتین کو ان بنیادی ضروریات اور حقوق سے محروم رکھا گیا جن کی وہ بحیثیت انسان حق دار ہیں۔ مغرب میں انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں خواتین نے اپنے حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد شروع کی۔۔۔۔۔اٹھارویں صدی میں عورتوں کی حق رائے دہی کی تحریک (suffrages) نے بھی ان کے شعور کو جگانے اور عورت کی آزادی کی تاریخ میں اہم باب رقم کیا۔۔۔۔" یہ جدوجہد تین بنیادی مرحلوں میں ارتقا پذیر ہوئی۔

ابتدا میں خواتین نے انسان ہونے کے ناطے اپنے بنیادی انسانی حقوق کا تقاضا کیا۔ جس کی وجہ سے انھیں سیاسی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے اپنے مؤقف پر ڈٹی رہیں۔ ان خواتین کی ثابت قدمی اور مستقل مزاجی سے بعد ازاں اس مہم نے ایک تحریک کی شکل اختیار کرلی۔ جس کا پہلا مرحلہ قریباً ۱۸۷۰ ء میں شروع ہوا۔ جس میں خواتین نے ووٹ دینے کا اختیار مانگا تاکہ مرد کی طرح ایک عام شہری ہونے کے ناطے وہ ان تمام سہولتوں سے فیض اٹھا سکیں جو محض ایک عورت ہونے کے ناطے اس کے لیے ممنوع قرار دے دی گئی تھیں۔ اس دور کی خواتین نے اپنے جن حقوق کے حصول کے لیے آواز اٹھائی ان میں مرد اور عورت کی ملازمت کی یکساں اجرت، بچے کی تحویل کا حق، وراثت اور جائداد میں حصہ، زوجین کے حقوق، بحیثیت انسان اپنی زندگی آپ

اپنی مرضی سے گزارنے کا حق اور ووٹ کا حق وغیرہ شامل تھے۔ یہ تمام حقوق انھیں فوری حاصل نہیں ہوئے بل کہ اس کے لیے سفر اجٹس (suffragales) کو بہت سی قربانیاں دینا پڑی اور انہی کی قربانیوں کی وجہ سے آئندہ آنے والی خواتین کے لیے راہ ہموار ہوئی اور ان میں جذبہ اور جرات پیدا ہوئی۔ یہ جدوجہد انیسویں صدی تک جاری وساری رہی۔ انیس ہارون اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

> ۱۹۲۰ء میں کلارا یٹکن ،الیگزنڈر ا کونستائی اور کرپس کایا لینن جیسی خواتین نے عورتوں کی ملازمت،کام کی مساوی اجرت اور ان کے حقوق کے بارے بہت سے سوال اٹھائے اور یورپ کی وہ عورت جو سرمایہ دارانہ نظام کے آنے سے پدر شاہی (Patriarchy) کو مضبوط ہوتا دیکھ رہی تھی۔اس نے رہنمائی اور شعور حاصل کیا۔۔۔[۲]

۱۹۲۰ء میں تمام تر مشکلات کے بعد بالآخر خواتین کو ووٹ دینے کا حق مل گیا۔"برطانیہ میں خواتین کو یہ حق ۱۹۱۸ء میں جزوی طور پر ملا اور پھر ۱۹۲۸ء میں سب خواتین کو یہ حق حاصل ہو گیا"[۳] امریکی خواتین کو دیگر ممالک کی خواتین کی نسبت زیادہ مشکلیں برداشت کرنا پڑیں۔

۱۹۶۰ء میں اس مہم نے ایک باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کر لی۔اس کا دوسرا مرحلہ ۱۹۶۰ء میں شروع ہوا۔ جس میں خواتین نے اپنے بنیادی حقوق کے حصول کے بعد گھریلو اور سماجی زندگی کو بہتر بنانے کی سعی شروع کی۔ "اس میں نجی اور گھریلو مسائل کو سیاسی مسائل قرار دیا گیا"[۴] اس میں انھوں نے اپنے گھریلو معاملات کے حوالے سے بہت سے مسائل کے حل کی کوشش کی۔ جیسے بچوں کی تربیت اور بچے کی پیدائش کے حوالے سے اقدامات اٹھائے گئے کیوں کہ اس دور میں یہ تصور کیا جاتا تھا کہ بچے کی پیدائش سے لے کر تعلیم وتربیت محض خاتون خانہ کی ذمہ داری ہے اور یہی ایک وجہ ہے کہ وہ معاشی اور اقتصادی طور پر مضبوط نہیں ہو سکی۔اس لیے خواتین نے یہ کوشش کی کہ ان کی اولاد ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہ بننے پائے اور نہ ہی وہ معاشی طور پر غیر مستحکم ہوں اس لیے بچوں کی پرورش سے لے کر گھر کے دیگر امور کی انجام دہی کے لیے خواتین نے اجرت مختص کرنے کا فیصلہ کیا تا کہ معاش کی تنگی کی وجہ سے زندگی تنگ نہ ہونے پائے۔دوسرا مرحلہ تانیثی تحریک میں اس لیے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں خواتین نے مردوں کے برابر اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کی۔خواتین نے اس نکتے پر بھی زور دیا کہ وہ بھی مردوں کی طرح ذہن رکھتی ہیں انھیں محض جسم تک محدود نہیں رکھا جاسکتا۔

ان مطالبات کی منظوری کے بعد تانیثیت کے تیسرے مرحلے کا آغاز ہوا جو قریباً ۱۹۸۰ء میں شروع ہوا اور تاحال کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے،یعنی اس کے بعد کے مراحل میں پہلے سے موجود مسائل کی نوعیت پر غور و خوض کیا گیا۔ تحریک کے تیسرے مرحلے میں یہ نظریات اور رجحانات محض کسی خاص علاقے تک محدود نہ رہے بل

کہ ان نظریات نے بڑے پیمانے پر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ عرب، افریقہ اور ایران سمیت دیگر مسلم دنیا تک یہ نظریات پھیلنا شروع ہو گئے اور خواتین میں اپنے حقوق کے حصول کے لیے شعور اور بیداری پیدا ہوئی۔

مشرق میں یہ نظریات کسی نہ کسی طور پہنچ تو گئے لیکن یہاں صورت حال قدرے مختلف تھی۔ یہاں عورت کو انسان ہونے کے ناطے اپنے بنیادی حقوق کی جنگ لڑنا پڑ رہی تھی۔ جن میں اسے بحیثیت انسان اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنے کا حق چاہیے تھا۔ نا صرف یہ بل کہ معاشرے کے نام نہاد اصول ان کی راہ کی رکاوٹ بنے تھے جس سے ہندوستانی خواتین کو بہت سے مسائل کا سامنا تھا۔ اس لیے یہاں کے مسائل کو مد نظر رکھتے ہوئے غور وخوض کے بعد سماجی برائیوں کے خاتمے کی کوشش کی گئی جو عورت سے اس کے انسان ہونے کے حق کو بھی چھین رہے تھے۔ لیکن یہ اقدامات ہندوستانی عورت کی بہتری کے لیے راہ ہموار کرنے کے لیے کافی نہ تھے۔

ہندوستان میں تو بچپن میں لڑکی کی نسبت طے کرنے کا رواج عام تھا جب اسے لفظ شادی کی اہمیت کا بھی بہتر طور اندازہ نہیں ہوا کرتا۔ شوہر کے انتخاب اور شادی میں اپنی پسند کے علاوہ، تعلیم کا حصول بھی ہندوستانی لڑکیوں کے لیے ایک اہم مسئلہ تھا۔ یہاں لڑکیوں کی رسمی تعلیم کو معیوب سمجھا جاتا تھا، جب کہ ہمارے مذہب اسلام نے صاف لفظوں میں تعلیم کو عورت اور مرد کے لیے لازم قرار دیا ہے۔ "علم حاصل کرو چاہے تمھیں چین کیوں نہ جانا پڑے" میں کہیں عورت اور مرد کی تخصیص نہیں ملتی لیکن مذہب کے اجارہ داروں نے یہ راستہ بھی عالم نسواں کے لیے کٹھن کر دیا اور اسے من گھڑت اصولوں کے مطابق ڈھالنا چاہا۔ اسی طرح تعدد ازدواج بھی اس دور کا ایک اہم مسئلہ رہا۔ اس حوالے سے بھی قرآنی احکامات کو ان کی اصل کے مطابق سمجھنے کی بجائے صورت حال کے مطابق ڈھال کر پیش کیا جانے لگا۔ یوں کہنا بے جا نہ ہو گا کہ اسلامی احکامات پر عمل کی بجائے مردانہ سماجی حکمت عملی نے زور پکڑ لیا اور مردانہ معاشرے نے سارے سماج پر اپنے پنجے مضبوطی سے گاڑھ لیے۔ جہاں پدر سری سوچ سماج پر حاوی تھی وہیں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو سماج سے بغاوت کرتے ہوئے طبقہ اناث کی بہتری کے لیے کام کر رہے تھے۔ جس میں عیسائی مشنریوں کی خدمات قابل ذکر ہیں۔

انیسویں صدی کے اواخر میں ہندوستان کے سماجی ڈھانچے پر نظر دوڑائی جائے تو اس بات کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ مستورات کے حوالے سے کیے جانے والے مشنریوں اور دیگر محسنین کے اقدامات کسی طرح بھی مسلمان ہندوستانی خواتین کے لیے کارگر ثابت نہ ہوئے۔ نہ انھیں چار دیواری سے باہر آنے دیا گیا اور نہ ہی کوئی جدید تعلیمی نظام ان کے چار دیواری کی حدود میں پہنچ سکا۔ خواتین کو سماجی ڈھانچے کو مد نظر رکھتے ہوئے چادر اور چار دیواری میں مقید رہنا پڑتا تھا بل کہ کوئی ایسی چیز بھی ان کی رسائی سے دور رکھی جاتی تھی جو انھیں معلومات بہم پہنچا

سکے۔نہ صرف یہ کہ انھیں معلومات میسر نہ آ سکیں بل کہ بعض اوقات تو منفی قسم کی آراان کی ذات سے منسوب کر دی جاتی تھی اوران کی ذات کو ہدف تنقید بنایا جاتا۔ ان سماجی رویوں کی عکاسی زاہدہ حنانے ان الفاظ میں کی ہے:

> انیسویں صدی کے نصف آخر میں بھی جب کہ سماج میں عورتوں کا پڑھنا معیوب سمجھا جاتا تھا اور لکھنا سیکھنے کے بارے میں تو یہ بات ایک عام کہاوت تھی کہ لڑکیاں بلبلاں ہماری اگر لکھنا سیکھیں گی تو عشق نامے لکھیں گی، اباباوا کی ناک کٹائیں گی، آسمان میں تھگلی لگائیں گی۔[۵]

ہندوستان کے قدامت پرست معاشرے میں کچھ ہستیاں ایسی بھی تھیں جنھوں نے خواتین کو بحیثیت انسان اپنی زندگی بہتر بنانے کے لیے مواقع فراہم کرنے کی سعی کی اور وہ کافی حد تک اس میں کامیاب بھی رہے۔ مولوی ممتاز علی اور شیخ عبداللہ اس دور میں خواتین کی تعلیم و ترقی کے حوالے سے ایک نمایاں نام رکھتے ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کے سماجی ڈھانچے کو مد نظر رکھتے ہوئے ایسے اقدامات کیے کہ خواتین جدید تعلیمی وسائل سے محروم بھی نہ رہیں اور چادر اور چار دیواری والا مسئلہ بھی حائل نہ ہو۔ مستورات کی تعلیم و ترقی اور ان میں شعور و بیداری پیدا کرنے کے لیے اس دور کا سب سے مؤثر ذریعہ ایسے رسائل کا اجرا تھا جو گھر بیٹھے ان کی تربیت کر سکیں اس حوالے سے بہت سے ایسے رسائل جاری کیے گئے جو خواتین میں شعور و بیداری پیدا کر سکیں اور انھیں اپنی ذات اور حقوق کے حوالے سے شعور و آگہی حاصل ہو سکے۔

اس سے پہلے بھی متعدد اصناف سخن میں ایسے موضوعات پیش کیے گئے جن سے خواتین کی تربیت کی جا سکے لیکن ان کے موضوعات محدود تھے۔ جن میں خواتین کو گھر گرہستی، اولاد اور شوہر سے متعلقہ فرائض کی انجام دہی تک محدود کیا جاتا تھا۔ ان تمام امور کے حوالے سے عورت کے رجحان اور رویہ کو معاشرے کی بنائی ہوئی کسوٹی پر اچھی یا بری عورت کا خطاب عطا کر دیا جاتا تھا۔ "ان قصوں کے پیرائے میں خواتین کو اپنی ثقافت و معاشرت اور تعلیم کی طرف رجوع کرنے کی ترغیب دی گئی ہے تاکہ وہ اسلامی خطوط پر اپنی اولاد کی تربیت کر سکیں۔[۶] اسی سلسلے کی ایک کڑی تہذیب نسواں کا اجرا تھا۔ مولوی ممتاز علی نے تحریک تعلیم نسواں کے حوالے سے خصوصی خدمات سرانجام دیں۔ انھوں نے اپنی کتاب حقوق نسواں میں بھی اسلامی تعلیمات کے مطابق خواتین کی تعلیم و ترقی کی راہیں ہموار کرنے کی سعی کی۔ اسی طرح اپنے رسالے تہذیب نسواں میں بھی انہی نکات پر توجہ دی۔

تہذیب نسواں میں ایسے موضوعات کو خاص طور پر پیش کیا گیا جو خواتین میں شعور ذات پیدا کر سکیں۔ اس دنیا میں آنے کا مقصد اور ان سے منسلک ہر رشتے سے متعلقہ معاملات کے حوالے سے ان کی نشو نما کی جا سکے۔ اس دور میں خواتین اتنا شعور بھی نہیں رکھتی تھیں کہ اپنی ذات کے حوالے سے کوئی فیصلہ لے سکیں، فیصلہ لینا تو در کنار انھیں اپنے ساتھ ہونے والے نارواروایے اور استحصال تک کا احساس نہیں تھا۔ انھیں یہ بھی معلوم نہیں

تھا کہ ایک انسان ہونے کے ناطے ان کے حقوق کیا ہیں؟ اور وہ کس مقصد کے تحت پیدا کی گئی ہیں؟تہذیب نسواں کا اجرا اسی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا گیا کہ خواتین کو گھر بیٹھے معلومات بہم پہنچائی جائیں تاکہ انھیں اپنی شخصیت بہتر بنانے کے موقع مل سکیں۔ اس بارے میں مولوی مولوی ممتاز علی تہذیب نسواں کے اجرا کے مقاصد کو یوں بیان کرتے ہیں:

> تہذیب نسواں کے مقاصد کی نسبت کبھی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ اخبار عورتوں کی اصلاح اور عورتوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے نکالا گیا ہے۔ مگر یہ اصلاح اور یہ حفاظت کس طرح کی جائے؟ شریعت کی حدود کے اندر رہ کر اور اپنی شرافت کو قائم رکھ کر۔ یہ نہیں کہ مردوں سے لڑائی کی جائے۔ عورتوں کی اصلاح میں داخل ہے۔۔۔ خانہ داری کا انتظام، بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت، گھر کی حفظ صحت کا انتظام، گھر کے بزرگوں کے باب میں اپنے فرائض کی انجام دہی۔ ان سب فرائض کا تہذیب نسواں میں ہمیشہ خیال رکھا گیا ہے۔[۷]

شعور و تعلیم نسواں کے حوالے سے مولوی ممتاز علی کی خدمات اس لیے بھی قابل ذکر ہیں کہ انھوں نے معاشرتی جبر کے خلاف نہ صرف آواز اٹھائی بل کہ عملی اقدامات سے تعلیم و ترقی کی راہیں بھی ہموار کیں انھوں نے عورت کی سماجی حیثیت کو بہتر بنانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ان کے تمام شرعی حقوق کے تحفظ کے لیے اقدامات اٹھائے۔ انھوں نے ہندوستانی معاشرے کی خواتین کو ان کے اسلامی اور انسانی حقوق سے متعارف کروانے کی سعی کی تاکہ اپنے حقوق کے ادراک سے وہ اپنی سماجی حیثیت کو بہتر بنانے کی کوشش کر سکیں۔ ڈاکٹر حمیرا اشفاق مولوی ممتاز علی کی خدمات کو سراہتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:

> وہ حقوق نسواں کے بہت بڑے حامی اور متوازن معاشرے کی طرف قدم بڑھانے والے مفکر تھے۔ میری دانست میں ان کا کارنامہ سرسید سے بھی زیادہ اہم ہے کیوں کہ نصف سے زائد آبادی (خواتین) کو جبری قید میں رکھ کر رسم و رواج کے پردے میں ان کو تمام انسانی حقوق سے محروم کر کے کوئی بھی صحت مند معاشرہ وجود میں نہیں لایا جا سکتا۔ اس لیے انھوں نے طبقہ مظلوم کی وکالت کا بیڑا اٹھایا۔ اگرچہ یہ منزل دشوار تھی مگر انھوں نے اپنی عملی زندگی میں بھی اس کی مثال قائم کی۔[۸]

مولوی ممتاز علی نے ہندوستانی معاشرے میں برتی جانے والی مرد اور عورت کی تفریق کے خاتمے کے لیے اقدامت بھی کیے۔ ان کے مطابق مرز اور عورت دونوں کو اللہ نے خاص اوصاف کے ساتھ یکساں صلاحیتیں دے کر پیدا کیا ہے اور ان دونوں کا فرض ہے کہ اپنی صلاحیتوں کے مثبت استعمال سے معاشرے میں بہتری لانے کی کوشش کریں۔ لیکن نو آبادیاتی ہندوستانی معاشرے میں صورت حال بالکل مختلف ہے یہاں کے مردوں نے عورت

کو ایک مخصوص دائرے میں قید کر کے معاشرتی معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے ہیں جو قانونِ فطرت کے خلاف ہے اور اس سے طبقہ نسواں مشکلات سے دوچار ہے۔ ایسی صورت میں ضروری تھا کہ خواتین کو اس جہد مسلسل سے نکالنے کے لیے ان کے حقوق سے متعارف کروایا جائے تا کہ وہ خود میدانِ عمل میں آئیں اور اپنی حالت سنواریں۔ ہندوستانی معاشرے کے پس منظر میں تہذیب نسواں کے اجرا کے مقاصد اور اس کی اہمیت کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر حمیرا اشفاق لکھتی ہیں کہ:

> مولوی ممتاز علی نے معاشرے کے دو اہم ارکان مرد اور عورت کو ایک مثبت طریقے سے برابری کی بنیاد پر چلنے کا راستہ تجویز کیا۔ انھوں نے اسلام کی روشنی میں مسلم معاشرے میں عورت کے مقام اور تعمیر معاشرے میں اس کے کردار کو اسلامی قوانین کے مطابق ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی۔۔۔ وہ اپنے ارد گرد پھیلے سماجی ڈھانچے کو پرکھتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مذہب کی غلط تشریح اور تعبیر کر کے خواتین کا استحصال کیا جا رہا ہے، وہ چاہتے تھے کہ ان توہمات کا خاتمہ کیا جائے جو محض مفروضے ہیں اور ان اصل اسلام کی روح کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔[۹]

مندرجہ بالا سطور سے ہندوستانی معاشرے میں مرد کی عام سوچ کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مولوی ممتاز علی کے ساتھ ساتھ ان کی اہلیہ محمدی بیگم کی خدمات قابل قدر ہیں۔ جنھوں نے اس دور کے ہندوستانی معاشرے میں نا صرف ایک زنانہ رسالے کا اجرا کیا بل کہ اس کی ادارت کی ذمہ داری کو قبول کرتے ہوئے بطریق احسن نبھایا۔ اور باوجود اس کے کہ انھیں طنز و ملامت کا سامنا کرنا پڑا انھوں نے اس سے قدم پیچھے نا ہٹایا۔ ڈاکٹر تہمینہ عباس کے مطابق:

> شروع میں اس رسالے کو معاشرے کی طرف سے سخت قسم کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ ممتاز علی نے اس رسالے کی اعزازی کاپیاں مختلف لوگوں کو بھیجی تو وہ اعزازی کاپیاں کھولے بغیر، جوابی خطوط کے ساتھ موصول ہوتیں جن میں ممتاز علی اور ان کی اہلیہ کو تہذیب نسواں کی اشاعت پر سخت برا بھلا کہا جاتا تھا۔"

تہذیب نسواں میں خاص طور پر ایسے مضامین پیش کیے گئے جن سے خواتین کی تربیت کی جاسکے۔ اس میں دینی اور دنیاوی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ طرز معاشرت، بچے کی نگہداشت، حقوق زوجین وغیرہ جیسے موضوعات پر مضامین لکھے گئے۔ تہذیب نسواں میں نہ صرف مضامین کے ذریعے مستورات کی تربیت کی گئی بل کہ ان میں یہ لگن بھی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی کہ وہ اپنی دیگر بہنوں کی معاونت بھی کریں۔ تحائف، باہمی مقابلہ جات اور پذیرائی کے ذریعے اس قابل بنانے کی کوشش کی گئی کہ وہ خود سے اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں اور ان

میں لکھنے پڑھنے کا اشتیاق اور لگن پیدا کی جا سکے۔ اس شعور کو اجاگر کرنے کے لیے مصنفین اور مدیران نے ہر ممکن کوشش کی۔ انھیں صرف اپنی ذات تک محدود نہ رہنے دیا بل کہ ان کی انفرادی صلاحیتوں کو اجتماعی سطح پر بروے کار لانے کی سعی کی گئی اور انھیں اپنے ذاتی نفع و نقصان کا شعور دلانے کے ساتھ ساتھ اجتماعی سطح پر اچھے اعمال کا درس دیا گیا اور ان کی سماجی سرگرمیوں کی ابتدا کی کوشش کی گئی کیوں کہ فرد تنہا کوئی حیثیت نہیں رکھتا اس کی پہچان اس کے دور سے ہوتی ہے۔

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین کا نسائی شعور:

تہذیب نسواں کے اجرا کا مقصد خاص طور پر طبقہ اناث میں شعور و آگہی پیدا کرنا تھا، اس لیے اس رسالے میں ایسے بہت سے مضامین لکھے گئے جنھوں نے خواتین میں شعور و بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی اور انھیں ان کے حقوق سے آگاہ کیا گیا۔ نا صرف یہ کہ انھیں ان کے حقوق کے بارے میں آگاہ کیا گیا بل کہ ان حقوق کے حصول کے لیے کوشش اور جدوجہد کی ترغیب بھی دی گئی۔ ۱۹۳۳ء کے پہلے شمارے میں گزشتہ برس کیے جانے والے اہم اقدامات کے حوالے سے منیجر تہذیب نسواں لکھتے ہیں:

> ۱۹۳۲ء کا نہایت اہم واقعہ ہندوستان کے آئندہ نظام حکومت کا مسئلہ ہے۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے۔ کہ اس سلسلے عورتوں کے حقوق کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔"

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس دور میں تعلیم نسواں اور حقوق نسواں کے لیے عملی اقدامات کیے گئے، نا صرف مرد مصنفین بل کہ خواتین نے بھی اس جدوجہد میں اپنا مثبت کردار ادا کیا۔

زیر نظر تحقیق تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین کے نسائی شعور کے تجزیے پر مشتمل ہے۔ ذیل کی سطور میں تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین کے انفرادی نسائی شعور کا تذکرہ کیا جائے گا۔ (مضمون نگار خواتین کا اندراج الف بائے ترتیب سے کیا گیا ہے۔

ا۔ احمد بیگم:

احمد بیگم نے ہندوستانی رسوم و رواج کے حوالے سے اپنے خیالات رقم کیے ہیں۔ انھوں نے شادی کے وقت لڑکی کی پسند کے حوالے سے یہ باور کروانے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان میں موجود پردے کے رواج کے مطابق لڑکیاں گیارھویں برس ہی میں گھر میں مقید کر دی جاتی ہیں جس کی وجہ سے ان کا رابطہ باہر کی دنیا سے منقطع ہو جاتا ہے۔ یوں انھیں دنیاوی معاملات اور مسائل کی سوجھ بوجھ نہیں ہوتی اس لیے وہ اپنی زندگی کے کسی بھی معاملے میں کوئی بھی فیصلہ لینے سے قاصر ہیں۔ جب کہ دوسری طرف ان کے والدین اپنے تجربے کی بنیاد پر ان سے

بہتر ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے حق میں بہتر فیصلہ لینے کے قابل بھی ہوتے ہیں۔ اسی لیے والدین کے فیصلے پر اکتفا کرنا لڑکیوں کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ مختصراً دیکھا جائے تو انھوں نے روایتی طرز پر شادی بیاہ کے نظریے کو فروغ دیا ہے۔ ان افکار کی ترسیل ان کے مضمون "لڑکیوں سے اجازت شادی"[۱۲] میں ہوئی ہے۔

احمد بیگم نے اپنے ہندوستانی معاشرے میں عورت کی زبوں حالی کی عکاسی کی اور اس کے سدباب کے لیے تجاویز بھی پیش کیں۔ انھوں نے عورت کو اسلام میں دیے گئے حقوق سے متعارف کروایا تاکہ وہ ان حقوق کے حصول کے بعد اپنی زندگی بہتر انداز میں گزارنے کے لائق ہو سکیں۔ ہندوستانی معاشرے کا ایک بڑا مسئلہ عقد بیوگان تھا۔ یہاں مرد کی وفات کے بعد عورت کو ہمیشہ کے لیے اس کے نام سے جڑ رہنے اور اس کی یاد میں آنسو بہانے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ اس کی اپنی ذاتی زندگی دوسروں کے آسرا گزارا کرتی تھی اور وہ بے کس و مددگار اپنی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کے پورا کرنے کے لیے بھی دوسروں کی مرہون منت تھی۔ ان تمام مسائل کے دو حل تھے ایک تو عورت معاشی طور پر مضبوط ہو اور اپنا اور اپنے بچوں کا خرچہ اٹھا سکتی ہو تو پھر تو زندگی بہتر طریقے سے گزر سکتی تھی ل، دوسرا یہ کہ اس کی دوسری شادی کروادی جائے تاکہ اس کا ہونے والا شوہر اس کے اخراجات برداشت کرتے ہوئے اسے اس مشکل سے نکال لے لیکن ہندوستانی معاشرے میں دونوں صورتیں مفقود تھیں نا ہی عورت کو معاشی استحکام حاصل تھا اور نہ ہی اسے یہ اجازت تھی کہ دوسری شادی کر لے اور اپنی زندگی کو نئے سرے سے شروع کرے۔ احمد بیگم نے بھی اس ضمن میں اپنے مضمون کے ذریعے یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش کی کہ بیوہ عورت کی دوسری شادی کروادینا ہی تمام مسائل کا حل ہے۔ اس فکر کا احاطہ ان کے مضمون "عقد بیوگان"[۱۳] میں کیا گیا ہے۔

احمد بیگم نے نا صرف خواتین کو ان کے حقوق سے متعارف کروایا بل کہ اپنے گھر اور اپنی اولاد کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس بھی دلایا۔ ان کا مضمون "بچوں کو بہلانا"[۱۴] اسی حوالے سے درج کیا گیا ہے۔

۴۔ ادریس بیگم:

ادریس بیگم ہندوستانی معاشرے کے عدم توازن کو موضوع بنایا اور یہاں موجود صنفی اختلافات پر تنقید کی۔ انھوں نے لڑکی اور لڑکے میں برتے جانے والے امتیاز کی حوصلہ شکنی اور بحیثیت انسان عورت کے مقام و مرتبے کی اہمیت کو واضح کیا۔ اس ضمن میں انھوں نے ان لڑکیوں کی مفلوک الحالی بیان کی جو اپنے ہی گھر میں غیروں سا برتاؤ برداشت کرتے پر مجبور ہیں اور ان کی اس محکومی کا ازالہ کرنے والا کوئی بھی نہیں۔ انھوں نے سماجی سطح پر برتے جانے والے امتیازات کو بھی موضوع بنایا اور پڑھے لکھے رؤسا کی بیٹیوں سے کمزور طبقے کی لڑکیوں کا موازنہ

کیا۔ انھوں طبقاتی سطح پر برتے جانے والے اس سلوک کو کم علمی اور کم عقلی سے منسوب کیا۔ ان کے مطابق جب خدا نے تمام انسانوں کو ایک سے حقوق دیے ہیں تو طبقات اور صنفی تقسیم سے کیوں انھیں مجروح کیا جارہا ہے۔ اس فکر کی عکاسی ان کے مضمون "زندہ در گور مخلوق"[۱۵] میں کی گئی ہے۔

ادریس بیگم نے اپنی تحریروں کے ذریعے خواتین کی اخلاقی تربیت بھی کی۔ انھوں نے معاملاتِ زندگی کو بہتر بنانے کے لیے ایسے اقدامات کی ترغیب دی کہ اس سے بعد میں کوئی نقصان نہ اٹھانا پڑے۔ اس ضمن میں وہ ان عام رویوں کی مثالوں کے ذریعے خواتین کی اصلاح اور ان میں بہتر شعورِ زندگی پیدا کرنا چاہتی ہیں، جو روزمرہ زندگی میں برتے جارہے ہیں۔ اپنے مضمون "جلد باز طبائع"[۱۶] انھوں نے جلد باز اور عجلت پسند دونوں طبیعت کے لوگوں کا موازنہ کرتے ہوئے یہ باور کروانے کی کوشش کی ہے کہ انسانی زندگی کی بہتری سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے اور بطریق احسن اپنے معاملات نبٹانے میں ہے۔ ایک طرف اگر کسی معاملے میں بے جا جلد بازی کی جائے تو نقصان ہونے کا خدشہ ہے تو دوسری طرف غیر ضروری عجلت بھی معاملہ بگاڑنے میں معاون ہوتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ توازن اور فہم و فراست سے معاملے کی نزاکت سمجھتے ہوئے اقدامات کیے جائیں تاکہ کسی بھی قسم کے نقصان سے بچا جاسکے۔ اس کے علاوہ ہندوستانی نظام میں رائج پردے کے نظام کے حوالے سے بھی اپنے افکار کا اظہار کیا۔ ان کے نزدیک یہاں رائج پردہ اسلامی تعلیمات کے منافی ہے اور عورت کو محکوم کرنے کی غرض سے لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اس فکر کا احاطہ ان کے مضمون "پردہ"[۱۷] میں کیا گیا ہے۔

۳۔ الف۔ ف:

الف۔ ف نے اپنی تحریر کے ذریعے ہندوستانی پردے کی خامیاں اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔ انھوں نے ہندوستانی معاشرے میں نظام پردے پر بحث کی اور محض پردے کی وجہ سے خواتین کو گھر میں قید کرنے کے رواج کو ہدفِ تنقید بنایا۔ ان کے نزدیک مستورات اتنی فہم و فراست تو رکھتی ہیں جس سے انھیں یہ اندازہ ہو جائے کہ کیا غلط ہے اور کیا درست۔ تو پھر اس جبری پردے کی کیا وجہ ہے؟ اور وہ بھی اس قدر حد سے تجاوز کی ہوئی صورت کہ انھیں مانند کسی جانور کے بس کھونٹے سے باندھ دیا جائے اور کوئی مرضی نہ پوچھی جائے۔ ان کے مضمون "مستورات کی نقل و حرکت"[۱۸] میں اس سے متعلقہ معلومات ملتی ہیں۔ انھوں نے شریعت کے مطابق پردے کے مباحث پر بات کی اور اس ناروا سلوک کی مذمت کی جو ہمیشہ سے ہندوستانی خواتین کے ساتھ کیا جارہا ہے۔

۴۔ امت الوحی:

امت الوحی نے تہذیب نسواں میں متعدد موضوعات پر قلم اٹھایا۔ جن میں عورت کو معاشرے کا معزز

شہری اور ایک اہم جزو ثابت کرنے کی کاوشیں کی گئی۔ انھوں نے مرد اور عورت دونوں گروہوں اور طبقات کو موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے اس دور کے عام معاشرتی رویوں پر بھی تنقید کی ہے اور عام انسانی کوتاہیوں کو محض عورت ذات سے منسوب کرکے انھیں کم تر دکھائے جانے پر خفگی کا اظہار بھی کیا۔ ان کے مطابق بحیثیت انسان مرد وزن دونوں سے غلطی سرزد ہو سکتی ہے لیکن ہمیشہ عورت کو ہی کیوں قصوروار ٹھہرایا جاتا ہے۔ اس کا اظہار ان کے مضمون "آزادگی کا الزام پڑھی لکھی لڑکیوں پر"[19] میں ملتا ہے، اس میں ان لڑکیوں کا احوال درج کیا گیا ہے جنھیں تاعمر محض لکھ پڑھ جانے کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ اور ان کے ہر عمل اور ردعمل کا ذمہ دار تعلیم کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ ان کے مطابق مرد وزن سماج اور معاشرے کا برابر حصہ ہیں ہم کسی بھی معاشرتی بگاڑ کا الزام کسی ایک کے سر نہیں دھر سکتے۔ اسی فکر کا اظہار ان کے مضمون "اپنی حالت پر افسوس"[20] میں کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے خواتین کی تعلیم کی ضرورت اور اہمیت باور کروانے کے ساتھ ساتھ ہندوستانی مرد کے عام فکری رویے کی عکاسی بھی کی ہے جو تعلیم کو عورت کی تمام تر بربادیوں کا ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ امت الوحی کے مطابق تعلیم ہی تو واحد وہ سہارا ہے جو انھیں پستی سے نکال کر شعور و فکر کی اونچائیوں تک پہنچا دیتی ہے۔ تعلیم نسواں کی مخالفت نا صرف عورت ذات بل کہ تمام قوم کے ساتھ ایک ظلم ہے کیوں کہ ایک عورت کی گود ہی میں مستقبل کے معمار پر اون چڑھتے ہیں اور اگر بنیاد ہی کمزور ہو تو تمام عمر کی ریاضت بیکار چلی جاتی ہے۔ اپنے ایک اور مضمون "لڑکیوں کی تعلیم سے بے پروائی"[21] میں بھی انھوں نے ہندوستانی معاشرے میں تعلیم نسواں کے فقدان کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور قوم کے روشن مستقبل کی ضمانت کے طور پر تعلیم کی اہمیت بتانے کی کوشش کی ہے۔

امت الوحی کے مضامین کا ایک موضوع گھریلو معاملات بھی ہیں عام طور پر یہاں کی خواتین گھریلو تشدد کی اس قدر عادی ہو جاتی ہیں کہ انھیں یہ محسوس تک نہیں ہوتا کہ ان کی عزت نفس مجروح ہو رہی ہے۔ انھوں نے ایسی خواتین میں یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ کسی بھی قیمت پر اپنی عزت نفس اور تکریم پر سمجھوتا نہ کریں۔ کسی بھی شخص کو یہ اختیار اور حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسرے کی زندگی کو اس کی مرضی سے گزارنے پر مجبور کرے بل عورت کو یہ اختیار ہے کہ وہ اپنی زندگی اپنی خواہشات کے مطابق باعزت طریقے سے بسر کرے۔

امت الوحی نے اپنے مضامین میں ایسے شدت پسند مردوں پر تنقید بھی کی ہے جو عورت کو محض اپنی ملکیت سمجھتے ہیں اور ان کا استحصال کرتے ہیں یہاں تک کہ مارپیٹ سے بھی باز نہیں آتے۔ ان تمام معاملات سے نبٹنے کا واحد حل تعلیم و شعور نسواں بتاتی ہیں کیونکہ جب تک عورت کو اس بات کا احساس نہیں ہوگا کہ وہ بھی معاشرے کا ایک معزز فرد ہے اور کچھ اختیارات رکھتی ہے تب تک یہ استحصال جاری رہے گا۔۔ وہ ہندوستان کے سماجی ڈھانچے پر تنقید کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:

عورتیں تعلیم یافتہ ہو کر آزاد اور فضول خرچ ہو جائیں گی لہذا مردوں کی بچت اور خود مختاری و آرام اسی صورت میں ممکن ہے کہ عورتوں کو مثل جانوروں کے بالکل جاہل رکھا جائے اور پردہ کے نام سے گھروں میں قید رہیں۔[۲۲]

امت الوحی نے مردوں کے ہاتھوں عورتوں کی حق تلفی پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا جس میں حق مہر نہ دینا، بیوہ کے ساتھ برتا جانے والا سلوک، نان نفقہ سے بے پروائی، طلاق میں بے اعتدالیاں، خلع سے بے تعلقی وغیرہ شامل ہیں۔ انھوں نے اس بات کی وضاحت بھی کی کہ ان تمام مسائل پر اسلام کے احکامات موجود ہیں لیکن ہندوستانی معاشرے میں اسلام سے زیادہ رسوم و رواج کو اہم گردانا جاتا ہے جس وجہ سے اسلام سے بے پروائی برتی جارہی ہے۔ ان افکار کی ترسیل ان کے مضمون "مرد خود مختار ہیں"[۲۳] اور "طلاق اور مہر"[۲۴] میں کی گئی ہے۔

امت الوحی نے ہندوستانی معاشرے میں موجود فرسودہ رسوم و رواج کی پابندی اور مذہبی اجارہ داروں کی عدم توجہ پر تنقید بھی کی۔ ان کے مطابق قومی، ملکی اور مذہبی رہنماؤں کے باہمی جھگڑوں اور عداوتوں میں اس قدر مگن ہیں کہ اپنے فرائض نظر انداز کر رہے ہیں۔ ان کی بے توجہی سے معاشرے زبوں حالی کا شکار ہوتا چلا جارہا ہے۔ اسی ضمن میں انھوں نے ہندوستانی خواتین کا تذکرہ بھی کیا ہے جو اپنے شرعی حقوق سے محروم کسم پرسی کی حالت میں زندہ ہیں۔ اپنے مضمون "گلا گھونٹ نکاح"[۲۵] میں انھوں نے شادی بیاہ سے متعلق معاملات اور عورتوں کے مسائل کا تذکرہ کیا ہے اور عورتوں کے تمام تر مسائل کا ذمہ دار مرد معاشرہ ہے۔ اس ضمن میں وہ لکھتی ہیں کہ جس طرح مسلمانوں نے پردے کے معاملے میں بالکل غلط راستہ اختیار کر رکھا ہے۔ اور رسمی اور خود ساختہ پردہ کا نام شرعی پردہ رکھا ہے۔ اسی طرح وہ شادی بیاہ اور نکاح کے معاملات میں بھی غلط راہ پر چل رہے ہیں۔

امت الوحی نے اپنے مضامین کے ذریعے ہندوستانی عورت کو اس غیر ضروری پردے سے نجات دلانے کی کوشش بھی کی۔ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے خواتین میں یہ شعور پیدا کرنا چاہا کہ ہندوستانی معاشرے میں رائج پردہ اسلامی شریعت میں ضروری قرار دیے جانے والے پردے سے یکسر مختلف ہے۔ اسلام نے کہیں بھی عورت کو مقید رکھنے کے لیے پردے کی پابندی نہیں کی جب کہ یہاں کے مرد پردے کو عورت کی محکومی کے لیے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔[۲۶] ہندوستان میں رائج پردے کے نظام سے متعلق انھوں نے اپنی فکر کا اظہار "پردے کی وجہ سے بچت"[۲۷] اور "پردہ"[۲۸] میں بھی کیا۔

ہندوستانی نظام میں خواتین کی صورت حال اور اس کے بہتر حل کی کوششوں کے لیے انھوں نے خواتین کے مسائل کا احاطہ بھی کیا اور انھیں اس صورت حال سے نبرد آزما ہونے کے لیے تحریک بھی دی۔ اس حوالے سے ان کے مضامین میں "حریت و آزادی نسواں"[۲۹] اور "ظلم بے کساں"[۳۰] اہمیت کے حامل ہیں۔

۵۔ام کلثوم:

ام کلثوم نے اپنی فکری صلاحیتوں کا اظہار افسانون اور غیر افسانوی تحریروں کے ذریعے کیا۔تہذیبِ نسواں میں ان کے متعدد مضمون اور افسانوں میں اسی کی غماسی کی گئی ہے۔تہذیب نسواں کے مضامین کے ذریعے ہندوستانی خواتین کی تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا اور اس راہ میں حائل رکاوٹوں کو ہٹانے کی سعی کی گئی۔ جس سے بعد ازاں خواتین کی تعلیم کی راہ ہموار ہوئی اور ایک بڑی تعداد میں خواتین نے اپنا تعلیمی سفر شروع کیا۔ان خواتین نے سماجی مسائل کی عکاسی کے ساتھ ساتھ معاشرتی مسائل پر بھی بے دریغ لکھا۔ان خواتین نے عورتوں کی تعلیم کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو ہٹانے کے ساتھ اس سماجی مسئلے کو بھی پیش کیا جو اس راہ میں رکاوٹ تھا۔ ان خواتین نے محض عورتوں کی تعلیم کی راہیں ہموار نہیں کیں بل کہ انھیں تہذیب بھی سکھائی کہ ایک روایتی معاشرے میں کس طرح رہا جاتا ہے۔اور ایک روایتی گھرانے کے کیا کیا اصول وضوابط ہوتے ہیں۔اس پر ام کلثوم نے معاشرتی تقاضوں کے مطابق عورتوں کو ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا اور بحیثیت ماں ان کی اہمیت کو اجاگر کر نے کی کوشش کی اس کی ایک مثال ان کے مضمون "قصوروار کون "[۳۱]میں ملتی ہے۔اسی فکر کے تسلسل میں ان کا یک اور مضمون "عورت اپنی نظر میں "[۳۲]ہے۔

٦۔امۃالحمید خانم:

امۃالحمید خانم نے اپنی توجہ محض تعلیم اور اصلاحِ نسواں تک محدود نہ رکھی بل کہ عورت اور مرد کو سماج کا برابر فرد سمجھتے ہوئے اس امر کی طرف خصوصی توجہ دلائی کہ مرد وزن دونوں کو سماجی، قومی اور ملی اصلاح وترقی کے لیے اپنا فرض نبھانا چاہیے۔ قومی وملی ترقی کے لیے انھوں نے مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کے دوش بدوش مل کر کام کرنے کی تلقین کی۔ان کے مضمون "پیغام عمل مسلم خواتین"[۳۳]میں اس نظریے کی عکاسی ان الفاظ میں کی گئی نسواں تھا۔انھوں نے مرد عورت کے مساوی حقوق،شادی بیاہ کے معاملات میں عورت کے اختیارات،شادی کے بعد کی زندگی کے مسائل و معاملات،پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ان کے نزدیک عورت کو محض عورت ہونے کی وجہ سے اسے اس کے حقوق سے محروم کرنا جائز نہیں ہے۔انھوں نے روایات سے جڑے رہتے ہوئے جدید علوم وفنون کے حصول کی حمایت بھی کی۔"حسب پسند شادی"[۳۴]میں ان نظریات کی ایک جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔

امۃالحمید خانم نے اپنی تحریروں میں ہندوستانی معاشرے میں عورت کی حدبندیوں کا تذکرہ بھی کیا۔ ان کے مطابق ہندوستانی عورت ایک حبس مسلسل میں زندہ ہے وہ بے دست و پا مرد کی مرہون منت ہیں۔ ان کے مطابق خواتین کو چاہیے کہ وہ مرد پر لدے اس بوجھ کو کم کریں اور اپنے معاملات خود نبٹانے کی کوشش

کریں۔انھوں نے خواتین کو خود مختار ہونے کی تلقین کرتے ہوئے یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ خود مختاری اور حریت سے اپنے اندر ایک ایسے طاقت پیدا کرنے کی سعی کریں جو انھیں اپنے پاؤں پر کھڑا کر سکے۔اور اس خود مختاری کا اثر صرف عورت کی اپنی زندگی پر نہیں پڑے گا بل کہ آئندہ آنے والی نسلیں بھی اس سے فیض یاب ہوں گی۔انھوں نے اس ضمن میں یہ تلقین بھی کی کہ اپنے بیٹوں میں بھی اس خود غرضی کی بجائے ایثار کے جذبات پیدا کریں اور اپنی لڑکیوں کی تربیت بھی ایسی کریں کہ ان میں خود مختاری اور خود اعتمادی پیدا ہو سکے۔اس سے لڑکوں میں اس عام خود غرضی کا خاتمہ ہو سکے گا جس خود غرضی کا شکار ہندوستان کا تقریباً تمام ہندوستانی معاشرہ ہے۔اور وہ اپنے سے منسوب کسی بھی عورت کے حقوق کو سلب کرنے کی جرات نہیں کریں گے بل کہ ان کے حقوق کے تحفظ کی کوشش کریں گے۔اور لڑکیوں کی اس طور تربیت سے ان کی زندگی کسی دوسرے پر انحصار کرنے کی بجائے خود مختاری سے گزرے گی۔اس کے علاوہ مسلم خواتین کی تعلیم کے حوالے سے لکھے گئے مضامین میں "حریت نسواں"[۳۵]،"عورتوں کی تعلیم"[۳۶]،"مسلم گرلز اسکول علی گڑھ"[۳۷]اور "مسلم خواتین کی تعلیم اور آزادی"[۳۸]شامل ہیں۔

۷۔اہلیہ سید احمد سبز واری:

اہلیہ سید احمد سبز واری نے خواتین کی شخصیت اور حالت کو بہتر بنانے کے لیے مضامین تحریر کیے ان کی مخاطب زیادہ تر دیہی خواتین تھی اپنے مضامین میں انھوں نے دیہی خواتین کے معاملات اور حالات کو موضوع بنایا اور یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ عورت گھر گرہستی کے چکر میں الجھ کر اپنی ذات سے بالکل بے خبر ہو جاتی ہے۔ جس سے اس کے معاملاتِ زندگی متاثر ہوتے ہیں۔انھوں نے گھر گرہستی کے معاملات کی انجام دہی کی تاکید تو کی لیکن اس چکر میں خود اپنی ذات تک سے بے خبر ہو جانے کی شدید مذمت کی۔اس کی مثال ذیل کی سطور میں ملتی ہے:

> کاش یہ قابل قدر عورتیں زیور علم سے آراستہ ہوتیں۔پھر کیا تھا۔مگر نیم تعلیم یافتہ ہونے سے تو نہ ہونا اچھا ہے۔انہیں اپنے فرائض کا تو احساس ہے۔ان کی اس حالت کا نہ کوئی مذاق اڑانے والا ہے اور نہ کوئی انگشت نمائی کرنے والا۔[۳۹]

ان کے مضمون "خواتین ہند کی عام حالت"[۴۰]میں انھوں نے مغربی اور مشرقی معاشرتی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے یہاں کی پستی کی ایک وجہ مرد وزن کے برابر حقوق و فرائض کا نہ ہونا قرار دی ہے۔ان کے مطابق یہاں کی خواتین کو ان کے بنیادی حقوق سے یکسر محروم رکھا جاتا ہے،جب انھیں اپنے انسانی حقوق مکمل طور پر نہیں مل رہے ہوں تو وہ ملکی و قومی صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے کیا کر سکتی ہیں۔جب کہ مغرب میں عورت کی حالت مشرق سے کئی گنا بہتر ہے اور اسے اس کے بنیادی انسانی حقوق میسر ہیں اسی لیے وہ قوم مرد وزن کی باہمی لگن اور

محنت سے ترقی کی منازل طے کرتی جا رہی ہیں۔ ان کے مطابق جب تک معاشرتی طور پر مرد و زن برابر کی سطح پر کام نہ کریں تب تک کسی ملک کی صورت حال میں کوئی بہتری نہیں آسکتی۔ ازدواجی زندگی سے متعلق مسائل میں ایک مسئلہ ساس بہو کی باہمی ناچاقی بھی ہے۔ جو میاں بیوی کے رشتے پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اسی مسئلے کا اظہار اہلیہ سید احمد سبزواری کے مضمون "ساس بہو کے جھگڑے"[۴۱] میں ملتا ہے۔ جس میں انھوں نے اس فکر کا احاطہ کیا ہے کہ اگر ایک ساتھ رہنے میں دونوں عورتوں کے معاملات درست نہیں رہتے تو عورت کو الگ گھر دیا جائے تاکہ وہ اپنی آزادی کے ساتھ اپنی زندگی گزار سکے۔ اس مضمون میں وہ ساس بہو کے تعلقات کی خرابی کی ایک وجہ باہمی ہم آہنگی نہ ہونا بیان کرتی ہیں۔ ان کے مطابق اکثر ساسیں بہو سے یہ توقع رکھتی ہیں کہ وہ ان کے مطابق اپنی زندگی گزارے لیکن ہر انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنے معاملات پر کسی کو مسلط نہ ہونے دے۔ اور یہی تمام مسائل کی وجہ بنتی ہے اور رشتے کمزور پڑنا شروع ہو جاتے ہیں۔

انھوں نے روزمرہ زندگی کے معاملات بطریق احسن نبٹانے کے لیے عورت کی تعلیم کو بہت ضروری قرار دیا۔ ان کے نزدیک علم و ہنر سے انسان کی شخصیت اور فکر میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔ جس سے تمام اخلاق رزیلہ خود بخود زائل ہو جاتے ہیں اور انسان اخلاقی اعتبار سے مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے۔ عورت اگر تعلیم یافتہ ہو گی تو گھریلو معاملات کو بخوبی سر انجام دینے کے ساتھ ساتھ تربیت اطفال بھی اچھی کرے گی اور یوں معاشرہ ایسے افراد سے بھرپور ہو گا جو بہتر انسانی اوصاف اور اخلاقیات سے پر ہوں۔ اس فکر کا اظہار ان کے مضمون "علم کی ضرورت"[۴۲] میں کیا گیا ہے۔ انھوں نے تعلیم نسواں کے ساتھ ساتھ انھوں نے ان کی تربیت پر بھی زور دیا۔ اس ضمن میں روزمرہ معمولاتِ زندگی میں برتے جانے والے رویوں اور امورِ خانہ داری کے حوالے سے بھی مستورات میں آگہی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کے مضمون "اپنے گھر کی اصلاح"[۴۳] میں اس حوالے عورتوں کی تربیت کی کوشش کی گئی ہے۔ اور روزمرہ معاملات میں سلیقہ شعاری سے امور کی انجام دہی کی تلقین کی۔

اہلیہ سید احمد سبزواری کے ہاں زیادہ تر مضامین سماجی اصلاح کے حوالے سے لکھے ملتے ہیں۔ انھوں نے سماجی روبط کی طرف زیادہ توجہ صرف کی۔ "صاف بیانی"[۴۴] میں انھوں نے عورتوں کو سماجی اعتبار سے مضبوط بنانے کی کوشش کی ہے اور فرسودہ خیالات کو ترک کرتے ہوئے سماجی ہم آہنگی کا درس دیا ہے جس میں صاف گوئی کو اہمیت دی گئی ہے۔

۸۔ اہلیہ محمد علی خاں منصوری:

نو آبادیاتی ہندوستان میں خواتین کی جدید تعلیمی ترقی سے پہلے عورت کی ذات سے گھر گرہستی، اولاد اور

شوہر کے حقوق منسوب کیے جاتے تھے۔ بعض اوقات ان پر اس قدر سختی سے عمل درآمد کیا جاتا تھا کہ عورت کی ذات مجروح ہو کر رہ جاتی تھی اور رد عمل کے طور پر مزاج میں اکھڑ اپن اور بد دلی آجاتی۔ اس مسئلے کے حل کے لیے تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے عملی خدمات سر انجام دیں۔ انھوں نے عورت کی تربیت ان خطوط پر کرنے کی کوشش کہ ان کا شخصی وقار بھی مجروح نہ ہونے پائے اور گرہستی کا نظام بھی متاثر نہ ہو۔ اہلیہ محمد علی خاں نے بھی اسی طرز پر اپنے افکار کی ترسیل اپنے ایک مضمون "مرد کی عزت عورت کے ہاتھ ہے "۵" میں کی۔ اس مضمون میں انھوں نے مرد و عورت دونوں کو برابر قرار دیتے ہوئے یہ باور کروایا کہ ملک و قوم اور سماج کی ترقی میں ان دونوں صنفوں کی ایک برابر اہمیت ہے جس طرح کسی گاڑی کو چلانے کے لیے تمام پہیے ایک سی اہمیت رکھتے ہیں اسی طرح مرد اور عورت کے باہمی تعاون کے بنا سماج کی گاڑی بھی درست سمت نہیں جا سکتی۔ اس لیے دونوں کو چاہیے کہ وہ اپنے فرائض کی انجام دہی اچھے طریقے سے کرتے ہوئے اپنا کردار نبھائیں۔ مرد عورت دونوں کو ایک دوسرے کا خیال کرتے ہوئے حسن اخلاق سے اپنے فرائض سر انجام دینے چاہیں۔

اپنے مضمون" ہماری ذمہ داری"۶" میں بھی انھوں نے ازدواجی زندگی سے متعلق معاملات اور تربیت اطفال کے حوالے سے اپنے خیالات کی عکاسی کی ہے۔

۹۔ ایس۔ اے کرمانیہ:

انھوں نے خواتین کو اس امر پر بھی متوجہ کیا کہ وہ اپنے لیے ترقی کی راہیں خود متعین کریں۔ اپنے موجودہ حالات پر اکتفانہ کریں بل کہ خوب سے خوب تر کی جستجو جاری رکھیں۔ دنیاوی عزت و مرتبے کا ذریعہ بھی یہی ہے کہ حالات پر قناعت نہ کی جائے بل کہ کوشش سے اپنے حال کو مزید بہتر بنایا جائے۔ اپنے مضمون "تکمیل "۷" میں انھوں نے اسی فکر کی پیش کش کی ہے۔ وہ ہندوستانی قوم کو دنیا کی دیگر اقوام کی مثال دے کر یہ واضح کرنا چاہتی ہیں کہ ،دوسری تمام قومیں خوب سے خوب تر کی تلاش میں مگن رہتی ہیں اسی لیے ان کی ترقی کا گراف بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ان اقوام نے خود کو کامل نہیں جانا اسی لیے وہ بہت سے معاملات میں ہندوستانیوں سے آگے ہیں۔

اپنے مضمون "اخلاقی اصلاح"۸" میں انھوں نے انسان کی اخلاقیات کے حوالے سے خیالات پیش کیے۔ ان کے مطابق انسان کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کے اخلاق و اطوار بھی خاص اہمیت کے حامل ہیں لیکن افسوس اس بات کا کہ دنیاوی تعلیم کی طرف تو سب ہی متوجہ ہیں لیکن اخلاقیات کی درستی کا خیال کسی کو نہیں ہے۔ حالاں کہ تعلیم سے زیادہ ضروری اخلاقیات ہیں، اسی سے کسی انسان کی اعلیٰ اقدار اور صفات کا تعین ہوتا ہے اور یہی اسلامی تعلیمات کی اصل روح ہیں۔ جس سے قوم کا وقار مجروح ہو گیا ہے۔ ان کے مطابق ہندوستانی قوم اخلاقی اعتبار سے

پستی کا شکار ہو چلی ہے اور ان میں نیکی، محبت، رواداری، صداقت اور خدا ترسی جیسے اوصاف شاذ ہی نظر آتے ہیں۔ ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی اسلامی تعلیمات کو مد نظر رکھتے ان تمام اوصاف کو اپنائیں تا کہ دنیاو آخرت کی کامیابی حاصل کر سکیں۔ ان کا مضمون "صاف گوئی"[۴۹] بھی اسی فکر کا احاطہ کر تا ہے۔

۱۰۔ایس آر کرمانیہ:

ایس آر کرمانیہ نے اسلامی شعار زندگی کو مد نظر رکھتے ہوئے ہندوستانی معاشرے کا جائزہ لیا۔ انھوں نے اسلام کے وضع کردہ اصولوں کے تحت زندگی گزارنے کی اہمیت بیان کی۔ اپنے مضامین میں شادی بیاہ کی رسومات، مرد اور عورت کے باہمی تعلقات اور معاملات، حقوق و فرائض اور روزمرہ معمولاتِ زندگی میں اسلامی اصولوں کی پاسداری کی ضرورت اور اہمیت کو واضح کیا۔ ان نظریات کی عکاسی ان کے مضمون "ازدواج"[۵۰] میں کی گئی ہے۔ انھوں نے انسان کے بنیادی حقوق و فرائض کو فرمانِ باری تعالیٰ اور فرمانِ رسول اللہ سے استدلال سے واضح کرنے کی سعی کی۔

ایس آر کرمانیہ نے ملکی ترقی میں عورت کے کردار کے حوالے سے بھی اپنے افکار کی ترسیل کی۔ انھوں نے ہندوستانی معاشرے میں عورت کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک اور اس کی خانگی ذمہ داریوں کی تحدید کے حوالے سے یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ عورت کا مقصد حیات محض گھر گرہستی سنبھالنا نہیں ہے، بل کہ وہ مستقبل کے معماروں کی تربیت بھی کرتی ہے۔ اگر اس کی اپنی زندگی اتنی قیود میں گزرے گی اور اسے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کا موقع نہیں دیا جائے گا تو آئندہ نسل کی تربیت کی بنیاد ہی کمزور پڑ جائے گی۔ نا صرف یہ کہ وہ مستقبل کے ہونہاروں کی نشوونما کی ذمہ دار ہے بل کہ وہ خود بھی قومی و ملکی معاملات و مسائل کو سمجھنے اور ان کے حل کے لیے کوشش کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ دنیا کی کوئی بھی قوم محض مردوں کی کوششوں سے ترقی نہیں پاتی۔ مرد و زن دونوں مل کر ترقی کا راہ پر گامزن ہو جائیں تو مستقبل زیادہ روشن ہو سکتا ہے۔ قومی و ملی ترقی کے لیے انھوں نے عورتوں کو بھی مردوں کے دوش بدوش اپنی صلاحیتوں کے اظہار کی تائید کی۔ اس فکر کا اظہار ان کے مضمون "قومی ترقی اور عورتیں"[۵۱] میں ملتا ہے۔

انھوں نے بچوں کی بہتر تربیت و نگہداشت کے حوالے سے بھی خواتین کو آگاہ کیا۔ ان کے مطابق بچوں کی صلاحیت کو بہتر بنانے کے لیے قبل از پیدائش اور اس کے بعد بھی اس کی مناسب تربیت کی جانی بہت ضروری ہے اگر ایسا نہ کیا جائے تو اس کے شعور میں ترقی نہیں ہو سکے اور وہ معاشرے کا ایک کارآمد فرد کبھی نہیں بن سکے گا۔ انھوں نے مختلف حکایات اور قصص کے ذریعے بچپن میں کی گئی تربیت کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی سعی کی۔ اور یہ

باور کروایا کہ اگر اس دوران کسی قسم کا کوئی خلا یا کمی رہ جائے تو تمام عمر کی کوشش سے اسے پُر نہیں کیا جاسکتا۔ اس حوالے سے ان کا مضمون "بچوں کی نگہداشت"[52] خاص اہمیت کا حامل ہے۔

۱۱۔ایس۔ آر۔کے:

ایس۔ آر۔ کے نے ہندوستانی صورت حال کو مد نظر رکھتے ہوئے خواتین کو ان کے بنیادی حقوق سے متعارف کروایا۔ جن میں وہ تمام انسانی حقوق شامل ہیں جو عورت کو ازل سے دیے گئے ہیں۔ اور جنھیں ہندوستانی معاشرے میں غصب کیا گیا ہے۔ جس میں تعلیم، آزادی اظہار اور اپنی زندگی اپنی من مرضی سے گزارنے کے اختیارات شامل ہیں۔ انھوں نے نا صرف خواتین کو ان کے حقوق سے متعارف کیا بل کہ ان کے حصول کی کوشش کے لیے متحرک بھی کیا۔ کیوں کہ اگر انسان خود کوشش نہ کرے تو اس کی بہتری کی کوشش کوئی اور نہیں کر سکتا۔

انھوں نے خواتین کی تعلیم و تربیت کی اہمیت اجاگر کرنے کے لیے بھی متعدد مضامین لکھے۔ جن میں رسمی تعلیم کے ساتھ ساتھ امور خانہ داری اور روزمرہ زندگی سے متعلق بھی شعور و آگہی کی کوششیں کی گئیں۔ ان کے مضمون "حسن سلیقہ"[53] میں گھر گرہستی کے نظام کو اچھے طریقے سے نبھانے کے لیے خواتین کی تربیت کی گئی۔

اپنے مضمون "ازدواج"[54] میں وہ رشتہ ازدواج سے متعلق مرد و زن کے حقوق اور فرائض سے آگاہ کرتی ہیں۔ ان کے مطابق خوشگوار ازدواجی زندگی کا تمام تر انحصار میاں بیوی کی باہمی محبت پر ہے۔ اگر یہ دونوں ایک دوسرے کے حقوق و فرائض کو اسلامی طرز پر پورا کریں گے تو زندگی اچھی گزرے گی۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو رنجشیں اور بدگمانیاں بڑھتی جائیں گی۔ انھوں نے اپنے مضمون "اسلام اور عورتیں"[55] میں ہندوستانی مسلمان خواتین کو اسلامی طرز معاشرت کے مطابق زندگی گزارنے کی تلقین کی۔

۱۲۔ایم۔جے بیگم:

ایم جے بیگم نے ہندوستانی رسوم و رواج کے حوالے سے اپنے نظریات قلم بند کرتے ہوئے صغر سنی کی منگنیوں اور شادی کے نقصانات کے حوالے سے بات کی۔ انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ان رسومات کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے بل کہ یہ سراسر شریعت کے خلاف ہیں۔ شریعت میں شادی کے لیے لڑکی اور لڑکے کی بلوغت شرط ہے۔ جب کہ بچپن میں کی گئی رسمیں اس کے خلاف جاتی ہیں۔ انھوں نے ان رسوم کے نقصانات بیان کرتے ہوئے لڑکے اور لڑکی کی آئندہ زندگی کے حوالے سے مسائل کا ذکر بھی کیا کہ بچپن کی منگنیاں اکثر و بیشتر والدین کے غلط فیصلوں کی وجہ سے عدم مفاہمت اور ذہنی ہم آہنگی کے فقدان کا باعث بنتی ہیں جن کے اثرات گھریلو ناچاقی کی صورت میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ اور یوں خاندانی ناراضگیاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔

۱۳۔ آذری بیگم:

نو آبادیاتی ہندوستان میں تعدد ازدواج ایک اہم مسئلہ تھا۔ مرد استطاعت نہ رکھنے کے باوجود محض فیشن کے طور پر دو دو، تین تین شادیاں کر لیا کرتے تھے۔ آذری بیگم نے اسی مسئلے کو اپنے مضامین میں بیان کیا ہے۔ ان کے مطابق مرد استطاعت نہ رکھنے کے باوجود محض سماجی روایات کی پاسداری کے تحت ایک سے زائد شادیاں کر لیتے ہیں۔ وہ اس منفی سوچ پر تنقید کرتی نظر آتی ہیں کہ محض روایات کی پاسداری میں شادیاں کر لینا سراسر معاشرے کا نقصان ہے کیوں کہ ان شادیوں سے ہونے والی اولادیں والدین کی عدم توجہ اور محدود وسائل سے ہونے والے مسائل کی وجہ سے کبھی بھی سماج کا کار گر فرد نہیں بن سکتی۔ ان کا سماج کی اصلاح اور تشکیل میں کوئی کردار نہیں ہوتا بل کہ وہ ایک بوجھ کی مانند اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے مضمون "کثرت ازدواج"[56] میں اس موضوع پر تفصیل ملتی ہے۔

۱۴۔ آصف جہاں بیگم:

وحیدہ بیگم کے انتقال کے بعد مولوی ممتاز علی کی بہو آصف جہاں بیگم نے ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۵ء تک تہذیب نسواں کی ادارت کے فرائض بسر انجام دیے۔ آصف جہاں بیگم تہذیب نسواں کی نمایاں لکھنے والی خواتین میں شمار کی جاتی ہیں۔ انھوں نے خواتین میں شعور بیدار کرنے کے لیے متعدد مضامین لکھے۔ جن میں خواتین کو مذہب اور معاشرے کے حوالے سے معلومات کی فراہمی کے ذریعے تعلیم دی گئی۔ انھوں نے ہندوستانی سامراج، معاشرتی مسائل اور مذہبی معاملات جیسے موضوعات پر اپنے نظریات کی عکاسی کی۔ ان کی تحریروں میں ان کا عصری شعور جھلکتا ہے۔ اس ضمن میں "بچوں کی پرورش"[57]، "چھوٹے بچوں کے جلدی امراض"[58]، "بچوں کی باتیں"[59] اور "ہماری معاشی زندگی کی خامیاں"[60] قابل ذکر ہیں۔

۱۵۔ آصفہ خاتون:

آصفہ خاتون نے اپنے مضامین میں پدر سری معاشرے کے خلاف ایک نحیف سی آواز اٹھانے کی سعی کی۔ انھوں نے خواتین کو ان کے حقوق کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کی ترغیب دی اور یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ جب انسان کا بنیادی حق ہے کہ اسے آزادی سے زندگی بسر کرنے دی جائے تو عورت سے ہمیشہ یہ حق کیوں چھین لیا جاتا ہے؟ خاص طور پر تعلیم کا حق جو عورت میں اتنا شعور پیدا کر دیتی ہے کہ اسے اپنی ذات کا شعور ہو سکے، اس پر کیے جانے والے جبر و زیادتیوں سے آگہی مل سکے تو کیوں معاشرہ اسے تعلیم کے حصول سے روکنے کے لیے طرح طرح کے ہر ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے؟ اپنے ایک مضمون "تعلیم کیوں چھوڑیں" میں انھوں نے اس کا برملا اظہار

کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"۔۔۔عدم تعاون کے سلسلے میں تعلیم نہیں چھوڑنی چاہیے۔ سچ پوچھو۔ تو اتنی عقل ہم میں تعلیم سے ہی آئی ہے۔ کہ ہمیں اپنی قید کا احساس ہوا۔ اگر تعلیم نہ ہوتی تو وہی حالت رہتی۔ اور غلامی کی زنجیریں پڑی رہتیں۔۔۔۔"[۶۱]

انھوں نے خواتین کی سماجی مصروفیت کی اہمیت کو بھی سراہا اور میل ملاپ کے انسان کی طبیعت اور مزاج پر مثبت اثرات کی بھی تائید کی۔ ان کے مضمون "ملنا جلنا"[۶۲] میں اس سے متعلق معلومات ملتی ہیں۔ انھوں نے مشرقی معاشرے میں موجود توہم پرستی کے خاتمے کے لیے بھی کوشش کی۔ اسی طرح ہندوستانی معاشرے میں پائی جانے والی توہم پرستی کی عکاسی ان کے مضمون "منگل کا دن"[۶۳] میں کی گئی ہے۔

۱۷۔ آنسہ تنویر فاطمہ:

تعلیم نسواں کی راہ ہموار کرنے کے بعد ایک اہم مرحلہ تربیت نسواں تھا۔ تربیت نسواں سے مراد ایسی تربیت تھی کہ خواتین روزمرہ معاملاتِ زندگی، رسوم و رواج، آدابِ محفل، آدابِ نشست و برخاست اور لباس کے انتخاب کے حوالے سے وقتی تقاضوں سے ہم آہنگ ہو جائیں۔ نا صرف آداب مجلس اور دیگر آداب بل کہ ان خواتین کے شخصی رویوں میں بہتری کے لیے بھی اقدامات کیے گئے۔ آنسہ تنویر فاطمہ نے سماجی تربیت کے حوالے سے متعدد مضامین قلم بند کیے جن میں خواتین کو میل ملاپ کے انداز بتانے اور ان کے شخصی رویوں کی درستی سماجی ڈھانچے کے مطابق کرنے کی کوشش کی گئی۔

اپنے مضمون "اعتراض کرنا"[۶۴] میں وہ خواتین کے اس ناروا شخصی رویے پر تنقید کرتی نظر آتی ہیں جو وہ بلا وجہ کی تنقید سے دوسروں کی زندگی کو دوبھر کر دیتی ہیں۔ اس میں انھوں نے انسان کی بنیادی آزادی کو موضوع بنایا ہے اور یہ باور کروانے کی کوشش کی ہے کہ انسان کو اگر رب باری تعالیٰ نے آزاد پیدا کیا ہے تو ہم کیوں اسے ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں اور اسے اس کی مرضی سے آزادانہ زندگی بسر نہیں کرنے دیتے۔ اسی طرح کے نظریات ان کے مضمون "ناراض ہونا"[۶۵] میں پیش کیے گئے ہیں۔

آنسہ تنویر فاطمہ نے ہندوستانی معاشرے میں پائی جانے والی روایت پسندی پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ انھوں نے رسوم و رواج کے چکر میں الجھے ہوئے اذہان کو منور کرنے کے لیے تعلیم کی اہمیت بھی اجاگر کی اور یہ تنبیہ کی کہ فرسودہ رسومات محض انسان کی وقتی مسرت کا باعث بنتی ہیں۔ اس لیے ضروری ہے وقتی شان و شکوہ کے پیچھے روپے کو برباد نہ کیا جائے بل کہ اس کا بہتر استعمال تعلیمی سرگرمیوں پر کیا جائے تاکہ آئندہ آنے والی نسلوں کی فکری آبیاری بھی ممکن ہو۔ اس حوالے سے ان کا مضمون "رسموں پر فضول خرچی"[۶۶] اہم ہے۔ "بیاہ شادی میں غفلت"[۶۷] میں بھی

سماجی مسائل کی عکاسی ملتی ہے۔

۱۷۔ آنسہ نور النسا بیگم:

آنسہ نور النسا بیگم نے عورتوں کے حقوق و فرائض کے حوالے سے بات کرتے ہوئے تعلیم کو بہت ضروری قرار دیا۔ انھوں نے ایسے لوگوں پر اعتراض کیا ہے جو عورتوں کو حصول تعلیم سے روکتے ہیں اور اس حوالے سے اعتراض کرنا اپنا فرض اولیں سمجھتے ہیں۔ انھوں نے ارشاد باری تعالیٰ اور ارشاد نبوی کے مطابق خواتین کی تعلیمی ضروریات اور اہمیت کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا اظہار ان کے مضمون "تعلیم نسواں"[۶۸] میں ہوتا ہے۔

۱۸۔ ب۔ ج:

ب۔ج اپنے دور کے معاشرتی مسائل و معاملات کے حوالے بہتر شعور رکھتی تھیں۔ انھوں نے اپنے مضامین میں اس کا اظہار بھی کیا۔ انھوں نے ہندوستانی معاشرتی نظام اور اسلامی روایات و احکامات کے حوالے سے اپنے نظریات قلم بند کیے اور اسلامی تعلیمات کی فراموشی پر غم و غصہ کا اظہار بھی کیا۔ انھوں نے "ہماری مفلسی کی وجہ"[۶۹] میں ہندوستانی معاشرے میں عورتوں کے حقوق کی پامالی کی سخت مذمت کی۔ اس ضمن میں انھوں نے نکاح، طلاق اور فسخ نکاح جیسے معاملات پر حقوق نسواں کی وضاحت اسلامی تعلیمات کے پیش نظر کی ہے اور شریعت کے مطابق خواتین کو یہ باور کروایا گیا کہ ازدواجی زندگی سے متعلق معاملات میں اگر کوئی مسئلہ آرہا ہو تو عورت یہ اختیار رکھتی ہے کہ وہ رشتے سے کنارہ کشی اختیار کرلے۔

انھوں نے خواتین کی مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید تعلیمی ضروریات کو بھی واضح کیا۔ ان کے مطابق شخصیت کی تعمیر کے لیے محض قرآن پڑھ لینا کافی نہیں ہے بل کہ اسے سمجھ کر اس کے اصول و ضوابط پر عمل بھی ضروری ہے۔ ب۔خ۔ن کے مطابق مذہب جہاں انسان کی شخصیت کی تعمیر کرتا ہے وہیں جدید تعلیم جدید رجحانات سے متعارف کرواتی اور انسان کو وقتی تقاضوں کے مطابق زندگی گزارنے کے قابل بناتی ہے۔ یوں کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اسلامی یا دینی تعلیم انسان کی اخلاقی تربیت کرتی ہے تو جدید نظام تعلیم اسے معاشرتی تقاضوں سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ ان نظریات کی عکاسی ان کے مضمون "مسجدوں کی تعلیم"[۷۰] میں ملتی ہے۔ اسی فکر کے حوالے سے مزید معلومات ان کے مضمون "تبادلہ خیال"[۷۱] میں ملتی ہیں۔ جہاں انھوں نے تبادلہ خیال کے ذریعے معلومات تک رسائی کی اہمیت بیان کی ہے۔ ان کے مطابق کتابی علم محض انسان کی معلومات میں اضافے کا باعث بنتا ہے لیکن پر عمل کے مواقع باہمی تبادلہ خیال اور ربط سے میسر آتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ خواتین کی روشن خیالی کے لیے تبادلہ خیال کے مواقع پیدا کیے جائیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے لڑکوں کے لیے سرسید کے کیے گئے اقدامات اور اس کے

مؤثر نتائج بھی بیان کیے، اسی بنیاد پر خواتین کے لیے بھی ایسے زنانہ کلب اور سوسائٹیز کے قیام کی تجویز بھی پیش کی تا کہ ان میں بھی شعور و بیداری پیدا کی جا سکے۔

۱۹۔ بیگم یار محمد خاں:

بیگم یار محمد خاں نے ضرورتِ تعلیم نسواں محسوس کرتے ہوئے ہندوستانی معاشرے میں ایسے مدارس کے قیام کے عمل میں لانے کی تجویز پیش کی۔ ان کے مطابق اب محض تعلیم، نسواں کا شور و غوغہ کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ اس میدان میں ترقی کرنے کے لیے روشن خیال اور باشعور طبقے کو خود آگے بڑھ کر طبقہ اناث کی مدد کرنی ہو گی[۴۲] اپنے ایک مضمون "ہماری تعلیمی پستی کا واحد سبب" میں انھوں نے ہندوستانی مستورات کی کم فہمی اور کم علمی کی وجہ تعلیم کے مناسب اقدامات نہ ہونا بیان کیے ہیں۔ اس مضمون میں انھوں نے ہندوستانی خواتین کا موازنہ عالمی سطح پر دیگر ممالک سے کرتے ہوئے یہ بیان کیا ہے کہ دیگر ممالک کی مسلمان خواتین کو سماجی سطح پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے اسی لیے وہ ہر شعبہ عمل میں اپنی صلاحیتوں کا اظہار کر کے اپنی اہمیت کو منوا رہی ہیں جب کہ ہندوستانی عورت پردے کی تہہ میں لپیٹ کر چار دیواری میں ایسے بٹھائی گئی ہے جسے گھر کے باہر کی ہوا بھی نہیں چھو کر گزر سکتی۔ ہندوستان میں تو عورت اس قدر حبس بے جا میں رکھی گئی ہے کہ اس کے نام کا کسی غیر محرم کی سماعت اور تحریر کا کسی غیر محرم کی نظر اور سماعت سے گزرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ نا صرف عورت کی ذات کو بل کہ اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو بھی محدود کیا جاتا ہے۔ اگر کسی عورت نے جرات کر کے کسی اسکول میں داخلہ لے بھی لیا تو شرفا اسے اپنی تحقیر سمجھتے تھے۔ اس ضمن میں بیگم یار محمد نے اپنی نانی کی والدہ کا واقعہ ان کی زبانی یوں درج کیا ہے:

> ـــــ ان کا اسکول میں داخل ہونا تھا کہ چاروں طرف سے مخالفت کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ اس کی مطلق پروانہ کی گئی۔ آخر کار ایک بااقتدار رشتہ دار نے گھر کے اس شخص سے جو سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ یوں التجا کی۔ "بہتر ہے آپ اپنی لڑکی کو اسکول نہ بھیجیں۔ میں جب کچہری جاتا ہوں تو مجھے یہ دیکھ کر بہت شرم آتی ہے کہ میرے ہمراہ دوسرا تانگہ میری بہن کا جا رہا ہے" چنانچہ مجبوراً میری والدہ نے اسکول جانا بند کر دیا۔ اور گھر پر انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔[۴۳]

مندرجہ بالا واقعے کے بیان کے ذریعے انھوں نے ہندوستانی مرد کی اس عام ذہنیت سے پردہ اٹھایا ہے جو خواتین کا گھر سے نکلنا اپنے لیے ہتکِ عزت سمجھتے ہیں اور اپنی نام نہاد عزت بچانے کی خاطر خواتین کو ان کے تعلیمی حق سے محروم رکھا جاتا تھا۔ اس مضمون میں انھوں نے ہندوستانی خواتین کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ غیر شرعی نظام پردہ کا نفاذ بتایا ہے۔

بیگم یار محمد خاں نے اپنے مضامین میں نو آبادیاتی ہندوستان میں موجود مسائل و مباحث کا احاطہ کیا۔ انھوں نے مغرب کی بے جا تقلید اور اس سے وابستہ مسائل کو اپنے مضامین میں بیان کیا۔ ان کے نزدیک ہر قوم کی بقا اس کے اپنے رسوم و رواج، کلچر اور تہذیب کے اپنانے اور برتنے سے ہوتی ہے اگر دوسری تہذیب کی ہر شے کو من و عن قبول کر لیا جائے تو اپنا تشخص برقرار رکھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ انھوں نے مغربی تہذیب کے روشن اور اچھے پہلوؤں کو اپنانے اور غیر ضروری معاملات میں الجھنے سے گریز کی سفارش کی۔ اس مسئلے کا بیان ان کے مضمون "بیجا انگریزی تقلید "[۴۴] میں کیا گیا ہے۔ انھوں نے ہندوستانی عورتوں کے طرز بود و باش اور اس سے متعلق مسائل کا تذکرہ بھی کیا۔ انھوں نے ہندوستانی عورت کو اپنا معیار زندگی بہتر بنانے کی تلقین کی اور جدید وقتی تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کی تحریک بھی دی۔ اپنے مضمون "سی پی کی عورت "[۴۵] میں وہ مقامی خواتین کے رہن سہن اور اس سے متعلق عام خرابیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے انھیں بہتر کرنے کی تلقین کرتی ہیں۔ اس مضمون میں انھوں نے سی پی کی عورت کا تقابل دیگر علاقائی خواتین سے کیا ہے اور ان کی مشقت پسند طبیعت کو سراہا ہے۔ ان کے مطابق یہاں کی خواتین اتنی بلند حوصلہ ہیں کہ بعض اوقات مردوں سے زیادہ کام کرتی ہیں لیکن اپنی ذات کی بہتری کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتیں جس سے ان کی شخصیت دبی رہتی ہے۔ تربیتِ اطفال سے متعلق ان کے افکار کا اظہار "تربیتِ اطفال"[۴۶] میں ملتا ہے۔

۲۰۔ برجیس دلھن:

انھوں نے زیادہ تر تربیت اطفال کے موضوع پر قلم اٹھایا۔ اور اپنے مضامین میں قدیم خیالات رکھنے والی خواتین کو بھی ہدف تنقید بنایا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے مضامین "تربیت اولاد پر تبصرہ اور اصول تربیت پر عمل "[۴۷] میں ان نظریات پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ برجیس دلھن نے سیاسی معاملات میں بھی عورتوں کی شرکت کو ضروری سمجھا اور اس حوالے سے ہونے والی کانفرنسوں اور اجلاس میں عورتوں کی شرکت کی حمایت بھی کی۔ "گول میز کانفرنس میں طبقہ نسواں کی نیابت "[۴۸] میں اس سے متعلق معلومات ملتی ہیں۔

اس دور میں خواتین ہند کے لیے کیے گئے اقدامات اور اس سے متعلق معاملات روداد کی شکل میں بیان کیے جس سے دور میں تحریک تعلیم نسواں کے مراحل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ "مسلم لیڈیز کانفرنس آگرہ "[۴۹] میں بھی ایسے ہی ایک اجلاس کی روداد بیان کی گئی جس میں خواتین کے مسائل اور اور اس سے متعلق سفارشات کو پیش کیا گیا ہے۔

۲۱۔ ب زب، بنت ڈاکٹر ولی محمد:

ب زب صاحبہ نے ہندوستانی سماجی نظام کو مد نظر رکھتے ہوئے خواتین کی تعلیم کی اہمیت پر زور دیا ہے، ان کے خیال میں پردہ ہی خواتین کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اور شاید پردے کو ڈھال بناتے ہوئے ہی عورت کی تعلیمی ترقی کو روکا جارہا ہے۔ کیوں کہ گھر بیٹھے بھی خواتین زیور تعلیم سے آراستہ ہو سکتی ہیں۔ انھوں نے اس دور کے مرد معاشرے پر تنقید بھی کی ہے جو خواتین کو تعلیم محض اس ڈر سے نہیں حاصل کرنے دیتے تھے کہ وہ خراب یا بدزبان ہو جائیں گی۔ انھوں نے مرد اور عورت کا موازنہ بھی کیا ہے کہ وہی علم جب مرد حاصل کرتا ہے تو خراب نہیں ہوتا جب کہ عورت کے حوالے سے یہ پابندی بھی عائد کر دی جاتی ہے۔ ان مسائل کا برملا اظہار ان کے مضمون "تعلیم نسواں"[۸۰] میں ملتا ہے۔

۲۲۔ بلقیس بانو:

بلقیس بانو نے اپنے مضامین میں عورت کے ان حقوق کے بارے میں آگہی دینے کی کوشش کی ہے جو عورت کو اسلام اور شرع میں تفویض کیے گئے ہیں۔ انھوں نے ہندوستانی معاشرے میں موجود اس عام رجحان کی مخالفت کی ہے جس میں عورتوں کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم رکھنا فخر کا باعث سمجھا جاتا تھا۔ عورتوں کو اول تو اپنے حقوق کے بارے میں علم نہ تھا اور جنھیں علم تھا ان میں اتنی جرات نہ تھی کہ وہ اپنے جائز حقوق کے حصول کے لیے کوئی عملی قدم اٹھا سکیں۔

بلقیس بانو نے عورت کی سماجی زندگی کے حوالے سے اپنے مضمون "لڑکیوں کا سینما دیکھنا"[۸۱] میں یہ باور کروانے کی کوشش کی ہے کہ عورت پر سینما دیکھنا منع نہیں ہے۔ لیکن اس کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ فلم اخلاقیات سے عاری نہ ہو اور اس میں تربیتی پہلو پوشیدہ ہو۔ اس سے ان کی معلومات میں اضافہ ہوگا اور وہ دیگر خواتین سے میل ملاپ کے بعد دنیاوی معاملات کو سمجھنے کے قابل ہو سکیں گی۔

۲۳۔ بنت شیخ فضل الٰہی:

بنت شیخ فضل الٰہی نے اپنے مضامین کے ذریعے خواتین کی روز مرہ بول چال اور اخلاق و عادات کو بہتر بنانے کی سعی کی ان کے سلسلہ وار مضامین تہذیب نسواں کی قارئین کے لیے روز مرہ زندگی کو بہتر بنانے کے لیے معاون ثابت ہوئے۔ انھوں نے اس امر کی طرف توجہ دلانا چاہی کہ انسان کے اخلاق و عادات سے اس کی شخصیت کا وقار اور رعب اس کی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے اس لیے محض حصول تعلیم ہی ضروری نہیں ہے بل کہ علم با عمل ہو تو اس کی تاثیر زیادہ ہوتی ہے۔ ایک عورت اگر جدید تعلیم سے مستفید ہو بھی جائے لیکن اس کے اخلاق و

عادات اور گفت وشنید میں اگر اس کا اثر نہیں جھلکتا تو وہ تعلیم نہیں بل کہ وقت کا زیاں ہے۔ [۸۲]

۲۴۔بی۔ بے بیگم:

ہندوستان میں یہ رواج عام تھا کہ عورت کو چار دیواری میں مقید رکھا جاتا تھا۔ نا صرف یہ بل کہ ان کے نام تک کا پردہ ضروری تھا اس کی مثال مصنفہ کے اپنے نام سے ظاہر ہے۔ انھوں نے اس رسم پردہ کو عورت کے فکری ارتقا کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ سمجھا اور سماجی سرگرمیوں کی اہمیت کو سراہا۔ ان کے نزدیک انسان ایک مقام پر مقید رہتے ہوئے شعور کی منزلیں سر نہیں کر سکتا۔ انھوں خواتین کو چار دیواری سے نکال کر سماجی سرگرمیوں میں شرکت کرنے کے فوائد اپنے مضمون "آگرہ میں زنانہ پردہ کلب کی ضرورت" [۸۳] میں درج کیے۔

۲۵۔ بیگم اشفاق حسین:

بیگم اشفاق حسین نے اپنے مضامین میں تعلیم نسواں کی حمایت کی۔ انھوں نے ملک و قوم کی ترقی کے لیے تعلیم نسواں کو ناگزیر قرار دیا۔ ان کے نزدیک خواتین کی تعلیم نا ہونے کی وجہ سے معاشرہ عدم توازن کا شکار ہو جاتا ہے۔ بچے کی تربیت کے ابتدائی چند سال گھر میں ماں کے زیر اثر تکمیل پاتے ہیں اور اگر ماں خود شعور و آگہی نہیں رکھتی ہو گی تو بچے کی مناسب نشوونما اور تربیت نہیں کر پائے گی۔ اس لیے ضروری ہے کہ خواتین کو بھی زیور تعلیم سے آراستہ کیا جائے تا کہ معاشرہ عدم توازن کا شکار نہ ہونے پائے۔ ان افکار کی ترسیل ان کے مضمون "مسلم گرلز سکول مراد آباد" [۸۴] میں ملتی ہے۔

۲۶۔ بیگم آباد احمد خاں:

انھوں نے عورتوں کی اقتصادی آزادی کے حوالے سے اپنے نظریات کی پیشکش اپنے مضمون "اقتصادی آزادی" میں پیش کیے۔ انھوں نے ہندوستانی معاشرے کے اصول وضوابط کو مد نظر رکھتے ہوئے اس بات کی اہمیت پر زور دیا کہ خواتین کو جب تک اقتصادی طور پر آزادی نہیں دی جائے گی وہ محکوم ہی تصور کی جائیں گی۔

> ۔۔۔۔جب تک عورت اقتصادی طور پر آزاد نہ ہو۔ وہ صحیح معنوں میں آزاد شمار کیے جانے کی مستحق نہیں۔ کیوں کہ اس کے بغیر اس کی ہر بلندی ریت کی دیوار کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو دوسروں کے سہارے پر کھڑی کی گئی ہو۔ اگر خدانخواستہ وہ سہارا کسی وجہ سے ہٹ جائے تو دیوار فوراً زمین پر بچھ جاتی ہے۔ [۸۵]

انھوں نے اس کے لیے تعلیم کو بہت ضروری قرار دیا ہے۔ تعلیم انسان کو ہر مشکل اور مصیبت سے نبرد آزما ہونے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔ اقتصادی طور پر مضبوط ہونے کے لیے تعلیم کے ساتھ ساتھ ہنر کا ہونا بھی از حد ضروری ہے۔ خواتین کو چاہیے کہ وہ اپنے وسائل کے مطابق کسی نہ کسی ہنر میں مہارت ضرور حاصل کریں تا کہ

وقت آنے پر پریشانی سے بچ سکیں۔

۲۷۔ بیگم شارق:

بیگم شارق نے اپنی تحریروں میں ہندوستانی معاشرے کی خواتین کو درپیش مسائل کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے سماجی بندھنوں میں بندھی ہندوستانی خواتین کو یہ تحریک دی کہ وہ اپنی عقل و فہم سے اپنی بہتری کے لیے کوشش کریں۔ جو حقوق بحیثیت انسان عورت کو عطا کیے گئے ہیں انھیں رسوم ورواج کی بھینٹ نہ چڑھائیں لیکن ان کے ہاں روایت پرستی کا عنصر بھی غالب ہے۔ ان کے مطابق ہم روایات کو نظر انداز کر کے اگر کوئی فیصلہ لیں گے تو وہ باعث خرابی ہو گا۔ روایات کو یکسر نظر انداز کرنے کی بجائے خراماں خراماں سفر جاری رکھیں۔ ان کی تحریروں میں خواتین کے لیے شعور و آگہی کی اہمیت تو ملتی ہے لیکن وہ عورت کو بنیادی مقاصد سے بیگانہ نہیں دیکھنا چاہتی۔

انھوں نے تعلیم نسواں کی بھرپور حمایت کی اور خاص طور پر دیہی علاقوں میں تعلیمی سہولیات کے فقدان کا تذکرہ کیا۔ انھوں نے اس امر پر خصوصی توجہ دینے کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے شہری خواتین کو تلقین کی کہ وہ اپنی توجہ دیہات کی تعلیمی ترقی پر بھی مرکوز رکھیں تاکہ وہاں کی خواتین کو بھی تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا جاسکے۔ اس فکر کا اظہار ان کے مضمون "تعلیم نسواں پر ایک نظر"[۸۶] میں ملتا ہے۔ انھوں نے دیہی خواتین کے لیے نا صرف تعلیم کی ضرورت کو اہم سمجھا بل کہ انھیں صنعت و حرفت اور کھیتی باڑی میں بھی تاق کرنے کے لیے تجاویز پیش کیں تاکہ وہ معاشی طور پر بھی مستحکم ہو سکیں۔ اس فکر کا احاطہ ان کے ایک مضمون "اصلاحِ دیہات پر ایک نظر" میں کیا گیا ہے۔ جس میں انھوں نے دیہی علاقوں کی ترقی و اصلاح کے لیے اپنے افکار پیش کیے۔ اس ضمن میں انھوں نے جن امور کو ضروری قرار دیا ان میں درج ذیل شامل ہیں:

۱۔ سائینٹیفک اصولوں پر کھاد جمع کرنا۔

۲۔ شادی، غمی اور زیورات وغیرہ پر اسراف نہ کرنا۔

۳۔ جس زمانے میں کھیتی پک رہی ہو فضول وقت ضائع نہ کرنا بل کہ کسی اور طرح (دستکاری وغیرہ) سے پیسہ پیدا کرنا۔

۴۔ مکانات کا صاف اور حفظانِ صحت کے اصولوں پر تعمیر کرنا۔

۵۔ مویشیوں کی پرورش کا خیال کرنا۔[۸۷]

انھوں نے ہندوستان کی سماجی، معاشرتی اور معاشی ترقی کے لیے خواتین کی تعلیم کی اہمیت کو ابھارا۔ اس ضمن میں انھوں نے باور کروانے کی کوشش کی کہ جب تک مرد اور عورت دونوں مل کر باگ دوڑ نہیں سنبھالیں گے

ہمارا ملک ترقی نہیں کر سکتا اس لیے ضروری ہے کہ دونوں اپنی صلاحیتوں کے درست استعمال سے ملکی و ملی خدمت سرانجام دیں۔ اس ضمن میں انھوں نے تعلیم کی اہمیت کو بھی ابھارا کیوں کہ جب تک عورت باشعور نہیں ہوگی تب تک وہ قومی فلاح کا کام نہیں کر سکتی۔ اس حوالے سے ان کے مضامین "موجودہ تعلیمی نظام کے حقائق"[۸۸] اور "کیا لڑکیاں نوکریں"[۸۹] خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

بیگم شارق نے بچوں کی تربیت کے حوالے سے بھی اپنے افکار کا اظہار کیا۔ اس ضمن میں انھوں نے ہندوستانی ماؤں کو یہ تنبیہ کی کہ بچے کو بلاوجہ کی روک ٹوک کرنے سے گریز کریں کیوں کہ اس سے ان کا اعتماد کمزور پڑ سکتا ہے۔ ماؤں کو کوشش کرنی چاہیے کہ ایسا ماحول ہی نہ پیدا ہونے دیں جس سے بچہ کوئی غلطی کرنے پر مائل ہو۔ انھوں نے بچے کی حوصلہ افزائی کو اس کی شخصیت کی تعمیر کے لیے ضروری قرار دیا۔ ان کے مطابق بچوں کی شرارتوں پر پردہ ڈالتے ہوئے ان کی موقع بموقع تعریف اور حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ اس سے ان کے دل کمزور نہیں پڑتے بل کہ تقویت پکڑتے اور مضبوط ہوتے ہیں۔ بلاوجہ کی نکتہ چینی اور ڈانٹ ڈپٹ بچوں کو بزدل بنا دیتی ہے۔ انھوں نے والدین خصوصاً ماؤں کو تنبیہ کی کہ بچے کی پیدائش سے ابتدائی چند سال تک ان تمام باتوں کا خاص خیال رکھیں تا کہ ان بچے آئندہ آنے والی زندگی میں بہتر فرد کے طور زندگی گزار سکیں۔ ان تمام افکار کا احاطہ ان کے مضمون "بچوں کو سزا دینا"[۹۰] میں کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے بچوں میں سزا کی بجائے جزا یا انعام کا تصور پیدا کرنے کی تلقین کی تا کہ وہ سزا کے ڈر کے بجائے انعام اور ستائش کی خوشی میں اچھے اعمال سرانجام دیں۔

بیگم شارق نے ہندوستانی مستورات کی پستی کی وجوہات بیان کرتے ہوئے ایک وجہ اسراف بیان کی ہے۔ ان کے مطابق فضول خرچی نہ صرف ایک فرد بل کہ پوری ملت کے خسارے کا باعث بنتی ہے۔ انھوں نے اس عام روپے کا تذکرہ بھی کیا ہے کہ ہندوستانی عوام محض سماج میں اونچا مرتبہ پانے اور دوسروں کو متاثر کرنے کی خاطر اپنی بساط سے زیادہ خرچ کر دیتے ہیں جو ان کی معاشی حیثیت سے تجاوز کے ساتھ ساتھ گھریلو بدمزگی کا باعث بھی بنتا ہے۔ بعض لوگ اونچے گھرانوں سے بلاوجہ کا مقابلہ کرنے اور ان کے ہم مرتبہ ہونے کی خاطر بے دریغ خرچ کرتے ہیں جس سے ان کی آمدنی اور خرچ میں توازن قائم نہیں رہ پاتا اور وہ مالی مشکلات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے اپنے مضمون "اسراف بیجا"[۹۱] میں ہندوستانی خواتین کو فضول خرچی سے باز رہنے اور اپنی چادر دیکھ کر خرچ کرنے کی تلقین کی ہے۔

۲۸۔ بیگم مسعود علی:

بیگم مسعود علی نے والدین اور خاص طور پر طبقہ نسواں کو مخاطب کرتے ہوئے بچے کی اچھی پرورش کی

اہمیت پر زور دیا۔ انھوں نے جدید طریقۂ تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید تکنیک کو بھی موضوع بنایا اور بچے کی ذہنی نشو نما جیسے اہم مسئلے کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے خواتین میں یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش کی کہ بعض گھروں میں بچے محض اس لیے دب جاتے ہیں کہ انھیں ان کی شخصیت اور میلان طبع کے مطابق سیکھنے کے مواقع میسر نہیں آتے اور بعض خواتین اپنی سمجھ کے مطابق بچوں سے ایسا برتاؤ کرتی ہیں گویا وہ ان کے ہم عمر ہوں۔ تو ایسے بہت سے مسائل بچے کی بہتر ذہنی وجسمانی نشو نما کے آڑے آتے ہیں اور بچہ بہت سی چیزوں سے محروم رہ جاتا ہے۔ اس کا اظہار ان کے مضمون "رجحان طبیعت"[۹۲] میں ہوتا ہے۔

۲۹۔ت:

تہذیب نسواں کی اشاعت کے ابتدائی برسوں میں بعض مستورات کو ان کے اصل ناموں سے لکھنے کی اجازت نہیں تھی اسی پابندی کے نظر انھوں نے فرضی ناموں سے لکھنا شروع کیا۔ ت کا شمار بھی انھی خواتین میں ہوتا ہے جو پردے کی پابندیوں کے باوجود اپنے فرض سے سبکدوش نہیں ہوئیں بل کہ تربیت نسواں کا کام کرتی رہیں۔ انھوں نے اپنے مضمون "میاں بیوی کی ناموافقت"[۹۳] میں عدم مساوات کے مسئلے کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے مطابق ہندوستانی معاشرے میں مرد اور عورت کی تربیت میں شروع دن سے فرق روا رکھا جاتا ہے، جس میں لڑکے کو ہمیشہ بالاتر اور لڑکیوں کو کم تر بتایا جاتا ہے۔ یہ معاشرتی رویہ ان کے مزاج کا ایک مستقل حصہ بن جاتا ہے جس سے بعد ازاں بہت سے مسائل جنم لیتے ہیں۔ ت کے مطابق جس طرح عورت کو بچپن سے ہی یہ بتایا جاتا ہے کہ مرد کی عزت اور اطاعت کرنی ہے اسی طرح اگر مرد کو بھی کچھ سمجھا دیا جائے تو وہ خود کو بھی اسی دنیا کی مخلوق تصور کرے گا جس دنیا سے عورت تعلق رکھتی ہے۔ اس کی شخصیت میں موجود تعصب کو خود ہوا دی جاتی ہے جس سے بعد میں احساس برتری پیدا ہو جاتا ہے جو تمام عمر رہتا ہے۔ جدید مغربی معاشرت کے احوال کے حوالے سے بھی نظریات قلم بند کیے جس کی تفصیل ان کے مضمون "ہماری جدید معاشرت اور اس کے آداب"[۹۴] میں ملتی ہے۔

۳۰۔ تاج بیگم:

تاج بیگم نے اپنے مضامین کے ذریعے خواتین کو یہ شعور دلانے کی کوشش کی ہے کہ وہ اسلامی قانون کے مطابق اپنے شوہر اور والد کی جائیداد اور ترکے میں حصے کا حق رکھتی ہیں۔ ہندوستان کے عام رواج کے مطابق خواتین کو سراسر اس حق سے محروم کر دیا جاتا تھا جب کہ اسلام نے انھیں یہ حق دیا جس کی حق تلفی صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔ اس لیے خواتین کو چاہیے کہ قانون ساز اداروں کی مدد سے اپنے حقوق کی خاطر کمر بستہ ہوں تاکہ محکومی سے بچ

سکیں۔ اس کا اظہار ان کے مضمون "صوبہ پنجاب میں وراثت نسواں کا رواج عام"[95] اور "وراثت نسواں"[96] میں ملتا ہے۔

۳۱۔ تاج النسا بیگم:

تاج النسا بیگم نے تعلیم نسواں کی حمایت تو کی لیکن ان کے نظریات روایتی نظام زندگی کے تابع نظر آتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں یہ نظریہ حاوی ہے کہ مرد چوں کہ عورت کا مجازی خدا ہے اس لیے عورت کے لیے وہ تمام تر جتن ضروری ہیں جن سے وہ شوہر کا دل جیت سکے۔ انھوں نے مرد کی عورت پر فوقیت کی تائید کی اور عورت کے لیے مرد کی اطاعت لازمی سمجھی۔ تاج النسا بیگم نے قدیم سماجی ڈھانچے اور اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی کے بسر ان کو ضروری قرار دیا۔ انھوں نے عورت کو مرد کے تابع رہنے کو کہا اور جس طرح سے مرد چاہے ویسے ہی زندگی گزارنے کی تلقین کی۔ اس کی تفصیل ان کے مضمون "پیا چاہے وہ سہاگن"[97] میں ملتی ہے۔

اس کے علاوہ انھوں نے خواتین کی سماجی زندگی کی بہتری کے لیے بھی متعدد مضامین لکھے۔ ان کا مضمون "باہمت عورتیں"[98] میں عورتوں کی سماجی زندگی کے حوالے سے معلومات ملتی ہیں۔

۳۲۔ ت۔ ن۔ للی راج:

ت۔ ن نے اپنے مضامین کے ذریعے خواتین کو فرسودہ رسوم ورواج سے نکالنے کی کوشش کی۔ وہ چاہتی تھیں کہ ہندوستانی خواتین فرسودہ رسوم ورواج کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو کر اپنے لیے ایک ایسا لائحہ عمل تشکیل دیں جو انھیں ذہنی طور پر پختہ کریں بجائے اس کے کہ وہ جدید علوم وفنون سے متعارف ہو کر اپنی زندگیوں کو بہتر ڈگر پر لا سکیں۔ ہندوستانی خواتین انھی رسوم کی زنجیروں میں جکڑی نظر آتی ہیں۔ اس کے لیے انھوں نے نا صرف خواتین بل کہ سماجی صورت حال کو بھی ان روایات سے نکل کر علم و عقل کو بروئے کار لاتے ہوئے زندگی کو بہتر بنانے کا درس دیا۔ وہ سماجی دائرہ کار میں رہتے ہوئے خواتین کی ذہنی آزادی چاہتی تھی جس سے وہ آزادانہ اپنی من مرضی کر کے اپنی زندگی کو بہتر طور پر گزار سکیں۔[99]

۳۳۔ جمیلہ بیگم:

جمیلہ بیگم اس دور کا ایک باشعور حوالہ ہیں انھوں نے خواتین اور ان کے حقوق کو اسلامی تناظر میں پرکھا اور اسی بنیاد پر اپنے نظریات کی ترسیل کی۔ انھوں نے لڑکا لڑکی، مرد وزن کی تفریق کو سراسر غیر ضروری سمجھا اور اس دور کے سماجی ڈھانچے اور فرسودہ افکار پر کڑی تنقید بھی کی۔ جمیلہ بیگم نے خواتین کی ناقدری اور ان کے حقوق کے استحصال کو سخت ناپسند کیا وہ اسلامی نظریہ حیات کے مطابق اس کی تفہیم ان الفاظ میں کرتی ہیں:

ہندوستان میں عورت کی جس قدر ناقدری، حقوق تلفی اور بے حرمتی ہوتی ہے۔ شاید ہی اور کسی متمدن یا اسلامی ممالک میں ہوتی ہوگی۔ کہنے کو اسلام نے دختر کشی کی لعنت کو دور کر دیا ہے۔ مگر اس کا اثر بلاواسطہ طور پر طبائع پر اسی طرح حاوی ہے۔۔۔"[100]

انھوں نے سماجی حوالے سے مردوں اور عورتوں کے لیے مختص کیے گئے کرداروں کو خاص طور پر تنقید کا نشانہ بنایا ہے ان کے مطابق عورت ذات سے بعض اوقات ایسی باتیں منسوب کر دی جاتی ہیں جو کہ مرد بھی کرتے ہیں لیکن سماج میں رواج محض عورت کی کمتری کو ملتا ہے اس لیے اسے جوں کا توں قبول بھی کر لیا جاتا ہے۔ ان کے مطابق "اگرچہ عورتیں مردوں سے زیادہ گفتگو کبھی نہیں کرتیں۔ پھر بھی انہی پر فضول گوئی کا اتہام لگا کر انھیں خفیف کیا جاتا ہے۔۔۔۔"[101]

ہندوستانی معاشرے میں بیوہ کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کو مد نظر رکھتے ہوئے انھوں نے بیوہ کے حقوق کے حوالے سے بھی متعدد مضامین تحریر کیے۔ انھوں نے اسلامی طرز زندگی میں عورت خاص طور پر بیوہ کے حقوق کو واضح کرتے ہوئے سماجی ڈھانچے پر تنقید کی ہے کہ مشترکہ تہذیب ہونے کی وجہ سے مسلمانوں نے بھی وہ طور اپنا لیے ہیں جو ہندوؤں نے بیوہ کے لیے مختص کر رکھے ہیں اسی وجہ سے عورت کو جیتے جی جینے کا حق چھین لیا گیا اور تا عمر ایک ایسی دلدل میں دھکیل دیا گیا جہاں سے زمانے کی ہوا اور خوشی کا کوئی رنگ اسے چھو کر نہ گزر سکے۔"[102] ازدواجی زندگی کے مسائل اور اس سے متعلق دیگر مسائل پر انھوں نے "شادی کا ہرجانہ"[103] تحریر کیا۔

جمیلہ بیگم نے ہندوستانی عورت کی زبوں حالی دیکھتے ہوئے شریعت اسلامی کے نفاذ کی حمایت کی ان کے مطابق اسلامی قوانین کو اس قدر مسخ کر دیا گیا ہے کہ ان کی صحت تشویش ناک ہے۔ اور افسوس اس بات کا کہ مسلمانوں نے بھی اپنے مفادات کی خاطر انھیں جوں کا توں رہنے دیا۔ اسی سلسلے میں انھوں نے ازدواجی معاملات میں طلاق، خلع اور تنسیخ نکاح کے مسئلے پر بطور خاص قلم اٹھایا۔ انھوں نے عورتوں کے لیے شریعت اسلامی کے دیے گئے تمام حقوق کے حصول حمایت کی۔ انھوں نے بیوہ کی زندگی اور معاشرتی فرسودہ رسوم کے خلاف بھی آواز اٹھائی اور خواتین کو ان کے شرعی حقوق سے آگاہ کیا۔ ان کے مضمون "بیوہ"[104] میں بیوہ سے متعلق قبیح رسوماتِ معاشرہ، بیوہ کے عقد ثانی اور اس کی زبوں حالی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ انھوں نے بیوہ پر کیے جانے والے معاشرتی جبر کی مزاحمت کی اور انھیں ایک عام انسان ہونے کے ناطے اس کے حقوق کے استحقاق کا شعور دلایا۔ ان کے نزدیک ہندوستانی عورت کی ازدواجی زندگی کے مسائل میں ایک مسئلہ بے جوڑ شادیاں بھی ہیں۔ ہندوستانی معاشرہ رسوم و رواج کا اس قدر پابند ہے کہ ان رسوم کی پاسداری نہ کرنے والے کو شدید مخالفت برداشت کرنا پڑتی ہے۔ یہ رسوم شادی بیاہ کے معاملے میں بھی آڑے آتی ہیں۔ اسلام میں عورت کو شادی کے وقت اپنی پسند ناپسند کا

اظہار کرنے کی مکمل آزادی دی گئی ہے لیکن ہندوستانی معاشرے کے رواج اور خام خیالی عورت سے اس کا یہ حق پیدائشی طور پر ضبط کر لیتے ہیں۔ اور انھیں شادی کے وقت اپنی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کے اظہار کی کوئی گنجائش نہیں دی جاتی اور وہ مجبوراً ایسے انسان کے ساتھ باندھ دی جاتی ہیں جس سے اس کی کوئی ذہنی ہم آہنگی نہیں بن پاتی اور یوں اس کی تمام عمر اسی رشتے کو نبھاتے گزر جاتی ہے۔ اس فکر کی عکاسی ان کے مضمون "بے جوڑ شادیاں"[۱۰۵] میں کی گئی ہے۔

جمیلہ بیگم نے محض حقوقِ نسواں کی بابت اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا بل کہ معاملاتِ زندگی کو بہترین طریقے سے سرانجام دینے کے لیے ان میں شعور و آگہی پیدا کرنے کی کوشش بھی کی۔ انھوں نے معمولاتِ زندگی میں باہمی، محبت، اخوت اور تمام تر اخلاقی اقدار کا پاس رکھنے کی تاکید کی کیوں کہ یہی خوشگوار زندگی کی ضامن ہیں۔ ان کے مطابق اگر انسان چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل میں بٹھائے رکھے تو بعد ازاں یہ بڑے مسائل کو جنم دیتی ہیں اس لیے بہتر یہی ہے کہ درگزر کر کے اپنا دل صاف کر لیا جائے یا پھر جس شخص سے کسی نوعیت کی کوئی شکایت ہو تو اس سے تذکرہ کر کے معاملہ درست کر لیا جائے۔ انھوں نے پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کے عیب گنوانے اور شکایت کرنے کو بھی ایک برا فعل قرار دیا اور خواتین کو یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ اس سے ان کی اپنی شخصیت کمزور پڑتی ہے اور وقتی طور پر ان کی ہاں میں ہاں ملانے والے بعد ازاں ان سے نالاں ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے ہر شعبہ زندگی میں باہمی محبت کو بہت زیادہ اہمیت دی اور ہر رشتے کو اس کی نوعیت کے مطابق گنجائش دینے اور ایک دوسرے کی بات کو سمجھنے کی تاکید بھی کی۔ انھوں نے کسی ناچاکی کی صورت میں تحمل کی اہمیت کو باور کرواتے ہوئے بھی خواتین کو تلقین کی کہ معاملات کو طول نہ دیں بل کہ ایک دوسرے سے بات چیت کر کے معاملہ سلجھانے کی کوشش کی جائے اور کسی بھی مسئلے میں خود کو بری الذمہ نہ سمجھیں بل کہ دوسرے فریق کی بات کو بھی سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ انھوں نے انصاف سے معاملات کو نمٹانے کی خصوصی تلقین بھی کی۔ اس فکر کا احاطہ ان کے مضمون "آپس کی رنجشیں"[۱۰۶] میں کیا گیا ہے۔ اس خیال کی عکاسی کے لیے مزید مضامین میں "لوگوں سے حسن سلوک"[۱۰۷]، "عقل پر پردہ"[۱۰۸] اور "بدمزاجی"[۱۰۹] شامل ہیں۔

جمیلہ بیگم نے مستوراتِ ہندوستان کی عام حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ تربیتِ اطفال کے حوالے سے بھی مضامین رقم کیے۔ انھوں نے بچوں کی نشوونما، ان کی تعلیم و تربیت اور اس دوران ہونے والی عام غلطیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے انھیں درست کرنے کی تلقین کی۔ ان کے نزدیک بچے کی عمر کے ابتدائی چند سال اس کی آئندہ آنے والی زندگی پر بہت گہرا اثر رکھتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ صرف اس کی جسمانی ضروریات مثلاً غذا، لباس، صاف ستھرائی کے ساتھ ساتھ اس کی ذہنی تربیت اور نشوونما کی کوشش بھی کریں۔ اس دوران کی گئی کوشش

اس کے مستقبل کے لیے اس قدر مفید ہے کہ اس کی بنیاد پر وہ آئندہ زندگی میں ایک باوقار اور باشعور فرد کے طور پر ابھر سکتا ہے لیکن اگر بچپن کے ابتدائی سالوں میں کوئی کمی رہ گئی تو اس کا ازالہ تمام عمر نہیں ہو سکتا۔ اس ضمن میں انھوں نے "بچوں کو ڈرانا"[10]، "بچوں کو ساتھ سلانا"[11]، "بچوں کی نگرانی"[12] اور "بچی کی تعلیم"[13] "بچوں کو خود اعتمادی سکھانا"[14] درج کیے۔

ہندوستانی خواتین کی سماجی، معاشرتی ترقی اور ان کے شرعی حقوق کے بارے میں آگہی دینے کے ضمن میں انھوں نے "لڑکیوں کا مستقبل"[15]، "تعلیم یافتہ خواتین کا مستقبل"[16]، "فضول چیزیں"[17]، "عورت کی آزادی"[18]، "ہندوستان کی مسلم خواتین"[19]، "عورتیں کیا کریں"[20]، "تنسیخ نکاح ایکٹ"[21] اور "مسودہ مسلم قانون فسخ نکاح: تمام اسلامی انجمنوں سے تائید کی درخواست"[22] درج کیے۔

۳۴۔ جمیلہ ہاشمی:

جمیلہ ہاشمی اردو ادب کا ایک معتبر حوالہ ہیں۔ انھوں نے تہذیب نسواں افسانوی اور غیر افسانوی ادب کی ذیل میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کیا۔ ان کی تحریروں میں اس دور کے ہندوستانی معاشرے کے مسائل کا بخوبی احاطہ کیا گیا ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے خاص طور پر خواتین کے حقوق اور مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور انھیں وقتی تقاضوں اور شرعی معاملات کے مطابق حل کرنے کی تجویز پیش کی۔[23]

۳۵۔ جہاں حبیبہ بیگم:

جہاں حبیبہ بیگم نے ہندوستانی روایات کو مد نظر رکھتے ہوئے مفاہمتی انداز اپنایا اور خواتین کو یہ تاکید بھی کی کہ اپنی روایات سے جڑے رہنے میں ہی عافیت ہے ہم کسی طور ان سے منحرف نہیں ہو سکتے۔ ان سے انحراف سے مراد کھلم کھلا اس مسئلے کو دعوت دینا ہے کہ آئندہ آنے والی مستورات کے لیے تعلیم و ترقی کی راہیں بند کروا دی جائیں کیوں کہ کٹر روایت پسند پدر سری معاشرہ جب پہلے ہی تعلیم نسواں کی مخالفت میں ہے تو ہماری بغاوت ان کے یقین کو اور پختہ کر دے گی۔ اس لیے مخالفت کی بجائے مفاہمت اختیار کرنا زیادہ بہتر ہے۔

اپنے مضمون "کھلا سر" میں وہ مستورات کو پردے کی اہمیت کے بارے میں آگاہ کرتے ہوئے اور حالات سے مفاہمت اختیار کرنے کا درس دیتے ہوئی یوں لکھتی ہیں:

> ۔۔۔۔اصل یہ ہے کہ ہم میں آج کل خود آرائی اور شیخی حد سے زیادہ تجاوز کر گئی ہے۔۔۔۔ کسی کے رو در رو تو کوئی کسی کو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مگر بعد کو طرح طرح کی پھبتیاں اڑتی ہیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ یہ سب تعلیم کا سبب ہے۔ جو بی صاحبہ اتنی شوخ ہو گئی ہیں۔ میری وہ بہنیں جن میں یہ عادت ہو گئی ہے۔ مجھے معاف کر کے اس عیب کو دور کرنے کی کوشش فرمائیں۔ تاکہ لوگوں کو

تعلیم یافتہ لڑکیوں پر طعنہ زنی کا موقع نہ ملے۔اور چند لڑکیوں کی غلطی سے سراسر تعلیم نسواں بدنام نہ ہو۔۔۔۔۔"[۱۲۴]

۳۶۔حامدہ خیری:

حامدہ خیری نے ہندوستانی معاشرے میں رائج پردے کے نظام کو ہدف تنقید بنایا انھوں نے ضرورت سے زیادہ پردے کی سختی کی مخالفت کی اور شریعت کے مطابق اس کی ضرورت اور اہمیت کو واضح کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے پدرسری نظام کے کھوکھلے پن سے پردہ اٹھانے کی سعی کی اور یہ باور کروایا کہ اس نظام کو چلانے والے کہیں نہ کہیں اسلامی حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں اور ایسے معاملات جن پر اسلام میں کسی قسم کی سختی نہیں ملتی ان پر بھی اپنی مرضی مسلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ان کے مضمون "عورتوں کی عید"[۱۲۵] میں اسی حوالے سے اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔انھوں نے مرد اور عورت کے غیر مساوی سماجی کردار اور سماجی ڈھانچے کے کھوکھلے پن پر تنقید کی اور ان تمام حدود و قیود کو اسلامی نکتہ نظر سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی جو ازل سے خواتین پر عائد ہیں۔انھوں نے معاملات زندگی میں شریعت کے احکامات کی پاسداری پر زور دیا۔

۳۷۔ح۔ب:

ہندوستانی معاشرے میں لڑکیوں کو پرایا دھن سمجھ کر ان سے متعلق فرائض سے کوتاہی برتی جاتی تھی۔ اکثر گھروں میں لڑکی کی پیدائش پر ماتم کی سی کیفیت ہو جاتی تھی جس کے برعکس لڑکے کی پیدائش شادمانی کا باعث تھی۔ح۔ب نے اپنے مضامین میں ہندوستانی معاشرے میں برتے جانے والے اسی صنفی امتیازات کو موضوع بنایا ہے۔انھوں نے لڑکے اور لڑکی کے مابین روا رکھے جانے والے سلوک اور افتراقات پر تنقید کی ہے۔

ح۔ب نے اپنے مضامین کے ذریعے ہندوستانی خواتین کو عالمی رجحانات سے روشناس کروانے کی کوشش بھی کی۔ان خواتین کو باشعور بنانے کے لیے علاقائی اور بین الاقوامی سطح پر ان خواتین کا تذکرہ بالخصوص کیا گیا جو خود بہتر شعور اور ادراک تو رکھتی ہیں لیکن ساتھ ساتھ سماجی سطح پر اپنی فہم کے مطابق بہتری لانے کے لیے کوشاں ہیں۔علاوہ ازیں قومی اور بین الاقوامی شخصیات کے موازنے سے ہندوستانی خواتین کی موجودہ صورت حال کو بہتر بنانے کی کوشش بھی کی گئی۔"[۱۲۶]

۳۸۔حجاب اسماعیل:

حجاب اسماعیل کی تحریروں میں اسلام میں عورت کی اہمیت اور اس کے حقوق سے متعلق معلومات ملتی

ہیں۔ انھوں نے یہ باور کروانے کی کوشش کی ہے کہ مرد نے ہمیشہ عورت کو ناقص العقل سمجھا اور ہر میدان زندگی میں اسی بنا پر پیچھے دھکیلا کہ وہ عقل اور سمجھ بوجھ نہیں رکھتی۔ انھوں نے معاشرتی رویوں اور اسلامی شعار زندگی کا موازنہ کرتے ہوئے نبی پاک ﷺ کے اپنی ازدواج مطہرات کے ساتھ رویے کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے اور اسوہ رسول ﷺ کی روشنی میں یہ باور کروانے کی کوشش کی ہے کہ عورت کو کم از کم مسلمان ہونے کے ناطے وہ بنیادی حقوق لازمی دیے جانے چاہییں جو اسلام نے عورت کے لیے مقرر کیے ہیں۔

حجاب اسماعیل نے ہندوستانی معاشرے میں اس منفی سوچ کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ جس کی بنا پر ہر مسئلے کا دوش عورت کو دیا جاتا ہے۔ اس فکر کی مذمت کرتے ہوئے انھوں نے اس بات کی حمایت کی ہے کہ ہر مصیبت اور پریشانی کا دوش عورت کو دینے کی بجائے اسے اپنے جیسا انسان سمجھ کر معاملات کو بہتر بنانے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ اپنے ایک مضمون میں اس نظریے کی حمایت ان الفاظ میں کرتی ہیں:

> اگر خالق نے عورت کو مرد کا یا صرف مرد کو عورت کا لباس قرار دیا ہوتا تو اس تمثیل اور اس تعلق میں مساوات نہ ہوتی۔ ادنیٰ۔ اعلیٰ۔ کمتر اور برتر۔ بدتر اور بہتر کی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتیں۔ مگر قرآن مجید کے اس کھلم کھلا مساوات کی ہدایت کے باوجود تم نے اپنے آپ کو عورت کا حاکم سمجھ لیا۔ اور مجھ پر خود ساختہ مفت کی قید کی مصیبتیں عائد کیں۔ اینٹ اور چونے کی کمزور دیواروں کو میری عصمت اور پاکدامنی کا محافظ قرار دیا۔۔۔۔"[۱۲۷]

اپنے ایک اور مضمون میں حجاب اسماعیل صنفی تفریق کے خاتمے کے لیے ایک فلاسفر کے قول کو مثال کے طور پر بیان کرتی ہیں:

> اگر مرد عورت کا حاکم ہوتا تو عورت اس کے تلوؤں سے نکالی جاتی۔ اور اگر مرد عورت کا غلام ہوتا تو عورت اس کے سر سے بر آمد ہوتی۔ مگر چوں کہ مرد اور عورت میں نیچر نے برابری اور ہمسری رکھ دی ہے۔ اس لیے عورت مرد کے پہلو سے نکالی گئی۔"[۱۲۸]

ہندوستانی سماج میں خواتین کی تعلیم ترقی کے حوالے سے بات کرتے ہوئے انھوں نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ یہاں کی عورت کی راہ میں حائل دیگر رکاوٹوں میں سے ایک رکاوٹ یہاں کا نظام پردہ ہے۔ کیوں کہ یہاں پردہ چادر اور چار دیواری کا مترادف تھا۔ یہاں عورت کو تمام علوم فنون سے دور گھر میں مقید رکھنا ہی پردہ تصور کیا جاتا تھا۔ حجاب اسماعیل نے اس نظام پردہ جس میں زمانے کی ہوا سے محفوظ رکھنا ہی پردہ تھا کی سخت مذمت کی ہے۔ ان کے خیال میں عورت کو یہ اختیار حاصل ہونا چاہیے کہ وہ اپنی زندگی اسلامی اصولوں کے مطابق بسر کرنے کے قابل ہو، جس میں اسلامی اصولوں سے انحراف بھی نہ کرے اور نہ ہی گھر میں قید کی جائے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا

کہ انھوں نے عورت پر اپنی رائے تھوپنے کی سخت مخالفت کی ہے۔ انھوں نے سماجی سطح پر عورت اور مرد کے مساوی حقوق و فرائض کی حمایت کی ہے۔ ان کے خیال میں محض جسمانی ساخت اور صنفی حیثیت کی بنیاد پر ہم عورت کو مرد سے کم تر نہیں کہہ سکتے۔

حجاب اسماعیل کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے ایک اصول اور لائحہ عمل ہونا ضروری ہے۔ کیوں کہ اس کے بغیر زندگی کا بسر ان محض دن پورے کرنے کے متبادل ہے۔ اگر انسان نے اپنے فہم شعور سے زندگی میں کچھ ایسا نہیں کیا جو اس کی اپنی بھلائی کی غرض سے ہو تو تمام عمر ضائع کی۔ اس کی مثال ان کے مضمون "اصول زندگی"[۲۹] میں ملتی ہے۔

"منہ سکڑے مرد اور عورتیں"[۳۰] میں وہ گھریلو زندگی اور خوشگوار تعلقات کی بابت یہ بتانے کی کوشش کر رہی ہیں کہ محض عورتوں سے یہ توقع رکھنا کہ جب مرد گھر آئے تو عورت ہنستی مسکراتی ملے سراسر غلط ہے۔ گھر کی بنیاد دونوں افراد کے باہمی تعلق اور التفات کی وجہ سے مضبوط ہوتی ہے تو محض عورت کے کندھوں پر گھریلو سکون کا بوجھ لادنا کسی طور درست نہیں ہے مرد اور عورت دونوں کو گھریلو زندگی کو بہتر بنانے کی خاطر کوشش کرنی چاہیے۔ ان کے مضمون "آواز"[۳۱] میں بھی انہی افکار کو پیش کیا گیا ہے۔ دیگر مضامین میں "شگون پرستی اور نجوم"[۳۲] اور "اختلاف"[۳۳] شامل ہیں۔

۳۹۔ حجاب امتیاز علی:

حجاب امتیاز علی بیسویں صدی کی نامور ناول نگار اور افسانہ نگار خاتون ادیب ہیں۔ انھوں نے افسانوی نثر کے ساتھ ساتھ غیر افسانوی نثر میں بھی اپنے افکار کی ترسیل کی لیکن زیادہ توجہ افسانوی ادب کی طرف ہی رہی۔ وہ پہلے پہل حجاب اسماعیل کے قلمی نام سے اپنی فکری صلاحیتوں کی ترسیل کیا کرتی تھی لیکن سید امتیاز علی تاج سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد انھوں نے حجاب امتیاز علی کے نام سے اپنا ادبی سفر جاری رکھا۔ انھوں نے ہندوستانی خواتین کی حالت کو درست کرنے اور ان میں شعور و آگہی پیدا کرنے کے لیے تہذیبِ نسواں میں متعدد تحریری لکھیں جن میں زیادہ تر افسانے اور افسانچے ہیں۔ ان کے چند ایک مضامین بھی اسی فکر کی عکاسی کرتے ہیں۔

حجاب امتیاز علی نے عورت کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے یہ باور کروایا کہ خدا نے عورت کو ماں جیسے اعلیٰ منصب پر فائز کیا ہے جس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اس میں اتنی صلاحیت موجود ہے کہ وہ آئندہ آنے والی نسلوں کی بہتر تربیت کر سکتی ہے اور نظامِ زندگی کو بہتر بنانے کے لیے اپنی صلاحیتیں بہتر طور پر برت سکتی ہے۔ حجاب امتیاز علی

نے ماں کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے اولاد کے ذمہ داریوں کا احاطہ اپنے مضمون "عورت بحیثیت ماں کے "[۱۳۴] میں کیا ہے۔ اس مضمون میں وہ ماں سے محبت اور اس کی فرمانبرداری کی تلقین کرتی نظر آتی ہیں۔

حجاب امتیاز علی نے خواتین ہند کو آدابِ ملاقات اور آدابِ محفل سے بھی روشناس کروایا۔ انھوں نے دورانِ ملاقات ہونے والی عام اغلاط کا احاطہ کرتے ہوئے یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ جب کہیں کسی سے مل بیٹھنے کا موقع ملے تو محض خود نمائی نہ کریں بل کہ محفل میں موجود تمام خواتین کو بات کرنے کا یکساں موقع فراہم کریں۔ ان کے مطابق مشرقی عورتیں اپنے ملاقاتی کو عموماً اپنے مطابق سنانے پر مصر ہوتی ہیں اور اس کی رائے کا کوئی خیال نہیں رکھتی اور یک طرفہ تکلم سے محفل کا لطف ماند پڑ جاتا ہے نا صرف یہ کہ دوسرے شخص کو بات کرنے کا یکساں موقع فراہم کیا جائے بل کہ موضوع کا تنوع بھی بہت ضروری ہے۔ ان کے مطابق ہندوستان کی محفلوں میں عام طور پر گنتی کے چند موضوعات پر ہی بات کی جاتی ہے۔ جن میں بیماری، نوکروں کی شکایت، اپنی عدم فرصتی کا رونا، مہمانوں سے بیزاری کا اظہار جن سب کا مقصد اپنی مظلومیت کا اظہار ہوتا ہے۔ خواتین کو چاہیے کہ جب کبھی باہم مل بیٹھنے کا موقع ملے تو محض گنے چنے موضوعات پر بات نہ کریں بل کہ مختلف موضوعات پر بات کرتے ہوئے ایک دوسرے کے نظریات جاننے اور ان سے استفادہ حاصل کرنے کی کوشش کریں۔[۱۳۵]

۴۰۔ خاتون اکرم:

خاتون اکرم نے اپنے مضامین کے ذریعے خواتین کی اخلاقی تربیت کے ی کوشش کی۔ انھوں روزمرہ مثالوں کے ذریعے خواتین کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ کس طرح اپنے اخلاق و عادات کو بہتر بنا سکتی ہیں۔ کن امور پر توجہ دے کر وہ اپنی شخصیت کو پر وقار بنا سکتی ہیں۔ وہ لڑکیوں کو تلقین کرتی ہیں کہ بلا ضرورت کا ہنسی مذاق انسان کے وقار کو ٹھیس پہنچاتا ہے، اس لیے متوازنی رویہ اختیار کرنا زیادہ ضروری ہے۔[۱۳۶] اسی موضوع پر انھوں نے "ہنسی مذاق"[۱۳۷] اور "وعدہ وفائی"[۱۳۸] بھی درج کیے۔

۴۱۔ خدیجۃ الکبریٰ:

خدیجۃ الکبریٰ نے تعلیم نسواں کی حمایت میں متعدد مضامین لکھے اور انھوں نے اپنی تحریر کے ذریعے اس طبقہ نسواں کو باشعور بنانے کی کوشش کی جو جدید طرز تعلیم کی محض اس لیے مخالفت کیا کرتی تھی کہ جدید تعلیم انھیں باغی کر دے گی اور وہ اپنی روایات کو بھول جائیں گی۔

انھوں نے جدید طریقہ تدریس کی حمایت کرتے ہوئے فرسودہ رسوم و رواج اور سماجی برائیوں کو بھی ہدف تنقید بنایا ہے انھوں نے قدامت پسند اور متعصب خواتین کو اس بات کا یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ جدید تعلیم

عورت کو مرد سے ممتاز کرنے کے لیے لازمی نہیں ہے بل کہ یہ اسے باشعور بنانے کے لیے ضروری ہے تاکہ وہ اپنی ذات کو پہچان سکے اور اس سے متعلق معاملات میں اپنی سوچ بچار سے معاملات کے حل کے لیے کوشش کر سکے۔

> ۔۔۔۔میں نے بھی زنانہ اسکول میں تعلیم پائی ہے۔ کہ اگر میں اپنے شوہر کی لونڈیوں کی طرح اطاعت کرتی ہوں۔یا اور بیبیاں جو اسکول کی تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود شوہر کی فرمانبرداری کرتی ہوں تو کیا ان کی مثال اتنی حقیر و ناچیز و کالعدم ہے۔۔۔۔
>
> ۔۔۔۔اس کو بھی جانے دو زبان سے نہ سہی۔ مگر ایمان سے کوئی بتلائے۔ کہ کیا پرانے زمانے کی فرشتہ صفت عورتیں اپنی لڑکیوں کی خاطر دامادوں کو غلام بنانے کی نیت سے تعویذ گنڈے نہیں کیا کرتی تھیں۔۔۔[۱۳۹]

خدیجۃ الکبریٰ نے اپنی تحریروں میں خواتین کو فرسودہ رسوم وعقائد سے دور رہنے کی ترغیب دی۔ ان کے مطابق محض جدید تعلیمی تقاضوں سے متعلق تعصب پالے رکھنے سے معاشرہ مزید پستی کی طرف گامزن ہو گا۔ اس لیے انسان کو چاہیے وہ اعلیٰ اخلاقی اقدار کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اپنے فرائض کی انجام دہی کریں تو معاشرے میں کبھی بھی بگاڑ پیدا نہیں ہو سکتا۔[۱۴۰] علاوہ ازیں انھوں نے ہندوستان میں رائج پردے کے نظام کو ہدف تنقید بناتے ہوئے یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ مذہبی حوالے سے رائج پردہ اور ہندوستانی نظام میں رائج پردے کا تصور یکسر مختلف ہے۔ مذہبی حوالے سے کی جانے والی پردے کی تاکید عورت کو محدود نہیں کرتی کہ وہ چار دیواری میں قید ہو جائے جب کہ ہندوستانی معاشرے میں اسی قید کو پردے کا نام دیا گیا ہے۔ عورت کو چار دیواری تک محدود کر کے تمام علوم وفنون سے دور رکھنا کسی طور مناسب نہیں ہے۔ اس عمل سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی مردوں نے یہ پردہ خواتین کے لیے محض اس لیے ضروری قرار دیا ہے کہ وہ ان کے پنجہ استبداد سے چھٹکارا نہ پاسکیں۔

انھوں نے ہندوستان میں پردے کی صورت حال اور اسلام میں پردے کی تلقین کا موازنہ کرتے ہوئے یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ ہندوستانی معاشرے میں پردہ محض خواتین کو محدود و محکوم کرنے کے لیے کروایا جاتا ہے۔ یہاں پردہ اسلامی شعار کی حیثیت سے رائج نہیں ہے ۔پردے سے متعلق ان کے افکار ان کے مضامین "ہندوستانی پردہ"[۱۴۱] اور "ہندوستان کا مروجہ پردہ"[۱۴۲] میں ملتے ہیں ۔تربیتِ نسواں کے حوالے سے مختلف موضوعات پر "لامذہبی کا الزام"[۱۴۳]،"عورتوں کو ہر حال میں صبر کی تلقین"[۱۴۴]،"بچوں کو تعلیم کی ترغیب و تشویش"[۱۴۵] اور "ہندوستان کا مروجہ پردہ"[۱۴۶] شامل ہیں۔

۴۲۔دختر عبدالودود:

دختر عبدالودود نے ہندوستانی سماج میں موجود ان معاشرتی مسائل کو موضوع بنایا ہے جو خواتین کی راہ میں

رکاوٹ بن گئے۔ انھوں نے قدیم رسوم سے انحراف کی راہ اپنائی۔ اور اس معاشرتی ڈھانچے پر بھی کڑی تنقید کی جس کی وجہ سے عورت کو مسلسل استحصال کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے ضرورت سے زیادہ پردے کی تاکید پر بھی تنقید کی ہے۔ اپنے ایک مضمون " قوانین عروسی " میں وہ ان پر اور غیر ضروری پردے پر بھی چوٹ کرتی نظر آتی ہیں۔ [۱۴۷]

۴۳۔ رشید جہاں بیگم (بنت شیخ عبداللہ):

رشید جہاں بیگم نسائی ادب کا معتبر حوالہ ہیں۔ انھوں نے خواتین میں شعور و آگہی پیدا کرنے کے لیے خاطر خواہ اقدامات کیے اور افسانوی و غیر افسانوی نثر سے خواتین میں شعور پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے طبقہ نسواں کی تعلیم و ترقی کے حوالے سے تہذیب نسواں میں متعدد مضامین لکھے۔ ہندوستان میں تعلیم کے حوالے سے کیے گئے اپنے والد کے اقدامات اور خدمات کو بھی خوب سراہا اور اس میدان میں ان کے دوش بہ دوش خواتین کی تعلیم و ترقی کے لیے کوشاں بھی رہی۔ [۱۴۸]

۴۴۔ رضویہ خاتون:

رضویہ خاتون نے خواتین کی بنیادی ذمہ داری تربیت اطفال کے حوالے سے خواتین کو شعور و آگہی دلانے کی کوشش کی۔ انھوں نے اسے اہم ترین ذمہ داری قرار دیتے ہوئے عورتوں کو ان کے منصب میں اعلیٰ کارکردگی کے حوالے سے معلومات فراہم کیں کہ کیسے وہ اپنے بچے کی اچھی تربیت اور نشوونما کرسکتی ہیں۔ [۱۴۹]

ان کے ہاں لڑکی اور لڑکے کے برابر حقوق کے تحفظ حوالے سے نظریات بھی ملتے ہیں۔ انھوں نے ہندوستانی معاشرت کے اس عیب پر روشنی ڈالی ہے جو ہر گھر، ہر فرقے اور ہر طبقے کے لوگوں میں یکساں پایا جاتا ہے۔ ان کے مطابق لڑکا اور لڑکی دونوں رب کے انعامات ہیں تو ہم کیوں محض لڑکی کے پیدا ہونے ناشکری کریں بل کہ ہمیں لڑکی کو رحمت خداوندی سمجھ کر قبول کرنا چاہیے۔ یہ نظریات تو زمانہ جاہلیت میں پائے جاتے تھے کہ لڑکی کے پیدا ہونے پر ناشکری کرتے تھے اگر ہم اب بھی ایسا کر رہے ہیں تو رحمت خداوندی پر ناشکری کے ساتھ ساتھ مذہب سے انحراف کے بھی مرتکب ہو رہے ہیں۔ اس لیے دونوں کو برابر انسانی حقوق دیے جانے چاہیے اور ان کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑنی چاہیے ۔[۱۵۰] ازدواجی معاملات پر ان کے مضمون "میاں بیوی کی رنجش "[۱۵۱] خواتین میں یہ شعور پیدا کرنے کی غرض سے لکھا گیا ہے کہ حتیٰ المقدور یہ کوشش کی جانی چاہیے کہ آپس میں رنجشیں کم ہوں کیوں کہ اس کا براہ راست اثر بچوں کی ذہنیت پر ہوتا ہے۔

۴۵۔ زبیدہ زریں:

زبیدہ زریں نے اپنے مضامین ہندوستانی معاشرے میں موجود خواتین کے ازدواجی مسائل کا احاطہ کیا اور ان تمام مسائل کا واحد حل شریعتِ محمدی کی پیروی بیان کیا۔ ان کے مطابق جب تک اسلامی قوانین اور تعلیمات پر عمل درآمد نہیں ہوگی تب تک ہندوستانی عورت کی حالت بہتر نہیں ہو سکتی۔ اس ضمن میں انھوں نے ہندوستانی مستورات کو ان کے شرعی حقوق سے بھی متعارف کروایا تا کہ وہ اپنے لیے خود کوئی قدم اٹھا سکیں اور اپنی حالت بہتر بنا سکیں۔ اس حوالے سے لکھے گئی مضامین میں "تعدد ازدواج اور فسخ نکاح"[۱۵۲]، "تعدد ازدواج"[۱۵۳]، "نکاح کا اختیار"[۱۵۴] اور "اسلام اور سرمایہ کاری"[۱۵۵] شامل ہیں۔

۴۶۔ زہرا بیگم:

زہرا بیگم نے ہندوستانی عوام کے ان خصائل کو اپنا موضوع بنایا جو جدید تہذیب کی چکا چوند سے متاثر ہونے کے بعد در آئے تھے۔ یہاں کے لوگوں نے مغرب کی اندھا دھند تقلید میں اپنی روایات کو خیر آباد کہہ دیا اور اسی کو کل سرمایہ سمجھتے ہوئے روز مرہ معمولات میں اس کا برتاؤ عام کیا۔ ان میں چند ایک چیزیں ایسی تھیں جو بہتر اور اپنانے کے لائق تھیں لیکن ہر چیز کو برتنا اپنی تہذیب کے نقوش مٹانے کے مترادف تھا۔ زہرا بیگم نے ایسے ہی معاملات پر تنبیہ کی اور اپنی انفرادیت کی بقا کے لیے کوشش کو ضروری سمجھا۔ ان افکار کا اظہار ان کے مضمون "ہندوستانیوں کی بعض عادتیں"[۱۵۶] میں ملتا ہے۔

۴۷۔ س۔ الف:

س۔ الف نے روایتی طرز تعلیم کے زیر اثر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا آغاز کیا۔ انھوں نے جدید ضروریات کے مطابق تعلیم نسواں کی حمایت تو کی لیکن ان کا جھکاؤ روایتی تصور تعلیم پر رہا۔ ان کے مطابق مستورات کو اپنی زندگی اسلامی تعلیمات کے عین مطابق بسر کرنی چاہیے۔ اس کی مثال ان کے مضامین "اسلام نظام کی حمایت"، "یک جدیوں میں شادی" اور "محروم وراثت لڑکیاں"[۱۵۷] میں ملتی ہے۔

۴۸۔ ستارہ جبین بنت ا۔ ع۔ خ:

انھوں نے گھریلو معاملات و مسائل سے متعلقہ متعدد موضوعات پر قلم اٹھایا۔ انھوں نے گھریلو ناچاقی کے حوالے سے برتے جانے والے سلوک پر اپنے مضمون "ہم خود ظالم نہیں مردوں کے قصور سے ظالم ہیں"[۱۵۸] میں گھریلو معاملات پر سیر حاصل بحث کی ہے اور شوہر اور بیوی کے معاملات پر معلومات فراہم کی ہیں۔ اس میں انھوں نے گھریلو تشدد کے حوالے سے بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ ان کی تحریروں میں عورت کا نوکری کرنا اور شوہر کا

اسی وجہ سے کسی کام میں دلچسپی نہ لینا بھی موضوع بنایا گیا ہے۔

۴۹۔ سردار محمدی بیگم:

سردار محمدی بیگم نے اپنے مضامین میں ہندوستانی معاشرے میں موجود نقائص پر بات کی انھوں نے اس منفی فکر کی مذمت کی جو مغرب کے زیر اثر ہندوستان میں در آئی تھی۔ مخلوط ثقافت کے زیر اثر جب ہندوستانی خواتین نے مغربی عورتوں کی آزادی اور بال بچوں سے پروائی دیکھی تو انھوں نے بچوں کو اپنے لیے وبال جان سمجھا اور اس فرض سے سبکدوش ہونا چاہا جو قدرت نے بحیثیت عورت اسے تفویض کیا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے فیشن پرستی اور مغربی کے نقائص کی وضاحت اپنے مضمون "معصوم بچوں کے حق پر ڈاکہ "[۱۵۹] میں کی۔ انھوں نے ماں اور بچے کے رشتے کی نزاکت کو واضح کیا اور ان خواتین کو درست سمت دکھانے کی کوشش کی جو اپنے بنیادی فرائض یعنی تربیت اطفال اور ان کی بہتر نشوونما سے کنارہ کش تھیں۔ انھوں نے انھیں یہ باور کروایا کہ بدیسی خواتین کی پیروی ان کے اپنے بچوں کے حق میں درست نہیں ہے۔ اس ضمن میں ان کے خیالات کی عکاسی "عورتوں کو لکھنا پڑھنا سکھانا"[۱۶۰] اور ترقی کی تمنا میں تحقیر کا اعلان"[۱۶۱] میں کی گئی ہے۔

۵۰۔ سلطان جہاں بیگم:

سلطان جہاں بیگم اپنے دور کی معروف خواتین میں شمار کی جاتی ہیں۔ اپنے دور کے تمام عصری مسائل سے بخوبی واقف تھیں۔ انھیں مشرقی و مغربی علوم سے واقفیت تھی۔ انھوں نے ہندوستانی خواتین کی حالت وقتی تقاضوں کے مطابق بہتر بنانے کے لیے اہم اقدامات کیے۔ وہ انتظامی، اصلاحی، ملکی، علمی اور تعلیمی شعبہ جات میں یکساں مہارت رکھتی تھیں۔ ان تمام امور کے ساتھ ساتھ ان کا" حقیقی شرف ان کی مذہبی گرویدگی، دینی عقیدت اور ایمانی جوش وولولہ تھا"[۱۶۲]

سلطان جہاں بیگم نے تہذیب نسواں میں ازدواجی زندگی کے حوالے سے اپنے نظریات پیش کیے انھوں نے اچھی زندگی گزارنے کے لیے اسوہ رسول کی پیروی کو خاص اہمیت دی۔ اسلامی شعار زندگی کو اپنا کر ہی یہ سفر اچھے طریقے سے سرانجام دیا جا سکتا ہے۔ اپنے مضمون میں سلطان جہاں بیگم نے گھریلو معاملات کے حوالے سے خاص طور پر بات کی۔ اور یہ باور کروایا کہ بیوی کو اس کے حقوق دیے جانے چاہیے شہنشاہ دو عالم بھی گھریلو معاملات میں اپنی ذات کو الگ رکھ کر ازواج مطہرات کی خوشی کا خیال کیا کرتے تھے۔ اس حوالے سے وہ لکھتی ہیں کہ:

> آنحضرت صلعم کا جو سلوک ازواج مطہرات سے تھا۔ اگر مسلمان غور سے اس کا مطالعہ کریں اور

اپنی روز مرہ زندگی میں اس کی یاد اپنے دل میں رکھیں۔ تو بہت جلد وہ تمام ازدواجی بد مزگیاں ہم سے دور ہو جائیں جو ہماری زندگی کو گھن کی طرح کھائے جا رہی ہیں۔[۱۶۳]

۵۱۔ سلطانہ بیگم:

انھوں نے ہندوستانی مرد اور عورت کے معمولات زندگی کا تجزیہ کرتے ہوئے عورتوں کی تفریح کے لیے کچھ سرگرمیوں کی بات کی ہے وہ جانتی ہیں کہ ہندوستانی مرد کا حلقہ عورت کی نسبت زیادہ وسیع ہے اس لیے مرد اگر سینما چلا بھی جائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا جب کہ عورت کو گھر کی چار دیواری میں مقید رکھنا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اس کی مزاحمت کرتے ہوئے وہ عورتوں کی تفریح کے مواقع کی حمایت اپنے مضمون "سینما پر ایک تنقیدی نظر"[۱۶۴] میں اپنے افکار کی وضاحت کرتی ہیں۔

۵۲۔ شاہزاد جہاں بیگم:

شاہزاد جہاں بیگم نے تعلیم نسواں کی بھرپور حمایت کی اور ان قدیم روایت پسند اذہان پر تنقید کی جو عورت کو محض گھر گرہستی اور چولہے تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے خواتین میں یہ شعور بیدار کرنے کی سعی کی کہ عورت کو چار دیواری میں قید نہیں رکھا جا سکتا۔ اس کی مثال ان کے مضمون "سرپرستوں کو کیا چاہیے"[۱۶۵] میں ملتی ہے۔ انھوں نے شادی بیاہ کے معاملات میں لڑکی اور لڑکے کے اختیارات کے حوالے سے بھی اپنے نظریات قلم بند کیے۔ "پسند کی شادی"[۱۶۶] میں ہندوستانی سماجی ڈھانچے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ باور کروانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستان میں رائج پردے کی سختی اور روایت پرستی کے ہوتے ہوئے یہاں لڑکی اور لڑکے کو یہ اجازت حاصل نہیں ہے کہ وہ شادی کے معاملے میں اپنی پسند ناپسند کا اظہار کر سکیں۔ ان کے مطابق پسندیدگی کے لیے دونوں کا ایک دوسرے سے میل ملاپ اور متعارف ہونا از حد ضروری ہے جب کہ ہندوستانی معاشرہ اس کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ ضرور ہونا چاہیے کہ لڑکی اور لڑکا نسبت طے ہونے سے پہلے ایک دوسرے کی تصویر دیکھ لیں اور ایک دوسرے کی عادات و خصائل کے بارے میں جان لیں لیکن شادی سے پہلے کھلے عام ملاقاتوں کی اجازت نہ مذہب دیتا ہے نہ ہی معاشرے میں اسے پسند کیا جاتا ہے۔

مسائل نسواں کے حوالے سے بات کرتے ہوئے انھوں نے اس مسئلے پر بھی قلم اٹھایا کہ ہندوستانی سماج میں عورت کو اس کے ان حقوق سے بھی محروم رکھا جاتا ہے جو اسے مسلمان ہونے کے ناطے خدا کی طرف سے دیے گئے ہیں۔ جس میں اہم ترین مسئلہ ناچاقی اور ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کے باوجود مرد کا عورت کو طلاق نہ دینا تھا۔ ہمارے معاشرے میں خلع کو عورت کے لیے ویسے ہی برا سمجھا جاتا ہے اور نکاح کے وقت ہی اس سے یہ حق چھین لیا

جاتا تھا یوں نا چاہتے ہوئے بھی عورت مرد کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور تھی۔

شاہزاد جہاں بیگم نے مرد کے عورت کو طلاق نہ دینے کی وجوہات پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے جس میں ایک بڑا مسئلہ ادائیگی مہر قرار دیا ہے۔ مرد محض حق مہر ادا نہ کرنے کی وجہ سے تمام عمر عورت کو بے نام رشتے میں باندھے رکھتا ہے۔ اپنے ایک مضمون "طلاق نہ دینا"[۶۷] میں انھوں نے اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور دلائل کے ساتھ معاملات کا بیان کیا ہے۔ انھوں نے سماجی پابندیوں کی بجائے شرع کی پابندی کو لازم قرار دیا ہے اور تاکید کی ہے کہ محض زمانے کے ڈر سے حکم خداوندی کی حکم عدولی نہ کریں۔[۶۸] اس کے علاوہ خانگی زندگی سے متعلق مضامین میں "ہندوستانی بیوی کی ذمہ داریاں"[۶۹] اور "ہماری خانگی زندگی"[۷۰] شامل ہیں۔

شاہزاد جہاں بیگم نے اپنے مضامین کے ذریعے خواتین میں نظم وضبط کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے خواتین کو یہ باور کروایا کہ زندگی میں ترتیب اور توازن تب ہی پیدا ہو سکتا ہے جب ایک خاص قاعدے کے ساتھ معاملات کو سرانجام دیا جارہا ہو۔ اس میں محض فرائض کی انجام دہی نہیں بل زندگی کے گزر بسر کے تمام معاملات آجاتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کے مضمون "گھر کا ضبط"[۷۱] میں تفصیل ملتی ہے۔

تعلیم نسواں اس دور کا ایک اہم مسئلہ تھا۔ سماجی سطح پر اس کے لیے کاطر خواہ اقدامات کیے گئے جن میں نجی سطح پر خواتین کو تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ ان کی رسمی تعلیم کی ضرورت پر بھی غور کیا گیا۔ اس سلسلے میں ایسے مدارس کی تعمیر کا اہتمام کیا گیا جہاں مسلمان خواتین بھی اپنی تعلیمی۔ ان مدارس میں خواتین کو ایسا ماحول فراہم کیا گیا کہ وہ کسی قسم کے سماجی دباؤ سے آزاد ہو کر اپنا سفر جاری رکھ سکیں اور اپنی تعلیمی سرگرمیاں بطریق احسن سرانجام دے سکیں۔ اس حوالے سے متعلق مسائل کا اظہار شہزاد جہاں بیگم نے اپنے مضمون "ہمارے زنانہ مدارس کا انتظام"[۷۲] میں کیا۔ ہندوستان میں تعلیم نسواں کی ضرورت اہمیت اور سماجی صورت حال کے موضوع پر ان کے دیگر مضامین میں، لڑکیوں کی تعلیم"[۷۳]، "تعلیم نسواں کی ترقی"[۷۴]، "تعلیم نسواں کے متعلق غلط فہمی"[۷۵] اور، "زنانہ آزادی"[۷۶] شامل ہیں۔

شاہزاد جہاں بیگم اس دور کے سماجی مسائل سے بخوبی واقف تھیں وہ اس بات کا ادراک رکھتی تھیں کہ معاشرتی مسائل میں ایک اہم مسئلہ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم ہے اسی سے معاشرے بگاڑ کا شکار ہوتا ہے اور باہمی عداوتیں طول پکڑتی ہیں۔ انھوں نے روپے پیسے کے جمع کرنے کی بجائے اس کے درست استعمال کی اہمیت کو واضح کیا۔ جس کی مثال ان کے مضمون "تقسیم مال"[۷۷] میں اس حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ روپیہ پیسہ جمع کرنے کی بجائے اپنے بچوں خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی، کی تعلیم وتربیت پر خرچ کرنا چاہیے تاکہ ان میں خود اعتمادی پیدا ہو اور وہ بغیر کسی محتاجی کے اپنے معاملات خود سنبھالنے کے لائق ہوں۔ اس سے

وہ معاشرتی معاملات و مسائل کو سمجھنے اور ان پر قابو پانے کے قابل ہو سکیں گے۔

"ہماری مفلسی کی وجہ "[۱۷۸] میں انھوں نے تعدد ازدواج اور اس متعلق مسائل کو موضوع بنایا۔ انھوں نے مسلمانوں کے اس عام رویے کی مخالفت کی جو یہ قیاس کیے ہوئے ہیں کہ نکاح اور کثرت اولاد ان کے لیے خوش بختی لے کر آئیں گے اور ان کے دن پھر جائیں۔ خدا نے انسان کو محنت کی تلقین کی ہے اور محنت کے ذریعے ہی انسان کے مراتب میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسی مضمون میں ایک اور اہم نکتہ تربیت اولاد اور مرد و عورت کے ایک دوسرے پر حقوق و فرائض کا بھی اٹھایا گیا ہے۔ اسلام نے مرد کو چار شادیوں کی مشروط اجازت دے رکھی ہے لیکن ہندوستانی مرد شرائط کو بھلا کر چار شادیاں اپنا حق سمجھنے لگا اور اس سے بہت برے نتائج نکلے۔ مرد نے محض نکاح کے حکم کو دل سے لگالیا اور دیگر احکامات کی تعمیل سے بے بہرہ رہا۔ اس مضمون میں شاہزادجہاں بیگم نے ان مغالطوں کو ختم کرنے کی تلقین کی ہے جو کبھی لاعلمی میں تو کبھی جان بوجھ کر اپنائے گئے ہیں۔

مصنفہ نے جہاں خواتین کے حقوق کی بات کی وہیں وہ انھیں ان کے بنیادی انسانی فرائض کی انجام دہی کی تلقین کرتی بھی نظر آتی ہیں۔ انھوں نے معاشرتی مسائل کی ایک وجہ ناجائز طرف داری کو قرار دیا۔ ان کے خیال میں جب کسی مسئلے کے محض ایک پہلو کو دیکھا جارہا ہو تو وہی درست نظر آتا ہے ایسا کرنا درست نہیں ہے۔ بل کہ کسی بھی معاملے کو بہتر طور پر سلجھانے کے لیے ہر پہلو کا جائزہ لے کر معاملہ حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس طرح کسی ایک فریق کی حق تلفی بھی نہیں ہوتی اور معاملہ بھی بہتر طور پر حل ہو جاتا ہے۔ ان افکار کی ترسیل ان کے مضمون "طرف داری"[۱۷۹] میں کی گئی ہے۔

انھوں نے خواتین کی سماجی زندگی کی اہمیت پر زور دیا۔ ان کے نزدیک گھر بیٹھے اکیلے انسان کی ذہنی نشو و نما اور فکری آبیاری نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے سماج کے دیگر افراد سے رابطہ اور میل ملاپ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس سے انسان جدید رویوں سے ہم آہنگ ہوتا ہے اس کے افکار میں جدت پیدا ہوتی ہے جب کہ تنہا ایک جگہ پر رہتے ہوئے اس کی فکری آبیاری ممکن نہیں ہے۔ اس کی ترجمانی ان کے مضمون "زنانہ تفریح گاہیں"[۱۸۰] اور دوسروں کے خطوط پڑھنا"[۱۸۱] میں ہوتی ہے۔

شاہزادجہاں بیگم نے تربیت اطفال کے حوالے سے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور ہندوستانی عورت کو اپنے اس فرض میں کسی قسم کی کوتاہی کرنے سے روکا۔ انھوں نے بچے کی بہتر تربیت کے لیے ماں کا پڑھا لکھا اور سمجھ دار ہونا ایک لازمی جزو بتایا۔ ان کے مطابق اگر ماں میں یہ خصوصیات موجود نہیں تو بچے کو کسی ایسے اتالیق کے حوالے کرنا بہتر ہے جو بہتر شعور رکھتی ہو لیکن ابتدائی تربیت پھر بھی ماں ہی کے ذمے ہے۔ اس لیے خواتین کو چاہیے کہ وہ وقتی تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق خود کو بھی تیار کریں تاکہ قوم کا مستقبل بہتر ہاتھوں میں نشو و نما

پائے۔ان افکار کا احاطہ ان کے مضمون "نانی دادی کی تربیت"[۱۸۲]، "بچوں کے اتالیق اور نگران"[۱۸۳]، "کچھ بچوں کی بابت"[۱۸۴]، "بچوں کے متعلق کچھ"[۱۸۵] اور "، بیٹی کی حق تلفی"[۱۸۶] اور "ایک غافل ماں"[۱۸۷] میں کیا گیا ہے۔

طرزِ معاشرت اور اس سے متعلق مختلف معاملات پر انھوں نے "تنہا سفر کرنا"[۱۸۸]، "اپنی مدد آپ"[۱۸۹]، "ہم پر تبدیلی کا اثر"[۱۹۰]، "والدین کے حقوق"[۱۹۱]، "بیوفائی اور وفاداری"[۱۹۲]، "غیر مذہب کے لوگوں سے مراسم"[۱۹۳]، "مہمان جانے میں لحاظ"[۱۹۴]، "عورتوں کے لیے پیشے"[۱۹۵]، "نام چھپانا"[۱۹۶]، "اصلاح مسلم خواتین"[۱۹۷]، چھپا کر کام کرنا"[۱۹۸]، "عورتوں کا تیار ہونا"[۱۹۹]، "میل جول کا زمانہ"[۲۰۰]، "اطلاع دے کر جانا"[۲۰۱]، "ہمارا آپس میں برتاؤ"[۲۰۲] اور "پردے کی نسبت میرا خیال"[۲۰۳] شامل ہیں۔

۵۳۔شمسی بیگم:

شمسی بیگم نے خواتین کو یہ تلقین کی ہے کہ ہمیں اپنی روایات اور مذہبی تعلیمات کو یک دم نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ بل کہ اپنی روایات کا پاس رکھنا بھی ضروری ہے اگر کوئی عورت اپنے شوہر کو عزت و تکریم سے نوازرہی ہے تو یہ اس کا اور اس کے شوہر کا ذاتی معاملہ ہے۔اس رشتے میں سماجی افکار کو ہر گز دخل نہیں ہونا چاہیے۔ شمسی بیگم نے "تہذیب نسواں کے متعلق میری رائے ناچیز"[۲۰۴] میں ان افکار کا اظہار کیا۔

۵۴۔صاحبزادی م۔ج:

صاحبزادی م۔ج نے خواتین کی تعلیم کے حق میں مضامین لکھے انھوں نے تعلیم نسواں کی اہمیت اور ضرورت کو واضح کرتے ہوئے جدید اور قدیم زمانے کی خواتین کا موازنہ بھی پیش کیا ہے کہ کس طرح تعلیم علم و فہم میں اضافے کے ساتھ انسان کی شخصیت میں نکھار پیدا کرتی ہے۔انھوں نے جدید تعلیم کے حصول کے بعد خواتین کے اس خاص رد عمل پر تنقید بھی کی ہے جو ان میں منفی رویوں اور سوچ کو پروان چڑھا رہی ہے۔ جس سے وہ گھر گرہستی اور دیگر امور خانہ داری کی انجام دہی سے کترانا شروع ہو گئی ہیں۔انھوں نے تعلیم کے مقاصد واضح کرتے ہوئے یہ باور کروانے کی کوشش کی ہے کہ تعلیم کے حصول کا مقصد امور خانہ داری یا دیگر امور سے فرار ہر گز نہیں ہے بل کہ تعلیم تو انھیں سماج کا ایک کار آمد فرد بنانے میں معاونت کرتی ہے جس سے ان کی اخلاقی تربیت اور شخصیت میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔اس کی مثال درج ذیل سطور میں ملتی ہے:

> ۔۔۔آج اسے انجام دینے سے ایک سند یافتہ خاتون گھبرائے گی۔اور اسے اپنی توہین سمجھے گی۔ تعلیم یافتہ عورتوں کا خیال یہ ہے کہ ہم چولھے چکی جیسے ذلیل کام میں اپنا وقت کیوں ضائع کریں۔ والدین کی بے جا قید و بند میں کیوں رہیں۔شوہر کی غلامی میں زندگی کیوں بسر کریں۔اس سے میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ نئی تعلیم سے تسلیم و رضا کی عادت جسے عورت کا جوہر سمجھا جاتا

تھا فنا ہو جاتی ہے۔۔۔۔[۲۰۵]

صاحبزادی م۔ج خواتین کو یہ باور کروانے کی کوشش بھی کر رہی ہیں کہ ان کے اس ردِ عمل سے مخالفین تعلیم نسواں کے خدشات درست ثابت ہو جائیں گے اور آئندہ آنے والی مستورات کے لیے یہ در ہمیشہ کے لیے بند بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے محض خود کو تعلیم یافتہ سمجھنے کی وجہ گھر گرہستی اور دیگر ذمہ داریوں سے ہاتھ اٹھانا تعلیم نسواں کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہ دینے کے مترادف ہے۔

۵۵۔ صدیقہ خاتون:

گھریلو تشدد اور اس سے متعلقہ معاملات کے حوالے سے لکھا۔ انھوں نے سماجی مسائل کے حوالے سے رکھی جانے والی رائے سے یہ غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ مرد اپنی طاقت اور رتبے کا بے دریغ استعمال کرتے ہوئے عورت کو اپنی تابع فرمان بنا کر نہیں رکھ سکتے۔ انھوں نے پردے اور اس سے متعلق معاملات پر بھی قلم اٹھایا۔ اپنے ایک مضمون میں یوں رقمطراز ہیں:

> ۔۔۔۔اور اگر کسی کے رونے کی آواز چار دیواری سے کہیں باہر چلی جائے۔ تو ہمارے بھائی صاحب کو آپے سے باہر نہیں ہو جانا چاہیے۔ اگر گھر سے باہر ایسی آواز کا نکلنا موجب شرم اور بے عزتی ہے۔ تو گھر کے اندر ایسے برتاؤ کا ہونا جس کا یہ نتیجہ ہے کونسی انسانیت اور شرافت کا تقاضا ہے؟ یہ اچھے گھر کے اندرونی معاملات ہیں۔ جس کی پردہ پوشی گھر کی چار دیواری ہی کر سکتی ہے۔ ورنہ جہاں ظاہر ہوئے عزت و شرافت میں بٹہ لگا۔۔۔[۲۰۶]

۵۶۔ صغرا ہمایوں مرزا:

صغرا ہمایوں مرزا اردو ادب کا ایک اہم نام ہیں۔ انھوں نے جدید تعلیمی سرگرمیوں کو سراہا لیکن اس بات پر بھی زور دیا کہ ہمیں جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے بعد اپنی روایات کو نہیں بھولنا چاہیے، بل کہ دونوں کے امتزاج سے اپنی شخصیت کو مزید نکھارنا چاہیے۔ زیور تعلیم سے آراستہ ہونے کے بعد خواتین کو چاہیے کہ وہ اسے بطریق احسن برتیں اور اپنی زندگیاں سنواریں۔ انھوں نے مشرق کے سماجی ڈھانچے کو بھی ہدف تنقید بنایا ان کے مطابق سماج میں محض عورت سے تمام تر فرائض کو منسوب کیا جاتا ہے جب کہ اس کے حقوق سے متعلق کوئی آواز نہیں اٹھائی جاتی۔ یا یوں کہ لیجیے کہ عورت کے حقوق کو اس قدر دبا دیا جاتا ہے کہ طبقہ اناث بھی اپنے بنیادی انسانی حقوق سے ناواقف رہتا ہے۔

صغرا ہمایوں مرزا نے اپنی تحریروں میں ہندوستانی تہذیب اور کلچر کا موازنہ دیگر تہذیبوں اور ثقافتوں سے بھی کیا۔ جس کا مقصد ہندوستانی خواتین میں شعور پیدا کرنا تھا۔ وہ ان خواتین کو بین الاقوامی معاملات و مسائل اور

صورت حال سے اس لیے بھی روشناس کروانا چاہتی تھی تاکہ وہ جدید رجحانات سے واقف ہو جائیں اور ان معاملات کو مسائل کو سمجھتے ہوئے اپنے مسائل پر قابو پانا سیکھیں۔ ایک اور محرک یہ بھی کار فرما تھا کہ انھیں عالمی معاملات و رجحانات سے آگاہ کروا کر ہندوستانی معاشرے میں موجود فرسودہ خیالی اور توہم پرستی کا خاتمہ کیا جا سکے۔ یہاں کی خواتین شعور و آگہی نا ہونے کی وجہ سے ایسی فرسودہ رسوم و رواج میں الجھی ہوئی تھیں کہ ان کی فکر کی مناسب نشو و نما نہیں ہو پا رہی تھی۔ ان افکار کا اظہار ان کے مضمون "ترکی میں شادی کی رسمیں"[۲۰۷] میں کیا گیا ہے۔

"بننا بگڑنا"[۲۰۸] میں انھوں نے روزمرہ معمولاتِ زندگی میں باہمی محبت اور اتفاق کی اہمیت کو اجاگر کیا اور خواتین کو امور خانہ داری سلیقے سے نبھانے کی تلقین بھی کی۔ صغرا ہمایوں مرزا نے مستورات کو معاملات زندگی میں نیک نیتی سے تمام معاملات سلجھانے کی تلقین بھی کی۔ ان کے مطابق نیک نیتی سے اگر کوئی کام کیا جائے تو دنیاوی زندگی کے ساتھ ساتھ اخروی کامیابی بھی میسر آتی ہے۔ دنیاوی حوالے سے دیکھا جائے تو لوگوں کے دلوں میں نیک نیت انسان کی عزت و توقیر زیادہ ہوتی ہے اور خدا اس کا طرف دار ہوتا ہے۔ تمام معاملات میں اللہ کی خاص مدد ملنے سے ترقی کی منزلیں طے کرتا جاتا ہے۔ جب کہ بد نیتی سے معاملات زندگی میں رکاوٹ کے ساتھ ساتھ اللہ کی خوشنودی بھی میسر نہیں آتی۔[۲۰۹]

انھوں نے اپنے مضامین کے ذریعے ہندوستانی مستورات کو آدابِ گفت و شنید کی تربیت بھی دی۔ اس کا اظہار ان کے مضمون "کم سخنی"[۲۱۰] میں ملتا ہے۔ اسراف سے متعلق اسلامی تعلیمات اور انسانی زندگی پر فضول کرچی کے اثرات کا جائزہ "کفایت شعاری"[۲۱۱] میں لیا گیا ہے۔

صغرا ہمایوں مرزا نے ہندوستانی سماج میں رائج پردے کے رواج کو بھی ہدفِ تنقید بنایا۔ انھوں اس حقیقت حال بیان کی کہ یہاں پردہ اسلامی شعار کے مطابق رائج نہیں ہے بل کہ خود سے عورت کے لیے اس کے قوانین سخت بنائے گئے ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے نظام خلد اللہ ملکہ کے اشعار کی مثال سے یہ واضح کرنے کی کوشش کہ اپنی بیٹیوں کو گھر میں مقید نہیں رکھتے بل کہ ان کے سماجی میل ملاپ کے لیے اقدامات کیے گئے ہیں۔ بادشاہ خود ایک روشن خیال اور پابند شرع انسان ہیں اور اسلامی قوانین کے خلاف کوئی کام نہیں کرتے اگر انھوں نے ہندوستان کے رواجی پردے کی پابندی اپنی اولاد کے لیے ضروری نہیں سمجھی تو باقی عورتوں کو بھی اتنی ازادی ملنی چاہیے کہ وہ سہولت کے ساتھ اپنے معاملات نبٹا سکیں۔ اس خیال کی وضاحت ان کے مضمون "پردہ سے متعلق اشعار"[۲۱۲] اور "پردہ اسے کہتے ہیں"[۲۱۳] میں کی گئی ہے۔

۵۷۔ صفورہ بیگم:

صفورہ بیگم نے اپنی معاصر خواتین کی طرح طبقہ اناث کی تعلیمی ترقی کے لیے کوششیں کی۔ ذہنی نشوونما کے ساتھ ساتھ انھوں نے خواتین کی جسمانی صحت کے حوالے سے بھی اپنے افکار پیش کیے۔ ان کے مطابق خواتین کو اپنی صحت پر خصوصی توجہ دینی چاہیے جس کے لیے وہ ورزش اور دیگر آلات کا استعمال کریں تو مناسب رہے گا۔ یہ نہ صرف ان کی جسمانی صحت بل کہ فکری آبیاری میں بھی معاونت کرے گا کیوں کہ صحت مند جسم ہی صحت مند دماغ کو غذا مہیا کرتا ہے۔ اور یوں خواتین کی گھر داری اور دیگر ذمہ داریاں بھی بطریق احسن سر انجام پاتی ہیں۔ انھوں نے خواتین کو ترغیب دی کہ وہ نجی معاملات میں الجھنے کی بجائے کسی مثبت سرگرمی میں خود کو ایسے مصروف کریں کہ ان کا ذہن پر سکون ہو جائے۔ اس ضمن میں ان کے افکار کی ترسیل ان الفاظ میں ہوتی ہے:

> میری بہنو! اب بھی ہوشیار ہو جاؤ۔ دیکھو۔ وقت تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔ تم بھی کمر ہمت باندھو اٹھو اپنی اور اپنی ابنائے جنس کی بہتری کے لیے کوشش کرو۔ اور یہ تب ہی ممکن ہے کہ تم تندرست ہو۔ اس لیے کوشش کر کے زنانہ کلب کھولو۔ اپنے گھر میں مناسب ورزش کے سامان مہیا رکھو۔ تاکہ فرصت کے وقت تم اور تمہاری بہنیں باہم کھیل اور تفریح طبع میں بھی کچھ وقت گزار سکیں۔ اگر ہم تندرست اور خوش و خرم ہوں گے تو ہمارا گھر جنت کا نمونہ ہو گا۔ ہم اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں اور قوم کی ترقی میں خاطر خواہ حصہ لے سکیں گے۔ ورنہ ایسی زندگی بیکار ہے جو رو رو کر بیماری میں گزار دی جائے۔"[۲۱۴]

۵۸۔ صفیہ مدحت خانم:

صفیہ مدحت خانم نے اپنے مضامین کے ذریعے ہندوستانی خواتین کی سماجی اصلاح کی۔ انھوں نے مسائل کے حل کی کوشش کی جو عام طور پر نظر انداز کر دیے جاتے تھے جس میں ایک فرد کا دوسرے کی زندگی میں بلا وجہ مداخلت سب سے اہم ہے۔ صفیہ مدحت نے ہندوستانی خواتین کو اس طرح تربیت دینے کی کوشش کی کہ وہ بجائے اس کے کہ کسی اور پر اعتراض کریں اور نکتہ چینی کریں اپنے حال کو سنواریں اور سماج میں ایک اہم فرد کے طور پر ابھر کر سامنے آئیں۔ کسی دوسرے پر تنقید کرنا بظاہر تو بہت آسان ہے لیکن اس سے فرد کی انفرادی نشوونما کمزور پڑ جاتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ اپنی صلاحیتوں کو مثبت انداز میں بروئے کار لایا جائے تاکہ تخریب کی بجائے ترتیب کا رجحان پروان چڑھے۔ ان افکار کی ترسیل، "سیر و تفریح"[۲۱۵]، "پردہ نشین و بے پردہ خواتین"[۲۱۶]، اور "لڑکیوں کا پردہ"[۲۱۷] میں کی گئی ہے۔

۵۹۔ ظفر جہاں:

ظفر جہاں ہندوستانی معاشرے میں مرد اور عورت کے لیے وضع کردہ اصول و ضوابط کو احاطہ تحریر میں لائیں۔ اس دور کے ہندوستانی معاشرے کے رسوم و رواج کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے غیر مساوی سماجی تقسیم کو ہدف تنقید بنایا۔ ان کے مطابق عورت اور مرد سماج میں یکساں حقوق رکھتے ہیں اور محض ایک عورت کو اس کے عورت ہونے کی وجہ سے روایات کے بوجھ تلے نہیں دبانا چاہیے۔ بحیثیت انسان اسے اپنی زندگی کے فیصلے خود لینے کا اختیار ہونا چاہیے۔ انھوں نے اس حوالے سے اپنے نظریات ایک مضمون میں یوں پیش کیے ہیں:

> ۔۔۔اگر بیوی کے لیے ماں اور چھوٹے بہن بھائیوں کا تنہا چھوڑ دینا سنگدلی اور ظلم ہے، تو بیوی بھی تو آخر ماں اور بہن بھائی رکھتی ہے۔ اس کا بھی شوہر کی خاطر ان کو چھوڑ دینا سنگدلی اور ظلم ہے۔ لیکن دنیا اس کو روا رکھتی ہے۔ اور نہ صرف یہی کہ لڑکی کو شوہر کی خاطر اپنے عزیزوں سے جدا ہونا پڑتا ہے۔ بل کہ یہ اس پر سے اور طرہ ہے کہ والدین کی آغوش شفقت کی جگہ اس کو سسرال والوں کی بے جا ناز برداری کرنی پڑتی ہے۔ جہاں ہر وقت اس کے اعمال و افعال کی ایسی سخت نگرانی رکھی جاتی ہے جو شاید منکر نکیر کی نگرانی سے بھی سبقت لے جاتی ہے۔۔۔[۲۱۸]

اس دور کے ہندوستانی معاشرے میں عورت کو ان بنیادی حقوق سے محروم رکھا جاتا تھا جو اسے اسلام میں ودیعت کیے گئے ہیں، بل کہ ان کے کانوں سے ایسی باتوں کا گزرنا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا جس میں انھیں اپنی ذات سے منسلک کسی اہم مسئلے پر آگہی ملتی ہو یا جو ان کے حقوق کے حوالے سے معلومات پہنچاتی ہو۔ اس لیے تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے خاص طور پر ایسے مضمون قلم بند کیے جن سے خواتین کو آگہی دی جا سکے کہ ان کے کون کون سے جائز حقوق ہیں تا کہ وہ بھی اپنی زندگی بہتر طریقے سے بسر کر سکیں۔

اسی طرح اسلامی قوانین کو مد نظر رکھتے ہوئے انھوں نے خواتین کے جائداد میں حق کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے وراثت اور ترکے کے حوالے سے بھی معلومات افزا مضامین درج کیے۔

ظفر جہاں نے ملکی ترقی کے لیے تعلیم نسواں کی حمایت کی اور خواتین میں یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش کی کہ جب تک خواتین خود نہ کوشش کریں ان کی حالت کبھی نہیں سنبھل سکتی اس لیے ضروری ہے کہ عورتیں ذاتی اور قومی ترقی کے لیے کمربستہ ہوں۔ اپنے ایک مضمون "قومی ضروریات کا احساس" میں ان نظریات کی عکاسی ان الفاظ میں کی گئی ہے:

> ۔۔۔۔جب تک ہمیں قومی ضروریات کا احساس نہ ہو۔ اور ہم اس کے لیے ہر ممکن کوشش عمل

میں لانے کو تیار نہ ہو جائیں۔ ہمیں اپنی پستی کا رونا رونا بالکل فضول ہے۔ جس وقت تک ہم خود کچھ
کرنے کو تیار نہ ہوں گے۔ ہماری قوم کبھی ابھر نہیں سکتی۔[۲۱۹]

انھوں نے زیادہ تر اسلام کے مطابق زندگی گزارنے کو اہمیت دی، اور اسلام میں مرد و عورت کو دیے گئے یکساں حقوق کے حوالے سے اپنے نظریات پیش کیے۔ جن کی مثالیں "مسلمان اور ان کی جائدادیں"[۲۲۰]، "لڑکیوں کے حقوق والدین پر"[۲۲۱] اور "ازدواجی زندگی اور اسراف"[۲۲۲] میں ملتی ہیں۔

۶۰۔ ظفر جہاں بیگم:

ظفر جہاں بیگم نے عورت کو اسلام میں دیے گئے شرعی حقوق کے حوالے سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ ہندوستانی معاشرے میں ہمیشہ عورتوں کے حقوق کو پامال کر کے محض فرائض کی انجام دہی کو ضروری قرار دیا گیا۔ حالاں کہ اسلام نے عورت کو مرد کے مساوی حقوق دیے ہیں۔ خوشگوار ازدواجی زندگی کا تصور تب ہی کیا جاسکتا ہے جب دونوں طبقوں کو مساوی اختیارات دیے جائیں ورنہ معاشرہ عدم توازن کا شکار ہو جاتا ہے۔

انھوں نے ہندوستانی مستورات کو علوم و فنون میں ترقی کرنے کی تحریک دینے کے ساتھ ساتھ یہ باور بھی کروایا کہ گھر گرہستی کے نظام کو بہتر طریقے سے انجام دینا بھی از حد ضروری ہے، کیوں کہ اگر یہ شعبہ زندگی متاثر ہو تو انسانی زندگی کے دیگر شعبہ جات بھی متاثر ہوتے ہیں۔[۲۲۳]

نو آبادیاتی ہندوستان میں عورتوں کو خلع کا حق نہیں دیا جاتا تھا حکومتی سطح پر بھی اس حوالے سے کوئی قانون پاس نہیں کیا گیا تھا۔ اس لیے تہذیب نسواں کی مصنفین نے خواتین کے اس شرعی حق کے حصول کے لیے مضامین لکھے تاکہ عوام میں یہ شعور پیدا کیا جاسکے اور عورتوں کے لیے بھی کوئی بل پاس کروایا جاسکے۔[۲۲۴] عورت کے حقوق اور ازدواجی زندگی سے متعلق دیگر معلوماتی مضامین میں "شوہر کی اطاعت اور صبر"[۲۲۵]، "لڑکیوں کے حقوق والدین پر"[۲۲۶] اور، "عورتوں کے حقوق"[۲۲۷] وغیرہ شامل ہیں۔

۶۱۔ عطیہ نصرت خانم:

عطیہ نصرت خانم نے ہندوستانی معاشرے میں جدید رجحانات کے حوالے سے اپنے نظریات پیش کیے انھوں نے خواتین کی تربیت اسلامی خطوط پر کرنے کی سعی کی۔ ان کے مطابق ہر نئی آنے والی چیز کو جوں کا توں قبول کر لینا کسی کے لیے بھی موثر نہیں ہوتا۔ اس لیے اپنی اقدار و روایات کو مد نظر رکھتے ہوئے انھیں اپنایا جائے۔ اسی سلسلے میں ایک مسئلہ پردہ اور حجاب ترک کرنے کا ہے۔ ہندوستانی سماج میں پردے کے خلاف بحث شروع ہوئی تو بہت سے خاندانوں میں پردہ تیزی سے اٹھنا شروع ہو گیا۔ لیکن بہت سے لوگ شرعی دائرہ کار سے بھی باہر چلے گئے

اور کسی قسم کا حجاب روانہ رکھا۔ ایسی مستورات کے لیے عطیہ نصرت نے اپنے مضمون "حجاب" میں اپنے نظریات پیش کیے۔ ان کے مطابق " آج کل پردہ جس سرعت کے ساتھ اٹھ رہا ہے اس کو روکنا ناممکن ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ رواجی پردہ کوئی شرعی حکم نہیں ہے کہ اسے قائم رکھنے کی بے سود کوشش کی جائے لیکن مسلم خواتین میں حجاب قائم رکھنے کی کوشش از حد ضروری ہے۔"[۲۲۸]

عطیہ نصرت خانم نے سیاسی معاملات میں عورتوں کی شرکت کے حوالے سے بھی مضمون قلم بند کیا۔ جس میں عورتوں کے لیے اپنے حقوق کی خاطر آواز بلند کرنا قرآن و حدیث کی رو سے ثابت کیا گیا اور اس موقف کی حمایت کی گئی کہ عورتوں کو بھی اپنی ذات کی خاطر آواز بلند کرنی چاہیے۔[۲۲۹]

۶۲۔ غ خانم:

غ خانم نے خواتین کی رسمی تعلیم کے حق میں دلائل سے اپنا نقطہ نظر واضح کرنے کی کوشش کی اور اپنے تجربات کو دیگر تہذیبی خواتین کے لیے پیش کیا۔ اس کی مثال ان کے مضمون "گھر میں تعلیم ممکن نہیں" میں ملتی ہے۔۔۔۔گھر کی تعلیم میں بچوں کے شوق میں ترقی نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ گھروں میں کوئی جماعت نہیں ہوتی۔ نا با قاعدہ تعلیم کا انتظام و اہتمام اور نہ وہ تمام سامان ہوتا ہے۔۔۔۔"[۲۳۰]

۶۳۔ فاطمہ بیگم:

فاطمہ بیگم نے اسلامی نظریات و عقائد اور ہندوستانی رسوم و رواج اور معاشرتی مسائل کو مد نظر رکھتے ہوئے خواتین کی تعلیمی ضروریات کو اجاگر کیا۔ انھوں نے خواتین کو اپنی زندگی کے مقاصد وضع کرنے کے حوالے سے خاص تربیت دینے کی کوشش کی۔ ان کے مطابق جب خواتین اتنی جرات رکھتی ہیں کہ وہ اپنی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کی خاطر مردوں کو منوالیں تو انھیں اپنی شخصیت سنوارنے کے لیے بھی اقدامات کرنے چاہئیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ شخصی تربیت کی اہمیت سے بے خبر ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ ان میں یہ شعور اور احساس پیدا کیا جائے کہ جسمانی آرائش سے کہیں زیادہ ضروری شخصیت کی تربیت ہے۔ فاطمہ بیگم کے مضامین میں خواتین میں یہی شعور پیدا کرنے کی کوشش نظر آتی ہے۔

اپنے ایک مضمون میں " قرضہ حسنہ "[۲۳۱] میں وہ خواتین کی تعلیمی اور دیگر ضروریات کے متعلق تاکید کرتی ہیں۔ خواتین کی اپنی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ انھوں نے اس بات کی اہمیت کو بھی ابھارا ہے کہ اگر پڑھی لکھی ماں ہوئی تو ہی اولاد کی اچھی تربیت کر سکے گی۔ عورت کی تعلیم محض اس کی ذات سے منسوب نہیں ہے بل کہ ایک نسل اس پر انحصار کر رہی ہوتی ہے۔ دیگر تحریروں میں " ہمدردی "[۲۳۲] اور " عورتوں کی تعلیم "[۲۳۳] اہم ہیں۔

۶۴۔فاطمہ بنت کے محمد حسین:

انھوں نے اپنے مضامین میں نو آبادیاتی ہندوستان کے طرز معاشرت کے حوالے سے اپنے افکار کی ترسیل کی۔ ان کے مطابق لباس اور دیگر لوازمات اپنے مذہب اور کلچر کے مطابق ہونا ہی زیادہ بہتر ہوتا ہے تاکہ انسان کا اپنا تشخص بحال رہ سکے۔ کسی بھی چیز سے اس قدر متاثر نہیں ہونا چاہیے کہ ہم اپنا آپ ہی گنوا بیٹھیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنی اقدار و روایات کی اہمیت کو اجاگر کیا اور دیگر اقوام کی اندھا دھن اور غیر ضروری تقلید سے منع کیا۔[۲۳۴]

۶۵۔فاطمہ صغرا بیگم:

مغربی تقلید میں ہندوستانی قوم نے اپنی اخلاقیات، روایات اور طرز معاشرت کو نظر انداز کرنا شروع کیا تو بہت سے مسائل پیدا ہوئے اور معاشرہ بگاڑ کا شکار ہو گیا۔ اس بگاڑ کو سنوارنے کے لیے تہذیب نسواں میں مضامین شائع کیے گئے۔ فاطمہ صغرا بیگم نے اپنی تحریر کے ذریعے معاشرتی زندگی کو بہتر بنانے کی تلقین کی اور اپنی طرز معاشرت کو مذہب اور روایات کے ساتھ جوڑ کر چلنے کی تاکید کی۔ ان کے مطابق خدا کے احکامات اور رسول کی دی گئی تعلیمات کے مطابق شرعی حدود میں رہتے ہوئے خواتین کو یہ آزادی ہونی چاہیے کہ وہ اپنی زندگی کو بہتر طور پر گزار سکیں۔[۲۳۵]

۶۶۔فاطمہ محمد حسین:

فاطمہ محمد حسین نے خواتین کو سماجی اعتبار سے شعور دلانے کی کوشش کی۔ ان کی ذات اور شخصیت میں نکھار پیدا کرنے کے لیے ضروری ہدایات دیں اور کہا کہ اسلامی طرز زندگی کو اپناتے ہوئے ہر میدان میں فتح حاصل کی جا سکتی ہے۔ انھوں نے شخصی نکھار کے ساتھ ساتھ اپنے جسم اور رہنے کی جگہ کی صفائی اور آرائش کے حوالے سے تربیت دی۔[۲۳۶]

۶۷۔فاطمہ مس کے محمد حسین:

فاطمہ مس کے محمد نے اپنے مضمون میں ہندوستانی معاشرے میں رائج نظام پردہ کے حوالے سے نظریات کی پیش کش کی ہے۔ وہ اپنے مضمون میں جہاں پردے کے حوالے سے اپنے نظریات کی عکاسی کرتی ہیں وہیں مسلم خواتین کو یہ تحریک دیتی ہوئی بھی نظر آتی ہیں کہ وہ محض مردوں پر تکیہ کر کے بیٹھی نہ رہا کریں بل کہ بنیادی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کچھ ہمت اور کوشش خود بھی کیا کریں۔ پردے کی اوٹ میں اگر وہ دبکی بیٹھی رہیں گی تو پردے کی پاسداری تو ہو جائے گی لیکن ایسی خواتین مردوں پر ایک بوجھ بن کر رہ جاتی ہیں۔ اس لیے

ضروری ہے کہ وہ بزدلی کو ختم کریں اور اپنے اندر اتنا حوصلہ ضرور پیدا کریں کہ اپنے مسائل سے خود نبرد آزما ہو سکیں۔ اس سلسلے میں مصنفہ نے ریل کے سفر کے احوال درج کیے ہیں کہ کس طرح زنانہ اور مردانہ خانے علاحدہ ہونے کی وجہ سے ایسی خواتین مشکل کا شکار ہوتی ہیں اور اپنے مردوں کے لیے بھی آزمائش کا باعث بنتی ہیں۔ اس کی مثال ان کے مضمون "ویٹنگ روم اور ریل"[۲۳۷] میں ملتی ہے۔

۶۸۔ف۔ض۔ی۔ل:

انھوں نے سیاسی اور سماجی سرگرمیوں میں عورتوں اور مردوں کی برابری کے حوالے سے اپنے نظریات قلم بند کیے۔ ان کے مطابق حکومتی سطح پر ایسے اقدامات ہونے چاہئیں اور ایسا لائحہ عمل ترتیب دیا جانا چاہیے جس میں عورتوں کے بنیادی انسانی حقوق کا پاس رکھا جائے اور عورتوں کو ان کے حقوق سے محروم نہ کیا جائے۔ انھوں نے سیاسی کانفرنسوں اور اجلاس میں خواتین کی نمائندگی کی حمایت کرتے ہوئے یہ باور کروایا کہ "عورتیں اپنی فلاح و بہبود اور فائدے اور نقصان کو بہتر سمجھ سکتی ہیں۔ اپنی تمدنی، تعلیمی معاشرتی و اقتصادی ترقی کے لیے موجودہ اور آئندہ ضروریات کا احساس جس درجہ پر وہ کر سکتی ہیں۔ مرد ہرگز نہیں کر سکتے۔۔۔۔"[۲۳۸] اس حوالے سے سماج کے مرد نمائندگان کو اپنی گزارشات پیش کرتے ہوئے انھوں نے اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے سفارش بھی پیش کی کہ:

> شفیق و بزرگ مردوں سے بھی التجا ہے اور قوی امید ہے کہ ہماری اعانت فرما کر اپنی فراخدلی کا ثبوت دیں گے۔ اور ہمیں رہین منت کریں گے۔۔۔۔اس موقع پر اگر حقوق کی پوری پوری نگہداشت نہ کی گئی۔ تو جدید دور میں ہمیں ہوں گے جو گھاٹے میں رہیں گے اور ہمیں راہ ترقی میں گامزن ہونے کا اچھا موقع نہ ملے گا۔ خدا ایسا نہ کرے۔[۲۳۹]

انھوں نے خواتین کی تعلیم و ترقی اور معاشرتی مسائل کے حل کے لیے متعدد مضامین تحریر کیے۔

۶۹۔ قرۃ العین:

قرۃ العین نے تہذیب نسواں میں اپنی تحریروں کے ذریعے خواتین کی سماجی اور اخلاقی تربیت کا کام لیا۔ انھوں نے اپنے زیادہ تر مضامین میں خواتین کو باہمی اخوت و محبت، اخلاص اور ہمدردی کی تلقین کی۔ ان کی زیادہ تر توجہ اصلاح معاشرہ کی طرف مبذول رہی اور اس لیے انھوں نے فرد کی تربیت سے اجتماع کی بہتری کا کام شروع کیا۔ انھوں نے ہندوستانی مستورات کو گفت و شنید کے اداب، آداب نشست و برخاست اور اداب محفل کی تربیت دی۔

قرۃ العین نے اپنی تحریر کے ذریعے خواتین میں موجود ان مسائل کو ہدفِ تنقید بنایا ہے جو ان کی اپنی ذات کے ساتھ ساتھ دوسروں کے لیے وبال جان بنے رہتے ہیں جن میں سر فہرست شکوک و شبہات ہیں۔ شبہ ایک ایسی وبا ہے جس کا شکار انسان نہ خود مطمئن رہتا ہے نا ہی کسی دوسرے سے اچھی توقعات وابستہ رکھ سکتا ہے۔ یوں اس کی

زندگی بد دلی میں گزرتی ہے۔ ان کے مضامین میں، "شبہ "[۲۴۰]، "کتابوں کی قدر"[۲۴۱]، "تعریف"[۲۴۲] اور "خوش مزاجی"[۲۴۳] شامل ہیں۔

۷۰۔ کیو۔ ایس۔ کے:

کیو۔ ایس۔ کے نے ہندوستان میں تحریکِ تعلیم نسواں کی کامیابی کے بعد وہاں کی لڑکیوں میں تعلیمی شوق کے پروان چڑھنے کا تذکرہ کیا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے حامیانِ تعلیم نسواں کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے یہ اعتراف کیا کہ انھی کی کاوشوں کی بدولت ہندوستانی خواتین کی تعلیمی ضروریات سے متعلق کام شروع ہوگیا ہے لیکن وہ ان والدین کی منفی سوچ کی تردید بھی کرتی نظر آتی ہیں جو روشن خیالی کے اس دور میں بھی اپنی بیٹیوں کو گھر داری اور خانہ داری تک محدود رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مضمون "آج کل کی لڑکیوں کا تعلیمی شوق"[۲۴۴] میں ایسے ہی والدین کو تاکید کی ہے کہ وہ بیٹوں کے ساتھ ساتھ بیٹیوں کی تعلیمی ضروریات کا خیال رکھیں تاکہ وہ تمام عمر اس احساسِ محرومی میں نہ گزار دیں کہ ان کے والدین نے ان کے لیے تعلیم کا مناسب انتظام نہیں کیا۔ انھوں نے جدید وقتی تقاضوں سے روشناس کرواتے یہ تنبیہ کی کہ لڑکیوں کی تعلیم کے حوالے سے والدین کی غفلت اور لاپرواہی الم ناک نتائج پیدا کرے گی اور بعد ازاں سوائے پچھتاوے کے کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

۷۱۔ مبارک دلھن:

مبارک دلھن نے ہندوستانی طرزِ معاشرت کے مسائل پر قلم اٹھایا۔ انھوں نے متوسط طبقے کی ان خواتین کو مخاطب کیا جو روایتی طرزِ معاشرت اور رسوم ورواج میں الجھی اپنے حال سے بے خبر تھیں۔ ایسی خواتین ان رسوم ورواج کے زیرِ اثر زندگی گزار رہی تھیں جو معاشرے کے بنائے ہوئے تھے۔ ایسی خواتین جدید دور کی تمام تر تبدیلیوں سے ناواقف تھیں۔ مبارک دلھن نے ایسی خواتین کو تنبیہ کرتے ہوئے یہ باور کروایا کہ جدید معاشرتی تقاضوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے محض گھر کا ہو کر رہ جانا اور چادر چار دیواری کے اصول کی سختی سے پابندی کافی نہیں ہے۔ جدید صورتحال میں ہر فرد کے لیے وقتی تقاضوں سے واقفیت اور ہم آہنگی ضروری ہے اگر مناسب وقت پر اس طرف توجہ نہ دی گئی تو ایسے افراد محض کفِ افسوس ملتے رہیں گے۔ نا صرف ان کی شخصیت میں نکھار کے لیے بل کہ اقتصادی اور سماجی ضروریات کے لیے بھی ہر فرد کا وقتی تقاضوں سے واقف ہونا لازم ہے۔ اس حوالے سے ان کے نظریات "موٹر کا سفر"[۲۴۵] میں ملتے ہیں۔ اپنے مضمون "پرسا" میں انھوں معاشرتی اصلاح کے حوالے سے خیالات پیش کیے۔ انھوں نے ہندوستانی معاشرے میں پائے جانے والے توہم کی مذمت کی اور انھیں جدید افکار سے روشناس کروانے کی کوشش کی۔[۲۴۶]

مبارک دلھن نے ہندوستانی معاشرے میں تعلیم نسواں کی ضرورت اور اہمیت واضح کرنے کے لیے بھی اپنے قلم کا سہارا لیا۔ انھوں نے خواتین کی ابتدائی تعلیم کے ساتھ ساتھ اعلیٰ رسمی تعلیم کی اہمیت کو بھی واضح کیا اور ایسے مدارس کے قیام کی تجویز پیش کی جہاں کم از کم چوتھی جماعت تک کے بچے اور بچیاں مخلوط تعلیم حاصل کر سکیں اس سے لڑکیوں کے لیے نئے اور الگ مدارس کے قیام میں ہونے والے خرچ سے بچنے کے ساتھ ساتھ ان میں بہتر سماجی شعور بھی پروان چڑھے گا۔ ان کے مطابق فی زمانہ لڑکیوں اور لڑکوں کو الگ الگ خانوں میں قید کر کے بہتر سماجی شعور و آگہی دینا ناممکن ہے۔ مخلوط تعلیم سے ایک ہی وقت میں قوم کی لڑکیاں اور لڑکے دوش بدوش تعلیمی سفر جاری رکھ سکیں گے اور باہمی مشاورت سے ملک وملت کی بہتری کے لیے کوشاں ہو سکیں گے۔ یوں معلم کے انتظام میں ہونے والے اخراجات میں بھی کمی واقع ہو گی اور نتائج بھی بہتر برآمد ہوں گے "مسلم انجمن گرل اسکول"[۲۴۷] میں اسی فکر کا احاطہ کیا۔ انھوں نے اپنے ایک اور مضمون "غیر تعلیم یافتہ لڑکیوں کی شادی"[۲۴۸] میں بھی خواتین کی تعلیمی ضرورت اور اس کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔

انھوں نے ازدواجی زندگی میں سکون اور باہمی التفات قائم رکھنے کے لیے عورتوں کو اپنے بہترین تجاویز سے نوازا انھوں نے عورت کی ذمہ داریاں بیان کرتے ہوئے اس کے فرائض کے حوالے سے بھی آگہی دی کہ اپنے شوہروں سے بلاوجہ کی ناچاکی اور عداوت کو ہوا دینے کی بجائے محبت کے برتاؤ سے ان کی خوشی کا سامان بہم پہنچائیں تا کہ سماج کا سب سے بنیادی جزو کسی انتشار کا شکار نہ ہونے پائے۔ اس حوالے سے ان کے مضمون "گھر کی ملکہ"[۲۴۹] میں خاطر خواہ معلومات پیش کی گئی ہیں۔

مبارک دلھن نے ہندوستانی معاشرے میں پائی جانے والی فضول رسومات کے خاتمے کے لیے بھی اپنے نظریات کی عکاسی کی۔ اپنے مضمون "قانوناً شادیوں میں اصلاح کی ضرورت"[۲۵۰] میں انھوں نے ہندوستانی معاشرے میں رائج ان فرسودہ رسومات کا تذکرہ کیا ہے جو وقت اور پیسے دونوں کے زیاں کا سبب بنتی ہیں۔ انھوں نے قانون ساز اداروں کو اس طرف توجہ دینے کی تلقین بھی کی ہے تا کہ معاشرہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکے۔ انھوں نے ایسی انجمنوں کے قیام کی تجویز پیش کی جو ان رسومات کے خاتمے کا باعث بنیں تا کہ عوام کی فلاح و بہبود ہو سکے۔ "حریت نسواں"[۲۵۱] میں خواتین کی نقل و حرکت اور سماجی میل ملاپ کے فوائد کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

۲۷۔ م۔ ب۔ ش:

م۔ ب۔ ش نے تعلیم نسواں کی حمایت کی اور لڑکیوں کی سماجی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش بہ زور قلم کی۔ ہندوستانی معاشرے میں صنفی امتیاز اور خواتین کے ساتھ رکھے جانے والا ناروا سلوک کو ہدف تنقید بنایا۔ ایسے

سماجی مسائل کے حوالے سے خواتین کو باشعور بنانے کی کوشش کی جو انھیں ان کے بنیادی انسانی حقوق سے محروم رکھتے ہیں جن میں سر فہرست ازدواجی زندگی سے متعلقہ مسائل ہیں۔ انھوں نے شادی کے وقت لڑکی کی پسند اور نا پسند کے اختیار کو اسلام کی رو سے واضح کیا اور اس حوالے سے نبی اکرمؐ کے فرمان کے مطابق لڑکیوں کی پسند ناپسند کے موضوع پر اپنے نظریات پیش کیے۔ اس کی مثال ان کے مضمون "بے زبان لڑکیاں"[۲۵۲] میں ملتی ہے۔

۳۷۔ محمدی بیگم :

محمدی بیگم اپنے دور کا ایک باشعور حوالہ ہیں، انھوں نے نو آبادیاتی ہندوستان میں خواتین کے مسائل کو نا صرف سمجھا بل کہ اپنے شوہر کے دوش بدوش انھیں حل کرنے کی سعی بھی کی۔ جس کی ایک مثال تہذیب نسواں میں چھپنے والے مضامین ہیں۔ انھوں نے خواتین کی رسمی تعلیم کی ضرورت کو سمجھا بل کہ عورتوں کے لیے رائج قدیم نظام تعلیم کے حوالے سے بھی آگہی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس نظام کے مطابق عورتوں کو قرآن و سنت اور مذہبی کتب تک محدود رکھا جاتا تھا جس کی اپنی افادیت تو ہے لیکن یہ نظام وقتی تقاضوں پر پورا اترنے کے لیے ناکافی ہے۔ تہذیب نسواں کی مصنفین نے یہ کوشش کی کہ قرآن و سنت کے ساتھ ساتھ عورت کو اس قابل بھی ہونا چاہیے کہ وہ اپنی ذات سے متعلق معاملات کے حوالے سے باشعور ہو اور اس میں دنیاوی تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ یہی مؤقف محمدی بیگم نے بھی اپنایا اور خواتین کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کوششیں کیں۔ انھوں نے اس دور کی خواتین کی فکری آبیاری اور شعور و آگہی کے لیے متعدد مضامین لکھے۔ ان کی کوششوں کے حوالے سے ڈاکٹر حمیرا اشفاق یوں لکھتی ہیں:

> محمدی بیگم ایک تخلیقی اور علمی استعداد رکھنے والی خاتون تھیں، صرف یہی نہیں بل کہ وہ اپنی ہم جنسوں کے مسائل دیکھ دیکھ کر کڑھتی تھیں، ان کے خیال میں یہ مسائل صرف مردوں یا معاشرے کے پیدا کردہ نہ تھے بل کہ وہ ایک گہرے مشاہدے اور تجزیے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی تھیں کہ اگر خواتین خود اپنی کاوش سے اپنی ذہنی اور علمی تربیت کریں تو بہت سے مسائل اسے بچ سکتی ہیں۔ [۲۵۳]

محمدی بیگم نے اپنی تصانیف کے ذریعے ہندوستانی خواتین میں یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش کی کہ روایت کے ساتھ جڑے رہنا کوئی غلط بات نہیں ہے لیکن ان روایات کی اس حد تک پاسداری کرنا کہ کوئی بھی جدید معلومات یا طریقہ کار ان کے اذہان کو متاثر نہ کر سکے یہ غلط ہے۔ انسان کو نئی چیزیں سیکھنی چاہییں اور اتنی لچک رکھنی چاہیے کہ نئے خیالات ان کے ذہن کی آبیاری کر سکیں۔

> عرصہ دراز سے ایک ہی معاشرت پر آنکھیں بند کر کے چلنے نے ہماری آزادی اور قوت ایجاد بالکل مفقود

کر دی۔لائق ترمیم رسومات کو اگر مناسب اصلاح کا رنگ و روغن دے کر رائج کر لیا جائے تو کچھ قباحت نہیں۔اس سے نہ صرف ہماری ذہنی و اخلاقی قوتوں کی ترقی ہو گی بل کہ ہر کام کی اچھائیوں اور برائیوں پر غور کرنے سے ہماری معاشرتی زندگی نشو نما پائے گی۔۔۔۔ آؤ بہنو! ہم بھی رسوم و رواج کے طوق و سلاسل کو توڑ کر ترقی کے میدان میں جست لگائیں۔جو آپ کے لیے ہر وقت کھلا ہوا ہے اور اپنے کارہائے نمایاں سے دوسروں پر اس امر کو بخوبی واضح کر دیں کہ ہندوستانی عورتوں پر جو جہالت اور تاریک خیالی کے اتہام لگائے جاتے ہیں وہ محض بے بنیاد ہیں۔۔۔[۲۵۴]

محمدی بیگم نے اپنے مضامین میں خواتین کی بنیادی ذمہ داری یعنی کہ تربیت اطفال کے حوالے سے خصوصی مضامین لکھے جن میں تربیت اطفال کے حوالے سے خواتین کی خاص تربیت کی گئی اور ماؤں کو یہ باور کروایا گیا کہ وہ اپنے بچے کی ذہنی اور جسمانی نشو نما کرتے ہوئے انھیں سماج اور معاشرے کا ایک اہم شخص بنا سکتی ہیں۔محمدی بیگم نے بچوں کی نفسیات کے مطابق ان کی تربیت کی حمایت کی اور ماؤں کے لیے بچوں کی نفسیات کے مطابق برتاؤ کرنے اور اس کے مسائل کا حل تلاش کرنا ضروری قرار دیا۔[۲۵۵]

محمدی بیگم نے مستورات میں یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش بھی کی کہ وہ اپنی اور دوسرے کی عزت نفس کو مجروح نہ ہونے دیں اور نہ کریں۔ہر انسان کے لیے اس کی عزت نفس کل اثاثہ ہوتا ہے اس لیے ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے،دوسرا یہ کہ کسی بھی کامیابی کے بعد خود کو بہت بہترین سمجھ لینا کسی طور مناسب نہیں اس ضمن میں وہ دنیا کی اہم ترین شخصیات کی مثال دیتے ہوئے باور کرواتی ہیں کہ جو شخص بحیثیت انسان جتنا بلند قامت ہو گا وہ اتنا ہی عاجز اور منکسر المزاج ہو گا اس لیے ضروری ہے کہ ہم تمام تر مراحل کو عجز و انکساری کے ساتھ طے کرتے ہوئے آگے بڑھیں۔اس حوالے سے وہ یوں لکھتی ہیں:

سیلف ریسپیکٹ جس پاک جذبے کا نام ہے۔اس کی میں دل سے قدر دان ہوں۔اور اس کو روح کی آزادی کا ایک ضروری جزو سمجھتی ہوں۔اور آزادی کی نسبت ایک دانا شخص کا خیال ہے کہ بغیر کسی کو نقصان پہنچائے آزادی اور اپنی خوشی پر چلنا ہر شخص کا حق اور فرض ہے لیکن غرور سے اس کو کوئی نسبت نہیں۔[۲۵۶]

چار دیواری میں رہتے ہوئے ذریعہ معاش کی تلاش تا کہ خواتین اقتصادی طور پر بھی مضبوط ہو سکیں۔محمدی بیگم نے ۱۸۹۸ سے لے کر اپنی وفات ۱۹۰۸ تک تہذیب نسواں کی ادارت کی۔

۴۷۔م۔رخ بدایونی:

م۔رخ بدایونی نے اپنے مضامین میں ہندوستانی خواتین کی تربیت کرتے ہوئے یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ مغرب کی چکا چوند سے خود کو خیرا کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔اصل کامیابی اور اطمینان اپنی روایات،اپنی

تہذیب اور کلچر سے جڑے رہنے میں ہے۔ انھوں نے ہندوستانی خواتین پر یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ جن مغربی خواتین کی وہ تقلید کرنا چاہتی ہیں ان میں بعض ان کی تہذیب پر رشک کرتی ہیں وہ یورپین لیڈیاں بھی ہندوستانی پردے کے رواج، یہاں کے لباس، طرز معاشرت سے کسی حد تک متاثر ہیں۔ جب کہ ہندوستانی خواتین اپنے ہی اطوار اور رسوم ورواج پر نادم ہوتی ہیں۔ انھوں نے یہاں کی خواتین میں یہ احساس پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ باہر کی روشنی سے ان کی نظریں چندھیا گئیں انھیں چاہیے کہ کھلی آنکھوں سے اپنے گرد و نواح کا موازنہ کریں۔ کسی بھی تہذیب کے زیر اثر آنے سے پہلے اس کے اچھے برے تمام پہلوؤں پر نظر دوڑا لینی چاہیے۔ اول تو اپنی تہذیب کو کبھی قدیم اور فرسودہ نہیں سمجھنا چاہیے لیکن اگر کبھی ایسا محسوس ہو بھی جائے تو یہ دیکھنا چاہیے کہ ہماری قدامت پرستی کہیں نہ کہیں ان کی جدیدت سے اب بھی کہیں بہتر ہے۔

۷۵۔ مریم بائی:

مریم بائی نے خوش خلقی اور بہتر طرز زندگی کے حوالے سے اپنے خیالات کی پیشکش کی۔ انھوں نے انسانی رشتوں کی مضبوطی کی بنیاد باہمی محبت، اخلاص اور حسن اخلاق کو قرار دیا۔ ان کے نزدیک انسان کو سماج میں رہتے ہوئے دوسرے انسانوں کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ اپنے عزیزوں اور دوستوں سے اچھا سلوک رکھیں۔ یہاں انھوں نے اس امر پر بھی اظہار خیال کیا کہ یہ رشتے محض مطلب پر مبنی نہیں ہونے چاہیے بل کہ خلوص سے نبھائے جانے چاہیں اور نئے رشتوں کے بنانے میں پرانے رشتوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ان افکار کی ترسیل انھوں نے اپنے مضمون "دوستی"[۲۵۷] میں کی۔

۷۶۔ مسز برلاس:

مسز برلاس نے اپنے مضامین کے ذریعے ہندوستانی خواتین کو تعلیم کی اہمیت اور افادیت کے بارے میں آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ اس حوالے سے انھوں نے سلسلہ وار مضمون "پرئمری تعلیم" کے عنوان سے لکھا۔ تعلیم کے ضمن میں بالخصوص پرئمری تعلیم کے حوالے سے انھوں نے اقوام عالم کی ان خواتین کی مثالیں پیش کیں جو تعلیم کے حصول سے اپنی زندگیوں کو بہتر بنانے میں مصروفِ عمل ہیں۔ انھوں نے ہندوستانی عورتوں کو یہ تحریک دی کہ اپنے بنیادی حق کو معاشرتی جبر کی نذر نہ ہونے دیں بل کہ اس کے لیے خود کمربستہ ہوں اور تعلیمی سہولتوں بہرہ مند ہو کر اپنے اذہان کو روشن کریں۔ "پرئمری تعلیم"[۲۵۸،۲۵۹] کے عنوان سے دو مضامین اسی سلسلے کے مضامین ہیں۔

انھوں نے نا صرف تعلیمی میدان میں بل کہ ہر شعبہ زندگی میں ہندوستانی عورتوں کو آگے بڑھنے کی تلقین

کی۔ انھوں خاص طور پر جاپانی عورتوں کی مثالوں سے ہندوستانی عورت کو متحرک کرنے کی کوشش کی کہ اپنے حقوق کے حصول کے لیے ان کی کوششوں سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھائیں۔ اپنی ایک تقریر میں انھوں نے اس بد قسمتی کا اظہار بھی کیا کہ ہندوستانی عورتیں ہر قوم کی عورتوں سے ہر شعبہ زندگی میں پیچھے ہیں حالاں کہ خدا نے تمام انسانوں کو ایک سی صلاحیتیں دے کر پیدا کیا ہے لیکن ہندوستانی عورت کو ابھی اپنی اہمیت اور اپنی صلاحیتوں کا بہتر ادراک ہی نہیں ہو سکا اسی لیے وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہیں۔ انھوں نے مستورات میں یہ شوق پیدا کیا کہ سماجی میل جول بڑھا کر اپنے شعور و آگہی میں اضافہ کریں۔"[۲۶۰]

۷۷۔ مسز حامد علی:

مسز حامد علی نے اپنی تصنیف کے ذریعے خواتین میں یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ تعلیم کے حصول کے بعد وہ اپنی روایات اور مذہبی تعلیمات کو مت بھولیں بل کہ ان جواہر کو اگر جدید تعلیم کے ساتھ لے کر چلیں تو دنیا و آخرت میں بھلائی کے ساتھ ساتھ معاشرے میں بھی عزت پائیں گی۔ انھوں نے اس مسئلے پر بھی بات کی ہے کہ تعلیم انسان کی شخصیت کو سنوارنے کے لیے ہوتی ہے جب کہ جدید تعلیم سے مستفید ہو کر لڑکیاں بجائے اس کے کہ باشعور ہوں ان میں عجیب نوعیت کا گھمنڈ آ جاتا ہے اور وہ اپنی رسوم و روایات سے لے کر مذہبی تعلیمات تک سے انحراف چاہتی ہیں جو کہ سراسر غلط ہے۔ اور یہ رویہ آئندہ آنے والی لڑکیوں کی تعلیم و ترقی میں رکاوٹ بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ اس فکر کا اظہار ان کی تصنیف "ہماری موجودہ تعلیم"[۲۶۱] میں ہوتا ہے۔

۷۸۔ مسز داؤد الرحمن:

مسز داؤد الرحمن نے ہندوستانی خواتین کے معاملات و مسائل کو اچھے طریقے سے بیان کیا ان کے نزدیک ہندوستانی عورت کے ساتھ ہمیشہ ایسا برتاؤ کیا جاتا ہے کہ شاید وہ کسی کے سہارے کے بنا کوئی کام نہیں کر سکتی اور وہ سہارا ہمیشہ سے کبھی باپ، کبھی بھائی، کبھی شوہر کی شکل میں مرد کا ہی سہارا ہوتا ہے۔ لیکن تقدیر کے ہاتھوں مجبور عورت کا اگر شوہر مر جائے اور وہ رنڈاپے کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائے تو کوئی بھی اس کا پرسان حال نہیں ہوتا اور اس کی زندگی مزید ابتری میں گزرتی ہے۔ اس لیے ہمیں خواتین کو کم از کم اتنا تو خود مختار کر دینا چاہیے کہ وہ تقدیر کے ہاتھوں کسی مجبوری کو جھیلنے سے پہلے ہی کسی انسان کی مرہون منت نہ ہو۔ اسے اختیار دینا چاہیے تا کہ وہ مشکل کی گھڑی میں اپنی گزر اوقات کر سکے۔ زندگی گزارنے کے لیے اسے کسی کی طرف نہ دیکھنا پڑے۔ ان کے مضمون "ایک نوید قومی خواتین کے لیے"[۲۶۲] میں ان افکار کی ترسیل کی گئی ہے۔ اس مضمون میں خواتین کی عام گھریلو زندگی، تعلیمی زندگی اور سماجی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے ہدایات فراہم کی گئی ہیں۔[۲۶۳]

۷۹۔ مسز سید احمد مچھلی شہری:

مسز سید احمد کا شمار بھی تہذیبِ نسواں میں لکھنے والی باشعور مصنفین میں ہوتا ہے۔ جو اپنے عہد کے تمام تر حالات و واقعات، خواتین کو درپیش مسائل اور ان کے سدِ باب سے بخوبی واقف تھیں۔ انھوں نے اپنے عہد کے مسائل اور اس سماج کے عام مردانہ فکری رویوں کو سمجھتے ہوئے خواتین کی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کی اور ایسے موضوعات پیش کیے جن سے سبق لے کر بنا کسی رکاوٹ کے ہندوستانی عورت کی حالت بہتر بنائی جا سکے۔ وہ ہندوستان کی خواتین کی بہتری کی خواہاں ہیں لیکن اس کے لیے انھوں نے سماج سے مخالفت کی بجائے مفاہمت کا راستہ اختیار کیا۔ اور وقتی تقاضوں کے مطابق حالات کو بہتر بنانے کی سعی کی۔

مسز سید احمد مچھلی شہری نے ہندوستانی سماج میں رائج پردے کی غیر شرعی سختی کی مخالفت کی اور اس حوالے سے بھی اپنے خیالات پیش کیے لیکن مستورات کی ترقی اور وقتی تقاضوں کے پیش نظر پردے کو یکسر ترک کر دینے کی مخالفت بھی کی۔ ان کے مطابق اسے اسلامی شعار کے مطابق اپنانا چاہیے اور ضرورت کے تحت اس سے کام لینا چاہیے۔ اس وقت جب عورت کو اس کے بنیادی حقوق کے حصول کی جدوجہد کا آغاز کرنا ہے اس صورت میں اگر پدر سری سوچ کی کھلم کھلا مخالفت کی گئی تو اندیشہ ہے کہ خواتین کو کڑی تنقید اور متعدد مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ حالات سے مفاہمت اختیار کرتے ہوئے خراماں خراماں اپنے مقاصد کے حصول کی کوشش کی جائے۔ اس ضمن میں وہ پردے کے نظام کے متعلق اپنے افکار کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہیں:

> میرے خیال میں پردے کو بالکل نیست و نابود کر دینا کسی طرح عقل مندی کی بات نہیں۔ اس میں بہت ترمیم کی ضرورت ہے۔ جس تشدد کے ساتھ ہمارے ملک اور خصوصاً یوپی میں پردہ رائج ہے۔ اس کا خواتین کی صحت اور معاشرتی زندگی پر بہت برا اثر پڑ رہا ہے۔ ان کی تندرستی خراب ہو رہی ہے اور وہ باوجود ہاتھ پاؤں کے بے دست و پا بنی ہوئی ہیں۔ اور ذرا ذرا سی باتوں میں دوسروں کی محتاج رہتی ہیں۔"[۲۶۴]

انھوں نے جہاں پدر سری مردانہ معاشرے پر تنقید کی وہیں عورتوں کو بھی چند ضروری ہدایات دیں تاکہ وہ اپنی نادانی میں کسی ایسے مسئلے کا شکار نہ ہو جائیں جو ان کے ادراک اور فہم و فراست کی راہ میں رکاوٹ بن رہا ہو۔ انھوں نے اپنی فکر اور طرز عمل سے خواتین کو باشعور بنانے کی کوشش کی اور انھیں فرسودہ خیالات اور توہم جیسی برائیوں سے باز رہنے کی تلقین بھی کی۔ اس فکر کا احاطہ ان کے مضمون "جہالت اور توہم پرستی"[۲۶۵] میں کیا گیا ہے۔

انھوں نے ہندوستانی مستورات کے لیے جدید تعلیمی سہولیات کی فراہمی کی ضرورت کو بھی اجاگر کیا۔ اس ضمن میں انھوں نے مسلمان خواتین کے لیے ایسے مدارس کے قیام کی تجویز پیش کی جہاں وہ آزادانہ بنا کسی روک

ٹوک اور سماجی دباؤ کے اپنی فکری آبیاری کر سکیں۔ اس حوالے سے انھوں نے اسکول اور کالجوں کے قیام کی ضرورت کو سراہااور مسلمانوں کی معاشی حیثیت کو مد نظر رکھتے ہوئے ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطح پر اداروں کے قیام کے لیے تجاویز بھی پیش کیں۔ اس فکر کا اظہار "علی گڑھ میں مسلم خواتین کے لیے ڈگری کالج کا قیام"[۲۶۶] سے ایک رپورٹ میں کیا گیا ہے۔

۸۰۔ مسز ضیاالحسن:

مسز ضیاالحسن نے نو آبادیاتی ہندوستان میں خواتین کے لیے کیے گئے تعلیمی انتظامات کو موضوع بنایا۔ ان کے مطابق خواتین کو مذہبی تعلیم دینے کے لیے دینی مدارس کا قیام بہت ضروری ہے۔ اپنے مضمون "مذہبی تعلیم"[۲۶۷] میں انھوں نے اسی مسئلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے باقاعدہ مدارس کے قیام کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔
مسز ضیاالحسن نے بھی اپنی تحریروں میں ہندوستانی نظام میں رائج جبری پردے کی رسم کی مذمت کی۔ انھوں نے ذاتی احوال اور تجربات کے بیان سے غیر شرعی پردے کے نقائص اور خواتین کی محکومیوں کا تجزیہ اپنے مضمون "پردہ اور ہم"[۲۶۸] میں کیا۔ اسی کا سلسلہ وار مضمون تہذیب کے مختلف شماروں کی زینت بنا۔ جس میں انھوں نے شرعی پردے کی اہمیت اور غیر شرعی پردے کی سختی کے نقائص بیان کیے۔ ان کے مطابق ضرورت کے وقت ہر کام اور ہر چیز اچھی لگتی ہے اگر عورت باحیا ہے تو برقع نہ اوڑھ کر بھی باپردہ ہی ہے۔ ان کے نزدیک بے حیائی میں پردہ بھی بے پردگی کے زمرے میں آتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق اپنی نگاہ نیچی رکھ کر، مناسب ستر پوشی کر کے مذہبی پردے کی رسم کو نبھایا جائے اور غیر شرعی ہندوستانی پردے سے قطع تعلق اختیار کی جائے۔[۲۶۹]

۸۱۔ مسز محمود:

انھوں نے آزادی نسواں کے حوالے سے معاشرتی حدود و قیود کو نظر انداز نہیں کیا بل کہ انھی کے اندر رہتے ہوئے اپنی ذات کو نکھارنے پر زور دیا۔ اس کی ایک مثال ان کے مضمون "طلسم آزادی"[۲۷۰] میں ملتی ہے۔

۸۲۔ مسز ملک صاحبہ:

تہذیب نسواں میں جہاں خواتین کی تعلیم کی حمایت کی گئی وہاں انھیں یہ بھی سکھایا گیا کہ ان کا مقصد محض حصول تعلیم نہیں ہونا چاہیے۔ وہ تعلیم کی اوٹ میں اپنے فرائض سے کوتاہی نا برتیں۔ مسز ملک نے اپنے مضمون "مغربی تعلیم کا اثر"[۲۷۱] میں اسی موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ انھوں نے لڑکیوں کو یہ تلقین کی ہے کہ تعلیم حاصل کر کے وہ خود کو اپنے فرائض سے سبکدوش مت سمجھیں بل کہ انھیں چاہیے کہ وہ اور اچھے طریقے سے اپنے فرائض سر انجام دیں تا کہ خواتین کی تعلیم کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ آنے پائے۔ انھوں نے اس مضمون میں یہ بھی

بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستانی خواتین کو لگتا ہے کہ مغربی خواتین محض لباس، بناؤ سنگھار اور سیر و تفریح میں مشغول رہتی ہیں اس لیے وہ بھی اسی ڈگر کو اپنانا چاہتی ہیں حالاں کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اس حوالے سے وہ یوں رقمطراز ہیں:

> ۔۔۔۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ آج کل لڑکیاں تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود امور خانہ داری میں دل چسپی نہیں لیتیں۔ مغربی عورتوں کی بابت یہ خیال کرنا غلط ہوگا۔ کہ "وہ گھر کا خیال نہیں رکھتی ہیں" حقیقت یہ ہے کہ ہر کام کے لیے ان کا وقت مقرر ہے۔ وہ گھر اور بچوں کی تربیت میں دلچسپی لینے کے علاوہ سیر و تفریح کو بھی ضروری سمجھتی ہیں۔ [۲۷۲]

مسز ملک نے اپنی تحریر کے ذریعے مستورات کے اولین فرائض کی انجام دہی کی طرف اشارہ کیا ہے جو وہ بھلا بیٹھی ہیں۔

۸۴۔ م۔ ظ۔ ا:

م۔ظ۔ا نے اپنے مضامین میں ہندوستانی عورت کی سماجی حالت کو موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے سماجی نظام اور اس سے در پیش مسائل کا ذکر کرتے ہوئے یہ باور کروانے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستانی عورت کی سب سے بڑی رکاوٹ معاشرہ ہے اور پھر وہ افراد ہیں جو حقوق نسواں کو محض اس لیے نظر انداز کر دیتے ہیں کہ کہیں شعور و آگہی کے بعد وہ ان کے پنجہ استبداد سے باہر نہ نکل جائیں۔ اور وہ سماجی ڈھانچا تحس نحس نہ ہو جائے جس کی تشکیل انھوں نے محض اس طبقے کو کمزور ثابت کرنے کے لیے کی تھی۔

م۔ظ۔ا نے عورت کے ان حقوق کی بات کی جو اسلام نے اسے دے رکھے ہیں اور جن پر مذہبی اجارہ دارا اور سماجی عہدہ داران ایسے مسلط ہیں کہ عورت کو اپنا واحد مقصد حیات مرد کی تفنن طبع، دلجوئی اور خدمت محسوس ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کوئی قدم اٹھائے تو بری عورت کی مہر ثبت کر دی جاتی ہے۔ اپنے مضمون "مظلوم فرقہ" میں وہ یوں رقمطراز ہیں:

> کیا وجہ ہے کہ جو حقوق خدا نے اور اس کی شریعت نے عطا کیے ہیں۔ اس سے فائدہ نہ اٹھایا جائے اور ان کے حاصل کرنے کی کوشش نہ کی جائے؟ اس قسم کے لوگوں کا شریعت پر عمل بھی کچھ اسی رنگ میں ہوتا ہے، جس میں عورتوں پر ہی ظلم ٹوٹے۔ بیوی میں ذرا سا نقص ہوگا تو جھٹ بہانہ بنا کر دوسری بیوی کرنے کو تیار ہو جائیں گے اور اسے اف کرنے کی اجازت بھی نہ ہوگی۔ پردے کی پابندی دیکھیے کہ بیوی کا برقعہ بھی کوئی دیکھنے نہ پائے خواہ آپ غیر عورتوں کو جھانکتے پھریں۔ یہ ہے اکثر بیویوں کی حالت اور مردوں کا انصاف۔۔۔ [۲۷۳]

یہاں انھوں نے ان عورتوں کو بھی تنبیہ کی ہے کہ اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کریں اور مذہب کے حوالے سے معلومات حاصل کریں تاکہ اپنی زندگی بہتر طور پر گزار سکیں۔

۸۴۔ن۔ب:

تہذیب نسواں کے اجرا کے مقاصد میں ایک اہم مقصد تعلیم نسواں کا فروغ تھا۔ اس مقصد کو مد نظر رکھتے ہوئے ایسے مضامین لکھے گئے جو خواتین ہندوستان کی تعلیمی ترقی کی راہ ہموار کر سکیں۔ ن۔ب نے اسی مقصد کو مد نظر رکھتے ہوئے فروغ تعلیم نسواں کے لیے عملی اقدامات کیے اور تعلیم نسواں کی حمایت کی۔ [۲۷۴اور۲۷۵]

۸۵۔نذر سجاد حیدر:

نذر سجاد حیدر اردو ادب کا ایک اہم حوالہ ہیں جنھوں نے اپنی تخلیقی سرگرمیوں کا آغاز اس دور میں کیا جب خواتین کے لیے لکھنے پڑھنے کے مواقع بہت کم تھے، ایسے میں انھوں نے ناصرف اپنے نظریات کی عکاسی کی بل کہ خواتین کی تعلیمی ضروریات اور سماجی معاملات کے حوالے سے انھیں باشعور بنانے کی کوشش بھی کی۔ انھوں نے افسانوی اور غیر افسانوی دونوں اصناف نثر میں اپنے نظریات کی عکاسی کی۔ اپنی تحریروں میں انھوں نے ہندوستان کے طرز معاشرت اور رسوم و رواج کو خاص طور پر موضوع بنایا اور سماجی مسائل پر اپنے خیالات کا برملا اظہار بھی کیا۔

انھوں نے تعلیم نسواں کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار سلسلہ وار مضامین کے ذریعے کیا۔ ان کے مطابق تعلیم لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لیے یکساں ضروری ہے۔ زندگی کی بہتر بسر اوقات کے لیے تعلیم کی اہمیت کے حوالے سے "تعلیم نسواں" [۲۷۶] میں انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

نذر سجاد حیدر نے جن معاملات کے حوالے سے خواتین کی تربیت کی ان میں سرفہرست نو آبادیاتی دور میں رائج پردے کا تصور تھا۔ انھوں نے خواتین کو اس حوالے سے باشعور بنانے کی کوشش کی کہ ہندوستانی سماج میں رائج نظام پردہ اسلامی تصور پردہ سے یکسر مختلف ہے۔ اسلام نے کہیں بھی عورت کو مقید رکھنے اور معلومات کے دروازے ان پر بند رکھنے کے احکامات نہیں دیے، بل کہ انھیں غور فکر کر کے اپنی زندگیاں بہتر بنانے کی تلقین کی ہے۔ انھوں نے ہندوستانی نظام میں رائج پردے کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا اور یہ باور کروایا کہ یہاں کا پردہ محض عورت کی محکومی سے متعلق ہے۔ اس کی اصل روح اسلامی شعار کے مطابق نہیں ہے۔ انھوں نے خواتین کو پردے اور چار دیواری کے باہر کی دنیا میں کھل کر سانس لینے اور شعور ذات حاصل کرنے کی ترغیب بھی دی۔ ان کے مطابق اقوام عالم کی خواتین ایسی جبری پابندیوں سے آزاد ہو کر اپنی فکر کو تقویت دینے میں مگن ہیں تو ہندوستانی عورت بھی

اس بات کا حق رکھتی ہے کہ جدید رجحانات سے واقف ہو سکے۔ ان کے مضمون "پردہ"[۲۷۷] میں اس فکر کی عکاسی کی گئی ہے۔

"پہاڑ پر پردہ"[۲۷۸] میں وہ ہندوستانی معاشرے کے مختلف طبقوں میں رائج پردے کے مسائل کو زیر بحث لائی ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ہندوستانی معاشرے کے دوسرے رخ کو بھی ہدف تنقید بنایا ہے جو بالکل مغرب پرست ہو کر رہ گیا ہے اور اپنی روایات کو قطعاً در خور اعتنا نہیں جانتا۔ ان کی بیبیاں بے دریغ انگریزوں اور دیگر لوگوں سے مل رہی ہیں۔ اپنے مضمون "حریت نسواں"[۲۷۹] میں انھوں نے ہندوستانی مرد کی سوچ کی عکاسی کی ہے ۔ان کے مطابق ہندوستانی اپنی مصروفیت کے باعث نہ خود گھر کے معاملات پر توجہ دیتا ہے اور نہ ہی کسی ضرورت کی تکمیل کے لیے عورت کو یہ آزادی دیتا ہے کہ وہ گھر سے باہر جا کر اپنے معاملات درست کر سکے۔ اس ضمن میں روزمرہ استعمال کی اشیا کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ عورت چھوٹی سے چھوٹی چیز کے حصول کے لیے مرد کی منتظر رہتی ہے کہ وہ اپنے فرصت کے اوقات میں اسے ضرورت کی اشیا لا دے تو وہ اپنا کام مکمل کر سکے۔ نذر سجاد نے ایسی صورت میں عورت کی سخت قید کو ہدفِ تنقید بنایا ہے اور اس حبس دوام سے نجات کی تجویز دی ہے۔ انھوں نے عورت کو اتنا بلند حوصلہ ہونے کی تلقین کی ہے کہ وہ اپنی بات منوانے کی ہمت جتا سکے۔ انھوں نے ہندوستانی معاشرے میں رائج پردے کی سختی کو ایک جیل میں قید کی مانند قرار دیا ہے اور مردوں کو خواتین کی آزادی کا عندیہ بھی دیا ہے۔ انھوں نے مردوں کو یہ باور کروانے کی کوشش کی ہے ک اگر وہ عورت کو خود مختار کریں گے تو ان کے اپنے بہت سے معاملات سدھر جائیں گے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی ان کا ایک اور مضمون ہے جس میں انھوں نے عورت کو خود اعتمادی پیدا کرنے کی تلقین کی ہے۔[۲۸۰]

اسی طرح شادی بیاہ کے معاملات کے حوالے سے بھی وہ اس خیال کی حامی نظر آتی ہیں کہ عورت اور مرد کی باہمی رضامندی کے ساتھ ساتھ ہم خیالی بھی بہت ضروری ہے۔ اگر دونوں کے نظریات میل نہیں کھاتے ہوں گے تو ان کی زندگی دوبھر ہو جائے گی۔ اسی فکر کا احاطہ ان کے مضمون "میاں بیوی کے تعلقات"[۲۸۱] میں کیا گیا ہے۔

۸۶۔ نفیس دلہن:

نفیس دلہن فروغ تعلیم نسواں کے حوالے سے ایک اہم نام ہیں۔ انھوں نے تعلیم نسواں اور اصلاح نسواں کے حوالے سے اہم ترین خدمات انجام دیں۔ وہ آل انڈیا مسلم لیڈیز کانفرنس کی آنریری سیکریٹری بھی رہیں۔ وہ ہندوستانی خواتین کو باشعور بنانا اور وقتی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا چاہتی تھیں۔ ان کا پہلا مضمون "ہمیں تو یہ طریقہ پسند نہیں" کے عنوان سے ۱۹۰۵ء میں تہذیب نسواں میں شائع ہوا۔ ان کی تحریروں میں اصلاح نسواں کا پہلو

نمایاں ہے۔

نفیس دلھن نے ہندوستانی خواتین کو معاشرتی اصلاح کے لیے اپنی خدمات سر انجام دینے کے لیے ابھارا۔ انھوں نے خواتین کی تعلیم وترقی کے لیے با اثر خواتین کو یہ تحریک دلانے کی کوشش کی کہ اگر ہر عورت اپنی ذمہ داری سمجھ کر ملکی خدمت پر کمر بستہ ہو جائے تو کم وقت میں ملکی صورت حال بہتر ہو سکتی ہے اور وہ خواتین جو اب تک نجی معاملات میں الجھی ہوئی دنیا و مافیہا سے بے پرواہیں انھیں ان کے حقوق دلانے کے لیے اقدامات کیے جا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے ہندوستان میں مختلف انجمنوں کے تحت ہونے والے اجلاس کی کارروائی کو رپورٹ کی شکل میں پیش کیا تا کہ ایسی خواتین جو شعور وادراک تو رکھتی ہیں لیکن اسے برتنے کے لیے کوئی سمت متعین نہیں کر پائیں، انھیں سہولت کے ساتھ اپنے افکار کی ترسیل کا موقع مل سکے۔ انھوں نے ان رپورٹوں میں دیگر خواتین کو اس امر پر ابھارا کہ وہ اپنی دوسری بہنوں کی فلاح و بہبود کے لیے کسی قسم کی کوئی کسر نہ چھوڑیں بل کہ اپنی تمام تر توانائیوں کے مثبت استعمال سے ان کی حالت بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ اس ضمن میں انھوں نے "مسلم لیڈیز کانفرنس علی گڑھ"[۲۸۲] کے عنوان سے اپنے افکار کی ترسیل کی۔

۸۷۔ نفیس فاطمہ:

نفیس فاطمہ نے ہندوستانی عورتوں کی شخصی تربیت کی طرف خاص توجہ دی انھوں نے ان غیر ضروری حرکات وسکنات کو ہدف تنقید بنایا جن کے کرنے سے وہ اکثر خود پریشانی میں مبتلا ہو جاتی ہیں اور اکثر تو کسی تکلیف کا شکار ہو جاتی ہیں۔ انھوں نے خواتین کے اٹھنے بیٹھنے، رہنے سہنے اور دیگر طریقہ کار میں توازن اور وقار کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا تا کہ خواتین اپنی شخصیت کو معمولی تبدیلی سے بہتر بنا سکیں۔[۲۸۳]

۸۸۔ و۔ا:

و۔ا نے مغرب و مشرق دونوں معاشروں میں موجود تصورات و نظریات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ انھوں نے ان جدید تقاضوں کو برتنے کی حمایت کی جو مشرقی معاشرے میں بگاڑ اور عدم توازن کا باعث نہ بنیں۔ انھوں نے جدید ضروریات زندگی اور طرز زندگی کو اپنانے کی حمایت تو کی، لیکن ان کی تمام تر توجہ اپنی روایات سے جڑے رہنے پر موقوف رہی۔ و۔ا نے خواتین کی ذہنی تربیت کے ساتھ ساتھ گھریلو معاملات سے متعلق مضامین بھی تحریر کیے۔

و۔ا خواتین کی تعلیم کے حق میں تو تھیں لیکن انھوں نے خواتین کی رسمی تعلیم کو سخت ناپسند کیا۔ ان کے نظریات بھی دیگر ہندوستانیوں سے میل کھاتے تھے جو خواتین کو گھر سے باہر جا کر تعلیم دلوانے کے خلاف تھے۔ ان کے نزدیک خواتین کا گھر سنبھالنا، بچے کی پرورش اور معمولی لکھنا پڑھنا کافی تھا اس نظریے کی حمایت میں وہ لکھتی

ہیں کہ:

> ابھی حال میں ایک تہذیبی بہن سے ملاقات ہوئی ان کی بھی سات برس کی لڑکی کو دیکھا۔ماشااللہ سب طرح اپنی عمر کے لائق تعلیم وتربیت پائی ہوئی ہے۔قرآن شریف ختم کر چکی ہے۔خط لکھتی پڑھتی ہے۔حساب میں بھی کچی نہیں معلوم ہوتی۔فارسی پڑھ لیتی ہے۔۔۔۔گھرداری میں ماں کا ہاتھ بٹانا،سب سے تمیزداری سے پیش آنا،غرض اس کی کسی بات سے یہ ضرورت نہیں محسوس ہوتی تھی کہ اسے اسکول بھیجا جائے۔اگر ہم لوگ چار حرف پڑھ کر اپنی اولاد کو نہ سنبھال سکے اور یہ عذر کر دیا کہ ہمیں فرصت نہیں تو پھر اور کون سا کام کریں گے؟۔۔۔[۲۸۴]

ان کے نزدیک عورت کا واحد مقصد اپنی اولاد کی تربیت ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے کوئی روزی روٹی کا بندوبست نہیں کرنا ہوتا۔[۲۸۵]

ان کی تحریروں کی روشنی میں دیکھا جائے تو و۔اصاحبہ خواتین کے لیے صرف اتنا ہی باشعور ہونا ضروری سمجھتی ہیں کہ عورتوں کو شعور باری تعالیٰ ہو جائے،وہ اپنے فرائض کو اچھی طرح سے سمجھ لیں اور ان سے روگردانی نہ کریں اور اپنی زندگی کو خوش اسلوبی سے اپنے شوہر اور گھر والوں کی مرضی سے گزارنے کے قابل ہو جائیں۔

و۔انے اسلامی قوانین کے مطابق طلاق اور خلع کے مسئلے کو بھی بیان کیا ان کے مطابق ملا جو مذہب کے علمبردار بن بیٹھے ہیں انھوں نے عورت سے یہ آزادی چھین لی ہے اور اسلامی قوانین کو بھی مسخ کر کے پیش کیا ہے جس کی وجہ سے مرد کو عورت کا استحصال کرنے کی مزید جرات مل جاتی ہے جب کہ اصل قانونِ اسلامی میں عورت کو اس طرح باندھ کر رکھا جانے کا کہیں نہیں کہا گیا۔اسے بھی زندگی کے معاملات اور شادی کے اور طلاق کے اختیارات سونپے گئے ہیں۔ان کے مضمون "تفویض"[۲۸۶] اور "بڑھتے چلو"[۲۸۷] میں اس سے متعلق تفصیل ملتی ہے۔

اسی طرح اپنے ایک مضمون "ہنسیے مت"[۲۸۸] میں وہ ان خواتین کی اخلاقی تربیت کرتی نظر آتی ہیں جو اپنی محدود معلومات اور کم فہمی کی بنا پر دوسروں کو تنقید کا نشانہ بناتی اور ان کا تمسخر اڑاتی ہیں۔انھوں نے اول تو اس بات کی سخت مذمت کی خود کو دوسرے سے برتر سمجھتے ہوئے اس کی تحقیر کی جائے،دوم انھوں نے یہ باور کروانے کی کوشش بھی کی کہ اگر دوسرے انسان کو اپنی تنقید کی کسوٹی پر پرکھنا ناگزیر ہے تو اس کی شخصیت کے مثبت پہلوؤں کو دیکھنا چاہیے۔خدا نے ہر انسان میں کوئی نا کوئی ایسی خصوصیت پوشیدہ رکھی ہوتی ہے جو اسے دوسرے سے ممتاز بناتی ہے۔اسی لیے انسان کو دوسروں کی عیب جوئی کی بجائے اس کی شخصیت کے اچھے پہلوؤں کو مدنظر رکھنا چاہیے۔اس سے اس کے اپنے وقار میں اضافہ ہوتا ہے۔دیگر مضامین میں جہیز اور بری کی نمائش"[۲۸۹] اور "سہاگن بیٹی میکے

میں "۲۹۰" شامل ہیں۔

۸۹۔ وحیدہ بیگم:

محمدی بیگم کے انتقال کے بعد تہذیب نسواں کی ادارت کے فرائض مولوی ممتاز علی کی صاحبزادی وحیدہ بیگم نے سرانجام دیے۔ انھوں نے ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۷ء تک باقاعدگی سے مدیر کی حیثیت سے کام کیا اور اصلاح و تعلیم نسواں کی غرض سے متعدد مضامین بھی تحریر کیے۔ انھوں نے بھی خواتین میں شعور و آگہی کے فقدان کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کی تربیت کا کام کیا۔ ان کے زیادہ تر مضامین اصلاحی نوعیت کے ہیں۔

۹۰۔ وحیدہ یعقوب:

وحیدہ یعقوب نے اپنی تحریروں کے ذریعے فروغ تعلیم نسواں کی سعی کی۔ ہندوستانی معاشرے میں تعلیم نسواں کے حوالے سے سماجی رویوں کو مد نظر رکھتے ہوئے وہ خواتین کو تنبیہ کرتی ہیں کہ حصول تعلیم کے بعد اپنے معاملات خراب نہ ہونے دیں بل کہ انھیں مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو انھوں نے خواتین کو وقتی تقاضوں کے مطابق چلنے کی تلقین کی ہے وہ چاہتی ہیں کہ مستورات کسی زعم میں کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں جس سے تعلیم و ترقی نسواں میں خلل پڑے۔ بل کہ مستورات کو اپنے عمل سے یہ ثابت کرنا چاہیے کہ تعلیم نسواں سماجی بہتری اور ترقی کے لیے کس قدر ضروری اور اہم ہے۔

۹۱۔ ہمشیرہ احمد مبین:

انھوں نے دیگر ممالک کی خواتین کے تقابل سے ہندوستانی عورت کو متحرک کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور انھیں سکھایا ہے کہ ایک پڑھی لکھی عورت معاشرے کے لیے کس قدر ضروری ہے۔ ان کے قسط وار مضمون "معاشرت کا اثر" [۲۹۱] اور "تعلیم کیوں چھوڑیں" [۲۹۲] میں اس ضمن میں کافی معلومات ملتی ہے۔

۹۲۔ ہمشیرہ سید آدم:

ہمشیرہ سید آدم نے اپنے مضمون "میاں بیوی کی رنجش" [۲۹۳] میں میاں بیوی کے رشتے کی نزاکتوں کے حوالے سے اپنی افکار کی ترسیل کی۔ انھوں نے اس رشتے کی خوبصورتی ذہنی ہم آہنگی کو قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق جتنی اچھی ہم آہنگی ہوگی اتنا ہی اچھا رشتہ نبھے گا۔ تعلیم یافتہ عورت اپنے رشتے کو اچھے طریقے سے نبھانے کا ہنر جانتی ہے اس لیے عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا بھی بعض اوقات رشتوں کی پائیداری کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ یہاں عورتوں کی تعلیم کا ذکر اس لیے بھی کیا گیا کیوں کہ ہندوستان میں اکثر مرد تعلیم یافتہ تھے اور جب ان کا عقد کسی ایسی لڑکی سے کر دیا جاتا جو جدید تقاضوں سے ناآشنا ہوتی تھی تو ان کی زندگی دوبھر ہو جاتی تھی۔ اسی طرح تربیتِ اطفال اور ازدواجی

زندگی سے متعلق معلومات "کثرتِ اولاد"[۹۴] میں پیش کی گئی ہیں۔

مختصراً دیکھا جائے تو جب جدیدیت کی تحریک نے زور پکڑا تو ہندوستانی معاشرے پر اس کے نمایاں اثرات مرتب ہوئے۔ جدید تعلیمی ترقی کے مباحث چھڑے تو تعلیم نسواں کا موضوع بھی زیر بحث آیا۔ نا صرف تعلیم بل کہ عورتوں کی سماجی زندگی کو بہتر بنانے کی کوششیں کی گئیں۔ عوتوں کی سماجی صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے تعلیم ہی ایک واحد ذریعہ تھا جو انھیں جدید طرز زندگی سے روشناس کروا سکتا تھا۔ لیکن اس سلسلے میں مختلف آرااور رد عمل کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک طبقے نے تعلیم نسواں کی حمایت کی تو دوسرا فرقہ اس کی مخالفت میں بول پڑا۔ اس صورت میں مولوی ممتاز علی، شیخ عبد اللہ، راشد الخیری اور شیخ اکرام جیسے رہنماؤں نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ان مسائل کے حل کی کوشش کی۔تہذیب نسواں کا اجرا اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ اس رسالے کے تحت خواتین میں ان کے حقوق کے حوالے سے شعور و آگہی پیدا کی گئی اور ان حقوق کے حصول کے لیے کوشش کا جذبہ پیدا کیا گیا۔ تعلیم، پردہ، رسوم ورواج، گھر گرہستی اور ایسی کئی بندشیں جو محض انھیں محدود کرنے کے لیے بنائی گئی تھیں انھیں اسلام اور شریعت کی رو سے پرکھا گیا اور اسلام میں عورت کے لیے وضع کیے گئے نظام زندگی کے حوالے سے رہنمائی کی گئی۔ اس مقصد کے تحت بہت سی خواتین مصنفین نے بھی پنے نظریات کی عکاسی کی۔ اور مضامین کے ذریعے خواتین کو فرسودہ رسوم ورواج سے نکالنے کی کوشش کی۔ وہ چاہتی تھیں کہ ہندوستانی خواتین فرسودہ رسوم ورواج کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو کر اپنے لیے ایک ایسا لائحہ عمل تشکیل دیں جو انھیں ذہنی طور پر پختہ کریں بجائے اس کے کہ وہ جدید علوم وفنون سے متعارف ہو کر اپنی زندگیوں کو بہتر ڈگر پر لا سکیں وہ انہی رسوم کی زنجیروں میں جکڑی نظر آتی ہیں۔ اس کے لیے انھوں نے نا صرف خواتین بل کہ سماجی صورت حال کو بھی ان روایات سے نکل کر علم وعقل کو بروئے کار لاتے ہوئے زندگی کو بہتر بنانے کا درس دیا۔ وہ سماجی دائرہ کار میں رہتے ہوئے خواتین کی ذہنی آزادی چاہتی تھیں جس سے وہ آزادانہ اپنی من مرضی کر کے اپنی زندگی کو بہتر طور پر گزار سکیں۔

حوالہ جات

۱۔ ہارون انیس، "فیمنزم اور پاکستانی عورت"، مشمولہ اردو ادب اور تانیثیت، مرتبہ عابد قاضی (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۶ء): ص ۲۵۔

۲۔ ایضاً، ص ۲۵۔

۳۔ سیدہ جعفر احمد، "حقوق نسواں کی عالمی تحریک: ایک اجمالی جائزہ"، مشمولہ تاریخ میں عورت کا مقام، مرتبہ مبارک علی (لاہور: تاریخ پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء): ص ۸۵۔

۴۔ عظمیٰ فرمان فاروقی، اردو ادب میں نسائی تنقید: روایت، مسائل و مباحث (کراچی: سعید پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء)، ص ۱۳۔

۵۔ زاہدہ حنا، عورت زندگی کا زنداں (مضامین)، (کراچی: شہرزاد، ۲۰۰۴ء): ص ۱۵۹۔

۶۔ نسیم آرا، اردو صحافت کے ارتقا میں خواتین کا حصہ (پاکستان: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۸ء): ص ۷۸۔

۷۔ بینا رشید، محمدی بیگم: احوال و آثار، مقالہ برائے ایم فل اردو علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد۔

۸۔ حمیرا اشفاق، "نو آبادیاتی ہندوستان میں حقوق نسواں کا علمبردار: مولوی ممتاز علی"، مشمولہ، جرنل آف ریسرچ (اردو)، شمارہ ۳۱، (جون ۲۰۱۷): ص ۴۳۔

۹۔ ایضاً۔

۱۰۔ تہمینہ عباس، "محمدی بیگم: اردو کی پہلی خاتون مدیرہ"، مشمولہ ایک روزن، ۱۶-۰۳-۲۰۱۷۔

۱۱۔ منیجر، "تہذیب نسواں ۱۹۳۲ میں"، مشمولہ تہذیب نسواں جلد ۳۶، نمبر ۱ (۷ جنوری ۱۹۳۳ء): ص ۴۔

۱۲۔ احمد بیگم، "لڑکیوں سے اجازت شادی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۹، نمبر ۲۱ (۲۲ مئی ۱۹۲۶ء): ص ۳۴۶ تا ۳۴۸۔

۱۳۔ احمد بیگم، "عقد بیوگان"، تہذیب نسواں جلد ۲۶، نمبر ۲۵ (۱۰ نومبر ۱۹۲۳ء)۔

۱۴۔ ایضاً "بچوں کو بہلانا" تہذیب نسواں، جلد ۲۸، نمبر ۱۶ (۱۸ اپریل ۱۹۲۵ء)۔

۱۵۔ ادریس بیگم، "زندہ در گور مخلوق"، تہذیب نسواں جلد ۳۴، نمبر ۳۲ (۸ اگست ۱۹۳۱ء): ص ۸۱۳ تا ۸۱۴

۱۶۔ ایضاً" جلد باز طبائع" تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۳۷،(۱۲ ستمبر ۱۹۳۱ء): ص ۹۳۰ تا ۹۳۱

۱۷۔ ایضاً، "پردہ"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۳۱، شمارہ ۵۱(۲۲ دسمبر ۱۹۲۸ء): ص ۱۲۲۶۔۱۲۲۵۔

۱۸۔ الف۔ف، "مستورات کی نقل و حرکت"، تہذیب نسواں جلد ۲(۲۶ اکتوبر ۱۹۲۳ء): ص ۶۳۹ تا ۶۴۱۔

۱۹۔ امت الوحی، "آزادگی کا الزام پڑھی لکھی لڑکیوں پر"، مشمولہ تہذیب نسواں جلد ۲۸، نمبر ۸(۲۱ فروری ۱۹۲۵ء): ص ۱۱۳ تا ۱۱۴۔

۲۰۔ ایضاً، "اپنی حالت پر افسوس"، تہذیب نسواں جلد ۳۷، نمبر ۴۱(۱۳ اکتوبر ۱۹۳۴ء): ص ۹۷۷ تا ۹۷۹۔

۲۱۔ ایضاً، "لڑکیوں کی تعلیم سے بے پروائی"، تہذیب نسواں جلد ۴۰، نمبر ۱۴(۳ اپریل ۱۹۳۷ء): ص ۳۲۱ تا ۳۲۴۔

۲۲۔ ایضاً، "پردہ کی چند خصوصیات پر نظر"، مشمولہ تہذیب نسواں جلد ۳۱، نمبر ۴۵(۱۰ نومبر ۱۹۲۸ء): ص ۱۰۸۵۔

۲۳۔ ایضاً، "مرد خود مختار ہیں"، تہذیب نسواں جلد ۳۲، نمبر ۴۳(۲۶ اکتوبر ۱۹۲۹ء): ص ۱۰۳۶ تا ۱۰۳۷۔

۲۴۔ ایضاً، "طلاق اور مہر"، تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۴۵(۱۱ نومبر ۱۹۳۳ء): ص ۱۰۸۹ تا ۱۰۹۱۔

۲۵۔ ایضاً، "گلا گھونٹ نکاح"، تہذیب نسواں جلد ۳۵، نمبر ۳۹(۲۴ ستمبر ۱۹۳۲ء): ص ۹۱۹۔

۲۶۔ ایضاً، "پردہ"، تہذیب نسواں جلد ۴۰، نمبر ۴۲(۱۶ اکتوبر ۱۹۳۷ء): ص ۹۸۹ تا ۹۹۱۔

۲۷۔ ایضاً، "پردے کی وجہ سے بچت"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۳۰، شمارہ ۳۷(۱۰ ستمبر ۱۹۲۷ء): ص ۷۵۲-۷۵۰۔

۲۸۔ ایضاً، "پردہ"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۳۱، شمارہ ۵۰(۱۵ دسمبر ۱۹۲۸ء): ص ۱۲۰۲۔۱۲۰۱۔

۲۹۔ ایضاً، "حریت و آزادی نسواں"، تہذیب نسواں جلد ۴۰، نمبر ۲۹(۱۷ جولائی ۱۹۳۷ء): ص ۶۸۱ تا ۶۸۴

۳۰۔ ایضاً، "ظلم بے کساں"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۱۷، شمارہ ۴۴(۳۱ اکتوبر ۱۹۱۴ء): ص ۵۲۳۔۵۲۲

۳۱۔ ام کلثوم، "قصور وار کون"، تہذیب نسواں جلد ۴۶(۱۰ اپریل ۱۹۴۳ء): ص ۲۳۲ تا ۲۳۴۔

۳۲۔ ایضاً، "عورت اپنی نظر میں"، تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۱۳(۲۵ مارچ ۱۹۴۴ء): ص ۱۹۶ تا ۱۹۸۔

۳۳۔ امۃ الحمید خانم، "پیغام عمل مسلم خواتین"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۳(۱۵ جولائی ۱۹۳۹ء): ص ۷۰۱ تا ۷۰۴۔

۳۴۔ ایضاً، "حسب پسند شادی"، تہذیب نسواں جلد ۳۰، نمبر ۵۱ (۱۷ دسمبر ۱۹۲۵ء): ص ۱۰۳۶ تا ۱۰۳۷۔

۳۵۔ ایضاً،"حریت نسواں"تہذیب نسواں، جلد۴۰، نمبر۳۵(۲۸اگست۱۹۳۷ء): ص۸۱۷تا۸۱۹۔

۳۶۔ ایضاً،"عورتوں کی تعلیم"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد۱۹، شمارہ۵(۲۹جنوری۱۹۱۶ء): ص۵۲۔۵۱۔

۳۷۔ ایضاً،"مسلم گرلز سکول علی گڑھ"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد۲۵، شمارہ۳۵(۲۹جولائی۱۹۲۲ء): ص۴۶۵تا۴۶۷۔

۳۸۔ ایضاً،"مسلم خواتین کی تعلیم اور آزادی"، تہذیب نسواں، جلد۴۵، نمبر۲۷ (۴جولائی ۱۹۴۲ء): ص۳۲۲تا۳۲۶۔

۳۹۔ اہلیہ سید احمد سبزواری،"دیہاتی عورت"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۱(۷جنوری۱۹۳۳ء): ص۱۸۔

۴۰۔ ایضاً،"خواتین ہند کی عام حالت"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۴۴(۴نومبر۱۹۳۳ء)، ص۱۰۷۱تا۱۰۷۵۔

۴۱۔ ایضاً،"ساس بہو کے جھگڑے"، تہذیب نسواں، جلد۳۸، نمبر۱۰(۹مارچ۱۹۳۵ء): ص۲۳۰تا۲۳۲۔

۴۲۔ ایضاً،"علم کی ضرورت"، تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۲۵(۲۴جون۱۹۳۳ء): ص۵۸۱تا۵۸۲میں۔

۴۳۔ ایضاً،"اپنے گھر سے اصلاح"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۲۹(۲۲جولائی۱۹۳۳ء): ص۷۱۵تا۷۱۷۔

۴۴۔ ایضاً،"صاف بیانی"، تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۱۷(۲۴جون۱۹۳۳ء): ص۵۶۷تا۵۶۸۔

۴۵۔ اہلیہ محمد علی خاں منصوری،"مرد کی عزت عورت کے ہاتھ ہے"، تہذیب نسواں، جلد۳۱، نمبر۳۰(۲۸جولائی۱۹۲۸ء): ص۷۶۹تا۷۳۲۱۔

۴۶۔ ایضاً،"ہماری ذمہ داری"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۳، نمبر۳۴(۲۳اگست۱۹۳۰ء): ص۸۴۹تا۸۵۰۔

۴۷۔ ایس۔اے کرمانیہ،"تکمیل"، مشمولہ تہذیب نسواں۔ جلد۳۴، شمارہ۴۲(۱۷اکتوبر۱۹۳۱ء): ص۱۰۳۷تا۱۰۳۸۔

۴۸۔ ایضاً،"اخلاقی اصلاح"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۴، نمبر۳۴(۲۶ستمبر۱۹۳۱ء): ص۹۶۱تا۹۶۲۔

۴۹۔ ایس اے کرمانیہ،"صاف گوئی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۴، نمبر۴۸(۲۸نومبر۱۹۳۱ء): ص۱۲۱۷تا۱۲۱۹۔

۵۰۔ ایس آر کرمانیہ،"ازدواج"، تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۳۹(۳۰ستمبر۱۹۳۳ء): ص۹۳۷تا۹۳۹۔

۵۱۔ ایضاً،"قومی ترقی اور عورتیں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۵، نمبر ۴۵(۵ نومبر ۱۹۳۲ء) :ص ۱۰۵۵تا۱۰۵۸۔

۵۲۔ ایضاً،"بچوں کی نگہداشت"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۴۱(۱۴اکتوبر ۱۹۳۳ء) :ص ۹۹۳تا۹۹۶۔

۵۳۔ ایس آر کے، "حسن سلیقہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۳۷(۵ نومبر ۱۹۳۲ء): ص ۹۰۰تا ۹۰۲۔

۵۴۔ ایس آر کے، "ازدواج"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۳۹(۳۰ ستمبر ۱۹۳۳ء): ص ۹۳۷تا۹۳۹

۵۵۔ ایس آر کے، "اسلام اور عورتیں"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد، ۳۱، شمارہ ۴۴(۳نومبر ۱۹۲۸ء): ص ۱۰۵۱۔۱۰۵۷۔

۵۶۔ آذری بیگم، "کثرت ازدواج"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۸(۲۷ جولائی ۱۹۳۳ء): ص ۶۷۴ تا ۶۷۶۔

۵۷۔ آصف جہاں بیگم، "بچوں کی پرورش"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۶(۱۰ فروری ۱۹۴۰ء): ص ۱۳۱تا۱۳۴۔

۵۸۔ ایضاً، "چھوٹے بچوں کے جلدی امراض"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۱۷(۷ فروری ۱۹۴۰ء): ص ۱۵۱تا۱۵۳۔

۵۹۔ ایضاً، "بچوں کی باتیں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۱۹(۱۱ مئی ۱۹۴۰ء): ص ۴۴۳تا۴۴۶۔

۶۰۔ ایضاً، "ہماری معاشی زندگی کی خامیاں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۱۸(۴ مئی ۱۹۴۰ء): ص ۴۱۴تا۴۱۶۔

۶۱۔ آصفہ خاتون، "تعلیم کیوں چھوڑیں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۶، (۱۰ مارچ ۱۹۲۳ء): ص ۱۵۷۔

۶۲۔ ایضاً "ملنا جلنا"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۱۲(۲۶، جون ۱۹۲۳ء): ص ۳۴۷تا۳۷۶۔

۶۳۔ آصفہ خاتون، "منگل کا دن"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۳، شمارہ ۲۹(۱۹ جولائی ۱۹۳۰ء): ص ۳۱۷ تا ۳۴۷۔

۶۴۔ آنسہ تنویر فاطمہ، "اعتراض کرنا"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۳(۲۱ جنوری ۱۹۳۳ء): ص ۶۶ تا ۶۸۔

۶۵۔ ایضاً، "ناراض ہونا"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۴(۲۸ جنوری ۱۹۳۳ء): ص ۸۸تا۸۹۔

۶۶۔ آنسہ تنویر فاطمہ، "رسموں پر فضول خرچی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۷، نمبر ۳۹ (۲۹ ستمبر ۱۹۳۴ء): ص ۹۳۱ تا ۹۳۳۔

۶۷۔ تنویر فاطمہ، "بیاہ شادی میں غفلت"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۷، نمبر ۳۰(۲۸ جولائی ۱۹۳۴ء): ص۷۱۶ تا ۷۱۸۔

۶۸۔ آنسہ نورالنسا بیگم، "تعلیم نسواں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۴(۲۴، جولائی ۱۹۴۳): ص۴۶۹ تا ۴۷۱۔

۶۹۔ ب۔ج، "ہماری مفلسی کی وجہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۳۲(۸ اگست ۱۹۳۱ء): ص۸۱۸ تا ۸۱۹۔

۷۰۔ ب۔ج، "مسجدوں کی تعلیم"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۸، نمبر ۷(۲۵ نومبر ۱۹۲۵ء): ص۷۱۳ تا ۷۱۵۔

۷۱۔ ب۔ج، "تبادلہ خیال"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۳۹(۲۶ ستمبر ۱۹۳۱ء): ص۹۶۳ تا ۹۶۵۔

۷۲۔ بیگم یار محمد خاں، "تعلیم نسواں اور دعوتِ عمل"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۲۲(۲۹ مئی ۱۹۳۷ء): ص ۵۰۳ تا ۵۰۵۔

۷۳۔ ایضاً، "ہماری تعلیمی پستی کا واحد سبب"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۴۰(۲ اکتوبر ۱۹۳۷ء): ص ۹۴۲۔

۷۴۔ ایضاً، "بیجا انگریزی تقلید"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۴۰(۱۳ اکتوبر ۱۹۳۱ء): ص۹۹۵ تا ۹۹۷۔

۷۵۔ ایضاً، "سی پی کی عورت"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۳۷(۱۲ ستمبر ۱۹۳۱ء): ص۹۲۳ تا ۹۲۴۔

۷۶۔ ایضاً، "تربیت اطفال"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۳۶(۴ ستمبر ۱۹۳۷ء): ص۸۵۱ تا ۸۴۱۔

۷۷۔ برجیس دلھن، "تربیت اولاد پر تبصرہ اور اصول تربیت پر عمل"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۸، نمبر ۷ (۴۵، نومبر ۱۹۲۵ء): ص۷۱۷ تا ۷۲۰۔

۷۸۔ ایضاً، "گول میز کانفرنس میں طبقہ نسواں کی نیابت"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۴۳ (۲۵ اکتوبر ۱۹۳۰ء): ص۱۰۴۸ تا ۱۰۴۹۔

۷۹۔ ایضاً ،"مسلم لیڈیز کانفرنس آگرہ "،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد ۳۴،نمبر ۴۱(۱۰اکتوبر ۱۹۳۱ء):
ص ۱۰۳۰تا۱۰۳۱۔

۸۰۔ ب۔ز۔ب۔بنت ڈاکٹر ولی محمد،"تعلیم نسواں"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد ۲۳(۲۶جون ۱۹۲۳ء):
ص ۳۸۵تا۳۸۶۔

۸۱۔ بلقیس بانو،"لڑکیوں کا سینما دیکھنا"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد ۴۰،نمبر ۲۶(۲۶جون ۱۹۳۷ء):ص
۵۸۹تا۵۹۱۔

۸۲۔ بنت شیخ فضل الٰہی،"ہمارا زیور"،مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۱۷،شمارہ ۴۷(۲۱نومبر ۱۹۱۴ء):ص ۵۶۱-
۵۵۸۔

۸۳۔ بی۔جے بیگم،"آگرہ میں زنانہ پردہ کلب کی ضرورت"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد ۳۱،نمبر ۳(۲۱
جنوری ۱۹۲۸ء):ص ۶۷۔

۸۴۔ بیگم اشفاق حسین،"مسلم گرلز سکول مراد آباد"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد ۲۰،نمبر ۱۴(۱۵اپریل
۱۹۱۷ء):ص ۲۳۶تا۲۳۸۔

۸۵۔ بیگم آباد احمد خاں"اقتصادی آزادی"، تہذیب نسواں جلد ۲۶(۲۴جون ۱۹۴۳ء):ص ۴۰۶تا۴۰۹۔

۸۶۔ بیگم شارق،"تعلیم نسواں پر ایک نظر"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد ۳۸،نمبر ۳۹(۲۸ستمبر ۱۹۳۵ء)
ص ۹۳۴تا۹۳۵۔

۸۷۔ ایضاً،"اصلاح دیہات پر خیالات"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد ۳۸،نمبر ۴۵(۹نومبر ۱۹۳۵ء)
:ص ۱۰۸۷۔

۸۷۔ ایضاً،"موجودہ تعلیمی نظام کے حقائق"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد ۳۹،نمبر ۳(۱۸جنوری ۱۹۳۶ء):ص
۵۷تا۶۰۔

۸۹۔ ایضاً،"کیا لڑکیاں نوکری کریں؟"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد ۳۹،نمبر ۴۸(۲۸نومبر ۱۹۳۶ء):ص
۱۱۴۰تا۱۱۴۲۔

۹۰۔ ایضاً،"بچوں کو سزا دینا"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد ۳۸،نمبر ۵۲(۲۸دسمبر ۱۹۳۵ء):ص ۱۲۳۶تا
۱۲۳۸۔

۹۱۔ ایضاً،"اسراف بیجا"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد ۳۹،نمبر ۱۶(۱۸اپریل ۱۹۳۶ء):ص ۳۶۵تا۳۶۷۔

۹۲۔ بیگم مسعود علی، "رجحان طبیعت"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۳۰ (۲۶ جولائی ۱۹۳۰ء): ص ۷۴۷ تا ۷۵۰۔

۹۳۔ ت، "میاں بیوی میں ناموافقت"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۹، نمبر ۳۱ (۳۱ جولائی ۱۹۲۶ء): ص ۵۱۷، ۵۱۸۔

۹۴۔ ایضاً، "ہماری جدید معاشرت اور اس کے آداب"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۱۵ (۱۳ اپریل ۱۹۲۹ء): ص ۳۴۵ تا ۳۴۷۔

۹۵۔ تاج بیگم، "صوبہ پنجاب میں وراثت نسواں کا رواج عام"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۱۹ (۱۱ مئی ۱۹۲۹ء): ص ۴۴۴ تا ۴۴۶۔

۹۶۔ ایضاً، "وراثت نسواں"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۳۲، شمارہ ۱۹ (۱۱ مئی ۱۹۲۹ء): ص ۴۴۶۔ ۴۴۴۔

۹۷۔ تاج النسا بیگم، "پیا چاہے وہ سہاگن"، تہذیب نسواں، جلد ۲۶ (۷ امارچ ۱۹۲۳ء): ص ۱۶۷ تا ۱۷۱۔

۹۸۔ ایضاً، "باہمت عورتیں"، تہذیب نسواں، جلد ۲۶ (۲۴ مارچ ۱۹۲۳ء): ص ۱۸۲ تا ۱۸۳۔

۹۹۔ ت۔ ج للی راج، "تجویز انسداد رسومات"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۱۴ (۱۵ اپریل ۱۹۱۷ء): ص ۲۲۷ تا ۲۲۸۔

۱۰۰۔ جمیلہ بیگم، تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۲۸ (۱۹ جولائی ۱۹۴۱ء): ص ۶۷۰۔

۱۰۱۔ ایضاً، "خاموشی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۴۲ (۲۱ اکتوبر ۱۹۳۳ء): ص ۱۰۱۸۔

۱۰۲۔ ایضاً، "بیوہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۴۳ (۲۸ اکتوبر ۱۹۳۳ء): ص ۱۰۳۳ تا ۱۰۳۴۔

۱۰۳۔ ایضاً، "شادی کا ہرجانہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۱۳ (۱۳ امارچ ۱۹۳۴ء): ص ۲۹۸ تا ۲۹۹۔

۱۰۴۔ ایضاً، "بیوہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر، ۴۳ (۲۸ اکتوبر ۱۹۳۳ء): ص ۱۰۳۳ تا ۱۰۳۵۔

۱۰۵۔ ایضاً، "بے جوڑ شادیاں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۵۱ (۲۲ دسمبر ۱۹۳۴ء): ص ۱۲۱۱ تا ۱۱۲۴۔

۱۰۶۔ ایضاً، "آپس کی رنجشیں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر، ۴۱ (۱۳ اکتوبر ۱۹۳۴ء): ص ۹۸۹ تا ۹۹۰۔

۱۰۷۔ ایضاً، "لوگوں سے حسن سلوک"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۲۵ (۲۳ جون ۱۹۳۴ء): ص ۵۸۱ تا ۵۸۵۔

۱۰۸۔ ایضاً، "عقل پر پردہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۳۰ (۲۸ جولائی ۱۹۳۴ء): ص ۷۰۹ تا

۱۰ے۔

۱۰۹۔ ایضاً، "بدمزاجی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۳۷ (۱۵ ستمبر ۱۹۳۴ء): ص ۸۸۳ تا ۸۸۷۔

۱۱۰۔ ایضاً، "بچوں کو ڈرانا"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۳۹ (۲۹ ستمبر ۱۹۳۴ء): ص ۹۲۵ تا ۹۲۷۔

۱۱۱۔ ایضاً، "بچوں کو ساتھ سلانا"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۴۴ (۳ نومبر ۱۹۳۴ء): ص ۱۰۴۹ تا ۱۰۵۱۔

۱۱۲۔ ایضاً، "بچوں کی نگرانی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۳۶ (۸ ستمبر ۱۹۳۴ء): ص ۸۶۲ تا ۸۶۴۔

۱۱۳۔ ایضاً "بچی کی تعلیم"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۲۹ (۱۷ جولائی ۱۹۳۷ء): ص ۶۸۹ تا ۶۹۲۔

۱۱۴۔ ایضاً، "بچوں کو خود اعتمادی سکھانا"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۳۰ (۲۷ جولائی ۱۹۴۰ء): ص ۷۳۵ تا ۷۳۸۔

۱۱۵۔ ایضاً، "لڑکیوں کا مستقبل"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۱۲ (۲۳ مارچ ۱۹۳۵ء): ص ۲۶۳ تا ۲۶۵۔

۱۱۶۔ ایضاً، "تعلیم یافتہ خواتین کا مستقبل"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۹، نمبر ۳۲، (۸ اگست ۱۹۳۶ء): ص ۷۶۵ تا ۷۷۰۔

۱۱۷۔ ایضاً، "فضول چیزیں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۹، نمبر ۴۱، (۱۰ اکتوبر ۱۹۳۶ء): ص ۹۸۵ تا ۹۸۹۔

۱۱۸۔ ایضاً، "عورت کی آزادی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۳۱ (۳۱ جولائی ۱۹۳۷ء): ص ۷۲۱ تا ۷۲۳۔

۱۱۹۔ ایضاً، "ہندوستان کی مسلم خواتین"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۳۳ (۱۳ اگست ۱۹۳۸ء): ص ۸۶۷ تا ۸۷۰۔

۱۲۰۔ ایضاً، "عورتیں کیا کریں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۶، نمبر ۳۷ (۱۱ ستمبر ۱۹۴۳ء): ص ۵۸۳ تا ۵۸۵۔

۱۲۱۔ ایضاً، "تنسیخ نکاح ایکٹ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۳۸ (۲۱ ستمبر ۱۹۴۰ء): ص ۹۳۰ تا ۹۳۲۔

۱۲۲۔ ایضاً، "مسودہ مسلم قانون فسخ نکاح: تمام اسلامی انجمنوں سے تائید کی درخواست"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۴۷ (۲۳ نومبر ۱۹۳۵ء): ص ۱۰۲۷۔

۱۲۳۔ جمیلہ ہاشمی، "کچھ مہر کے متعلق"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۵، نمبر ۵ (۳۰ جنوری ۱۹۳۲ء): ص ۱۱ تا ۱۲۔

۱۲۴۔ جہاں حبیبہ بیگم، "کھلا سر"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۱۵ (۲۶ ستمبر ۱۹۲۳ء): ص ۵۹۲۔

۱۲۵۔ حامدہ خیری، "عورتوں کی عید"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۱۵ (۲۵ اپریل ۱۹۳۱ء): ص ۳۹۵ تا ۳۹۷۔

۱۲۶۔ ح۔ب، "ہندوستانی عورتیں اور یورپین عورتیں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۳۶ (۶ ستمبر ۱۹۲۴ء): ص ۵۶۵۔

۱۲۷۔ حجاب اسماعیل، "عورت کی سوانح عمری"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۴ (۹، مارچ ۱۹۳۳ء): ص ۲۰۰۔

۱۲۸۔ ایضاً، "خیال کی آزادی یا دخل در معقولات"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۴۳ (۲۷ اکتوبر ۱۹۲۸ء): ص ۱۰۳۲۔

۱۲۹۔ ایضاً، "اصول زندگی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۱۶ (۲۱ اپریل ۱۹۲۸ء): ص ۳۷۲ تا ۳۷۷۔

۱۳۰۔ ایضاً، "منہ سکڑے مرد اور عورتیں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۲۰ (۱۹ مئی ۱۹۲۸ء): ص ۴۶۵ تا ۴۶۹۔

۱۳۱۔ ایضاً، "آواز"، مشمولہ تہذیب نسواں شمارہ ۳۴، جلد ۳۱ (۲۵ اگست ۱۹۲۸ء): ص ۸۲۵ تا ۸۲۷۔

۱۳۲۔ ایضاً، "شگون پرستی اور نجوم"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۳۱، شمارہ ۴۸ (یکم دسمبر ۱۹۲۸ء): ص ۱۱۶۰۔۱۱۵۷۔

۱۳۳۔ ایضاً، "اختلاف"، مشمولہ تہذیب نسواں جلد ۳۳، شمارہ ۳۲ (۹ اگست ۱۹۳۰ء): ص ۸۰۶۔

۱۳۴۔ حجاب امتیاز علی، "عورت بحیثیت ماں کے"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۳۸ (۲۱ ستمبر ۱۹۳۵ء) : ص ۹۱۵ تا ۹۱۷۔

۱۳۵۔ ایضاً، "دورانِ ملاقات میں گفتگو"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۹، نمبر ۵۰ (۱۲ دسمبر ۱۹۳۶ء): ص ۱۱۹۰ تا ۱۱۹۲۔

۱۳۶۔ خاتون اکرم، "ہنسی مذاق"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۵، نمبر ۳۳ (۱۲ اگست ۱۹۲۲ء): ص ۵۰۴ تا ۵۰۶۔

۱۳۷۔ ایضاً، "ہنسی مذاق"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۵، نمبر ۳۲ (۱۲ اگست ۱۹۲۲ء): ص ۵۰۴ تا ۵۰۸۔

۱۳۸۔ ایضاً،"وعدہ وفائی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۵، نمبر ۳۳(۱۹اگست ۱۹۲۲ء):ص۵۱۶تا۵۱۸۔

۱۳۹۔ خدیجۃ الکبریٰ،"مروجہ تعلیم کی مخالفت میں"، مشمولہ تہذیب نسواں جلد ۲۸، نمبر ۳(۱۷جنوری ۱۹۲۵ء):۳۵۔

۱۴۰۔ ایضاً،"اصلاح معاشرت"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۱، نمبر ۱۰(۱۰مارچ ۱۹۲۸ء):ص۲۳۳ تا ۲۳۵۔

۱۴۱۔ ایضاً،"ہندوستانی پردہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۱، نمبر ۲۴(۱۶جون۱۹۲۸ء):ص۵۶۱تا۵۶۳۔

۱۴۲۔ ایضاً،"ہندوستان کامروجہ پردہ"، مشمولہ تہذیب نسواں شمارہ۱۸(۵مئی۱۹۲۸ء):ص۴۱۵تا۴۱۹۔

۱۴۳۔ ایضاً،"لامذہبی کاالزام"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۳۰، شمارہ۳۷(۱۰ستمبر۱۹۲۷ء):ص۷۶۰-۷۵۸۔

۱۴۴۔ ایضاً،"عورتوں کوہر حال میں صبر کی تلقین"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۳۰، شمارہ ۵۰(۱۰دسمبر ۱۹۲۷ء) ص۱۰۰۹-

۱۴۵۔ ایضاً،"بچوں کو تعلیم کی ترغیب و تشویش"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۳۱، شمارہ۵(۴فروری۱۹۲۸):ص ۱۰۵تا۱۰۷۔

۱۴۶۔ ایضاً،"ہندوستان کامروجہ پردہ"، مشمولہ تہذیب النسواں، جلد۳۱، شمارہ۱۸(۵مئی۱۹۲۸ء):ص۴۱۵تا ۴۱۹-

۱۴۷۔ دختر عبدالودود ،"قوانین عروسی"، مشمولہ تہذیب نسواں ،جلد ۲۸، نمبر ۱۰ (۲جنوری ۱۹۲۵ء): ص۲۵۔

۱۴۸۔ رشید جہاں بیگم،"دو قومی کام"، مشمولہ تہذیب نسواں ،جلد،۱۳(۲۶جولائی۱۹۲۳ء):ص۴۴۴ تا ۴۴۵۔

۱۴۹۔ رضویہ خاتون،"بچوں کی دوااور پرہیز"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۱، نمبر ۳۱(۴اگست ۱۹۲۸ء): ص۷۵۰تا۷۵۴۔

۱۵۰۔ ایضاً،"لڑکیوں کی ناقدری"، مشمولہ تہذیب نسواں ،جلد ۲۹، نمبر ۳۰(۲۴جولائی۱۹۲۶ء):ص۵۱۱ تا ۵۱۲۔

۱۵۱۔ رضویہ خاتون،"میاں بیوی کی رنجش"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۲۵، نمبر ۲۷(۸جولائی ۱۹۲۲ء): ص۴۲۷تا۴۲۹۔

۱۵۲۔ زبیدہ زریں،"تعدد ازدواج اور فسخ نکاح"، مشمولہ تہذیب نسواں ، جلد۴۱، نمبر ۳۴ (۲۰اگست

۱۹۳۸ء): ص ۸۹۱۔

۱۵۳۔ ایضاً، "تعدد ازدواج"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۵۱، نمبر ۲۷ (۳جولائی ۱۹۴۸ء): ص ۳۸۶ تا ۳۹۰۔

۱۵۴۔ ایضاً، "نکاح کا اختیار"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۵۱، نمبر ۲۹ (۱۷جولائی ۱۹۴۸ء): ص ۴۴۹ تا ۴۵۱۔

۱۵۵۔ ایضاً، "اسلام اور سرمایہ کاری"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۵۱، نمبر ۳۱ (۳۱جولائی ۱۹۴۸ء): ص ۴۷۲ تا ۴۷۶۔

۱۵۶۔ زہرا بیگم "ہندوستانیوں کی بعض عادتیں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۲۱ (۲۳ مئی ۱۹۳۱ء): ص ۴۸۳ تا ۴۸۵۔

۱۵۷۔ س۔الف، "محروم وراثت لڑکیاں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۱۸ (۳ مئی ۱۹۲۴ء): ص ۲۸۲ تا ۲۸۳۔

۱۵۸۔ ستارہ جبین بنت ا۔ع۔خ، "ہم خود ظالم نہیں مردوں کے قصور سے ظالم ہیں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۶ (۲۰ جنوری ۱۹۲۳ء): ص ۳۶ تا ۳۸۔

۱۵۹۔ سردار محمدی بیگم، "معصوم بچوں کے حق پر ڈاکہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۲۰ (۱۶ مئی ۱۱۹۳ء): ص ۴۶۸ تا ۴۷۰۔

۱۶۰۔ ایضاً، "عورتوں کو لکھنا پڑھنا سکھانا"، مشمولہ تہذیب النسواں، جلد ۳۲، شمارہ ۲۸ (۱۳ جولائی ۱۹۲۸ء): ص ۶۸۱ تا ۶۸۲۔

۱۶۱۔ ایضاً، "ترقی کی تمنا میں تحقیر کا اعلان"، مشمولہ تہذیب نسواں جلد ۳۳، شمارہ ۲۹ (۱۹ جولائی ۱۹۳۰ء): ص ۷۳۶ تا ۷۳۹۔

۱۶۲۔ مولانا محمد حسین صدیقی، بیس بڑی خواتین (کراچی: زمزم پبلشرز، ۲۰۰۳ء): ص ۱۷۹۔

۱۶۳۔ سلطان جہاں بیگم، "آنحضرت کا سلوک ازواج مطہرات سے"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۳۵ (۱ستمبر ۱۹۲۸ء): ص ۸۵۷۔

۱۶۴۔ سلطانہ بیگم، "سینما پر ایک تنقیدی نظر"، مشمولہ تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۲۶، (۲۸ جون ۱۹۴۱ء): ص ۵۸۳ تا ۵۸۶۔

۱۶۵۔ شاہزادی جہاں بیگم، "سرپرستوں کو کیا چاہیے"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۱۸، (۱۱مارچ ۱۹۳۳ء): ص ۲۵۱۔ تا ۲۵۳۔

۱۶۶۔ ایضاً، "پسند کی شادی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۱۶، (۱۸اپریل ۱۹۳۱ء): ص ۳۷۰ تا ۳۷۱۔

۱۶۷۔ ایضاً، "طلاق نہ دینا"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۱۷(۲۴جون۱۹۳۳ء): ص۵۶۳ تا ۵۶۴۔

۱۶۸۔ ایضاً، "بیوفائی اور وفاداری"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۴۷(۲۵نومبر ۱۹۳۳ء): ص۲۰۳۴ تا۲۰۳۶۔

۱۶۹۔ ایضاً، "ہندوستانی بیوی کی ذمہ داریاں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۷(۱۵فروری۱۹۳۵ء)

۱۷۰۔ ایضاً، "ہماری خانگی زندگی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۴۰، نمبر۲۲(۲۹مئی۱۹۳۷ء): ص ۵۰۲تا۵۰۳۔

۱۷۱۔ ایضاً، "گھر کا ضبط"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۳، نمبر۲۹، (۱۹جولائی۱۹۳۰ء): ص۔

۱۷۲۔ ایضاً، "ہمارے زنانہ مدارس کا انتظام"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۴، نمبر۱۳(۲۸مارچ۱۹۳۱ء): ص۳۹۷تا۳۹۹۔

۱۷۳۔ ایضاً، "لڑکیوں کی تعلیم"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۴، نمبر۱۳(۲۸مارچ۱۹۳۱ء): ص ۴۶۳تا ۴۶۴۔

۱۷۴۔ ایضاً، "تعلیم نسواں کی ترقی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۷، نمبر۳۳، (۱۸اگست ۱۹۳۴ء): ص ۷۹۱تا۷۹۳۔

۱۷۵۔ ایضاً، "تعلیم نسواں کے متعلق غلط فہمی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۲۲(۳۰مئی۱۹۳۶ء): ص۵۰۵تا۵۰۸۔

۱۷۶۔ ایضاً، "زنانہ آزادی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۴۰، نمبر۲۳(۵جون۱۹۳۷ء): ص۵۲۲تا۵۲۴۔

۱۷۷۔ ایضاً، "تقسیم مال"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۴، نمبر۱۴(۴اپریل۱۹۳۱ء): ص۳۲۱تا۳۲۲۔

۱۷۸۔ ایضاً، "ہماری مفلسی کی وجہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۴، نمبر۲۸(۱۱جولائی۱۹۳۱ء): ص۷۱۵ تا ۷۱۶۔

۱۷۹۔ ایضاً، "طرف داری"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۴، نمبر۱۸(۱مئی۱۹۳۱ء): ص۴۲۹تا۴۳۰۔

۱۸۰۔ ایضاً، "زنانہ تفریح گاہیں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۴، نمبر۱۷، (۲۸مارچ۱۹۳۱ء): ص۳۹۴ تا ۳۹۵۔

۱۸۱۔ ایضاً، "دوسروں کے خطوط پڑھنا"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۴، نمبر۴۱(۱۰اکتوبر۱۹۳۱ء): ص ۱۰۱۹تا۱۰۲۰۔

۱۸۲۔ ایضاً، "نانی دادی کی تربیت"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۴، نمبر۳۷(۱۲ ستمبر ۱۹۳۱ء): ص

۹۲۷تا۹۳۰۔

۱۸۳۔ ایضاً،"بچوں کے اتالیق اور نگران"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۴۶(۱۸ نومبر ۱۹۳۳ء):ص ۲۰۱۱تا ۲۰۱۳۔

۱۸۴۔ ایضاً،"کچھ بچوں کی بابت"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۳۴(۲۵ اگست ۱۹۳۴ء):ص ۸۰۵تا ۸۰۹۔

۱۸۵۔ ایضاً،"بچوں کے متعلق کچھ اور "تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۱۰(۹مارچ ۱۹۳۵ء)، ص ۲۲۶تا ۲۳۰

۱۸۶۔ ایضاً،"بیٹی کی حق تلفی"، مشمولہ تہذیب النسواں، جلد ۳۳شمارہ ۱۱(۱۵مارچ ۱۹۲۰ء):ص ۲۶۴تا ۲۶۵۔

۱۸۷۔ ایضاً،"ایک غافل ماں"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۳۳، شمارہ ۲۵(۱۹۳۰ء):ص ۱۹۱تا ۱۹۳۔

۱۸۸۔ ایضا ،"تنہا سفر کرنا"،مشمولہ تہذیب نسواں ،جلد ۳۴، نمبر ۴۸(۲۸ نومبر ۱ ۱۹۳ ء):ص ۱۲۲۰تا ۱۲۲۳۔

۱۸۹۔ ایضا ،"اپنی مدد آپ "،مشمولہ تہذیب نسواں ،جلد ۳۶، نمبر ۲۵(۲۴جون ۱۹۳۳ ء):ص ۵۷۷تا ۵۷۸۔

۱۹۰۔ ایضاً،"ہم پر تبدیلی کا اثر"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۳۴(۲۶ اگست ۱۹۳۳ء):ص ۸۲۴تا ۸۲۷۔

۱۹۱۔ ایضاً،"والدین کے حقوق"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۳۷(۵ نومبر ۱۹۳۲ء) :ص ۹۰۳تا ۹۰۵۔

۱۹۲۔ ایضاً،"بیوفائی اور وفاداری"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۴۷(۲۵نومبر ۱۹۳۳ء) :ص ۲۰۳۴تا ۲۰۳۶۔

۱۹۳۔ ایضاً،"غیر مذہب کے لوگوں سے مراسم"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۵۰(۱۶دسمبر ۱۹۳۳ء):ص ۲۱۱۶تا ۲۱۱۹۔

۱۹۴۔ ایضاً،"مہمان جانے میں لحاظ "، مشمولہ تہذیب نسواں ،جلد ۳۷، نمبر ۷ (۱۷فروری ۴ ۱۹۳ ء):ص ۱۶۱تا ۱۶۳۔

۱۹۵۔ ایضاً،"عورتوں کے لیے پیشے"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۲۳(۹جون ۱۹۳۴ء):ص ۵۴۵تا ۵۴۶۔

۱۹۶۔ ایضاً،"نام چھپانا"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۳۰(۲۸جولائی ۱۹۳۴ء):ص ۷۰۱تا ۷۱۱۔

۱۹۷۔ ایضاً،" اصلاح مسلم خواتین"،مشمولہ تہذیب نسواں ،جلد۳۷،نمبر۳۹ (۲۹ستمبر ۱۹۳۴ ء): ص ۹۳۰تا۹۳۱۔

۱۹۸۔ ایضاً،چھپا کر کام کرنا"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد۳۷،نمبر۳۷(۱۵ستمبر۱۹۳۴ء):ص۸۸۷تا۸۸۹۔

۱۹۹۔ ایضاً،"عورتوں کا تیار ہونا"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد۳۸،نمبر۵۲(۲۸ دسمبر۱۹۳۵ء) :ص ۱۲۴۵تا۱۲۴۷۔

۲۰۰۔ ایضاً،"میل جول کا زمانہ"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد۴۰،نمبر۱۹(۸مئی۱۹۳۷ء):ص۴۴۹تا۴۵۱۔

۲۰۱۔ ایضاً،"اطلاع دے کر جانا"،مشمولہ تہذیب نسواں ،جلد۴۰،نمبر۲۵(۱۹جون۱۹۳۷ء):ص۵۷۸ تا۵۷۹۔

۲۰۲۔ ایضاً،"ہمارا آپس میں برتاؤ"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد۴۰،نمبر۲۸(۱۰جولائی۱۹۳۷ء):ص۶۶۸ تا۶۶۹۔

۲۰۳۔ ایضاً،"پردے کی نسبت میرا خیال"،مشمولہ تہذیب النسواں جلد۲۳،شمارہ۱۳(۲۹مارچ۱۹۲۰ء): ص۳۰۱تا۳۰۲۔

۲۰۴۔ شمسی بیگم،"تہذیب نسواں کے متعلق میرے رائے ناچیز"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد۲۶(۱۷فروری ۱۹۲۳ء):ص۱۰۸تا۱۰۹۔

۲۰۵۔ م۔ج،"عورتوں کی موجودہ تعلیم"،مشمولہ تہذیب نسواں ،جلد۳۶،نمبر ۲(۱۴ جنوری۱۹۳۳ء): ص۳۷۔

۲۰۶۔ صدیقہ خاتون،"جواب الجواب پر ایک نظر"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد۲۶(۲۷جنوری۱۹۲۳ء): ص۵۰۔

۲۰۷۔ صغرا ہمایوں مرزا ،"ترکی میں شادی کی رسمیں"، مشمولہ تہذیب نسواں ،جلد۳۴،نمبر۱۶(۱۸اپریل ۱۹۳۱ء):ص۳۷۰تا۳۷۷۔

۲۰۸۔ ایضاً،"بننا بگڑنا"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد۳۴،نمبر۳۹(۲۶ستمبر۱۹۳۱ء):ص۹۶۸تا۹۷۰۔

۲۰۹۔ ایضاً،"دشمنی"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد۳۶،نمبر۴۷(۲۵نومبر۱۹۳۳ء):ص۲۰۳۸تا۲۰۳۹۔

۲۱۰۔ ایضاً،"کم سخنی"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد۳۷،نمبر۱(۶جنوری۱۹۳۴ء):ص۲۳تا۲۵۔

۲۱۱۔ ایضاً،"کفایت شعاری"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد۴۰،نمبر۳(۱۶جنوری۱۹۳۷ء):ص۶۲تا۶۳۔

۲۱۲۔ ایضاً،"پردہ سے متعلق اشعار"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد۳۴،نمبر۳۷(۱۲ستمبر۱۹۳۱ء):ص۹۳۴تا

۹۳۵۔

۲۱۳۔ ایضاً ،"پردہ اسے کہتے ہیں "، مشمولہ تہذیب نسواں ،جلد ۳۴، نمبر ۴۸(۲۸ نومبر ۱۹۳۱ ء):
ص ۱۲۲۵تا۱۲۲۷۔

۲۱۴۔ صفورہ بیگم، "ورزش اور تفریح"، تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۲۳(۹جون ۱۹۲۸ء): ص ۵۵۲۔

۲۱۵۔ صفیہ مدحت خانم، "سیر و تفریح"، مشمولہ تہذیب نسواں جلد ۳۳، شمارہ ۲۶ (۲۸جون ۱۹۳۰ء):
ص ۲۶۵تا۲۶۷۔

۲۱۶۔ ایضاً، "پردہ نشین و بے پردہ خواتین"، مشمولہ تہذیب نسواں جلد ۳۳، شمارہ ۳۸(۲۰ ستمبر ۱۹۳۰ء):
ص ۹۳۴تا۹۳۶۔

۲۱۷۔ ایضاً، "لڑکیوں کا پردہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۳۹(۲۷ ستمبر ۱۹۳۰ء): ص ۹۵۵تا۹۵۹۔

۲۱۸۔ ظفر جہاں، "ایک اہم سوشل اصلاح" ، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۳۴(۲۴اگست ۱۹۲۹ء):
ص ۸۲۹۔

۲۱۹۔ ایضاً، ""قومی ضروریات کا احساس"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۳۱(۴ اگست ۱۹۲۸ء):
ص ۷۴۴، ۷۴۵۔

۲۲۰۔ ایضاً، "مسلمان اور ان کی جائدادیں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۱۷،:(۲۸اپریل ۱۹۲۸ء):
ص ۳۹۴تا۳۹۵۔

۲۲۱۔ ایضاً، "لڑکیوں کے حقوق والدین پر"، مشمولہ تہذیب لنسواں، شمارہ ۳۲، جلد ۳۱ (۱۱اگست
۱۹۲۸ء): ص ۷۷۷تا۷۷۸۔

۲۲۲۔ ایضاً، "ازدواجی زندگی اور اسراف"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۳۲، شمارہ ۲۱ (۲۵ مئی ۱۹۲۹ء):
ص ۴۸۷۔ ۴۸۴۔

۲۲۳۔ ظفر جہاں بیگم، "ایک قابل تقلید خانہ دار بہن"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر، ۴۳(۲۴اکتوبر
۱۱۹۳ء): ص ۱۰۹۹تا۱۱۰۲

۲۲۴۔ ایضاً، "خلع"، مشمولہ تہذیب النسواں شمارہ ۳۴، جلد ۳۱(۲۵اگست ۱۹۲۸ء): ص ۸۱۷تا۸۲۰۔

۲۲۵۔ ایضاً، "شوہر کی اطاعت اور صبر"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۳۰، شمارہ ۴۷(۱۹ نومبر ۱۹۲۷ء): ص
۹۵۳تا۹۵۶۔

۲۲۶۔ ایضاً، "لڑکیوں کے حقوق والدین پر"، مشمولہ تہذیب النسواں، جلد ۳۱، شمارہ ۳۲(۱۱اگست ۱۹۲۸ء):

ص۷۷۷ تا۷۷۸۔

۲۲۷۔ ایضاً،"عورتوں کے حقوق"، مشمولہ تہذیب النسواں، جلد ۳۲، شمارہ۴۷(۲۳نومبر ۱۹۲۹ء): ص ۱۱۳۵تا۱۱۳۷۔

۲۲۸۔ عطیہ نصرت خانم، "حجاب"، تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۴۴(یکم نومبر ۱۹۳۰ء): ص۱۰۶۷۔

۲۲۹۔ ایضاً، "عورتیں اور سیاسیات"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۴۵(۷نومبر ۱۹۳۰ء): ص۱۱۰۱ تا ۱۱۰۴۔

۲۳۰۔ غ۔خانم، "گھر میں تعلیم ممکن نہیں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۸، نمبر ۲۰(۱۶ مئی ۱۹۲۵ء): ص۳۰۸۔

۲۳۱۔ فاطمہ بیگم، "قرضہ حسنہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۸، نمبر ۱۱(۱۴مارچ ۱۹۲۵ء): ص۱۶۳۔

۲۳۲۔ ایضاً، "ہمدردی"، مشمولہ تہذیب نسواں جلد ۳۳، شمارہ ۳۲(۹اگست ۱۹۳۰ء): ص ۸۱۲ تا ۸۱۳۔

۲۳۳۔ ایضاً، "عورتوں کی تعلیم"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۱۹، شمارہ۵(۲۹ جنوری ۱۹۱۶ء): ص۵۷ تا۵۹۔

۲۳۴۔ فاطمہ بنت کے محمد حسین، "ہمارا لباس"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۲۰(۱۹ مئی ۱۹۲۸ء): ص۴۶۹ تا ۴۷۲۔

۲۳۵۔ فاطمہ صغرا بیگم، "عورتیں اور ترقی"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۱۸، شمارہ ۳۴(۲۱اگست ۱۹۱۵ء): ص ۴۰۱ تا ۴۰۲۔

۲۳۶۔ فاطمہ محمد حسین، "آرائش و صفائی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۳۲(۱۱ اگست ۱۹۲۸ء): ص۷۸۶ تا ۷۸۸۔

۲۳۷۔ فاطمہ مس کے محمد حسین، "وٹینگ روم اور ریل"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۲۲(۲جون ۱۹۲۸ء): ص۵۲۳ تا ۵۲۶۔

۲۳۸۔ ف۔ض۔ی۔ل، "گول میز کانفرنس اور عورتیں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۳۹(۲۷ستمبر ۱۹۳۰ء): ص۹۵۵۔

۲۳۹۔ ایضاً، ص۹۵۵۔

۲۴۰۔ قرۃ العین، "شبہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۱۹(۹ مئی ۱۹۳۱ء): ص۲۵۰ تا ۲۵۲۔

۲۴۱۔ ایضاً، "کتابوں کی قدر"، مشمولہ تہذیب نسواں جلد ۳۳، شمارہ ۳۵ (۳۰اگست ۱۹۳۰ء): ص ۸۶۹ تا ۸۷۰۔

۲۴۲۔ ایضاً ،"خوش مزاجی "، مشمولہ تہذیب نسواں ، جلد۲۵، نمبر ۲۵(۲۴جون ۱۹۲۲ ء): ص۳۸۵ تا ۳۸۷۔

۲۴۳۔ ایضاً، "تعریف"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۳۳، شمارہ ۲۶ (۱۲جولائی ۱۹۳۰ء): ص۸۱۷ تا ۸۱۹۔

۲۴۴۔ کیو۔ ایس۔ کے، "آج کل کی لڑکیوں کا تعلیمی شوق"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۱۹(۸ مئی ۱۹۳۷ء): ص۴۴۵ تا ۴۴۷۔

۲۴۵۔ مبارک دلھن۔ "موٹر کا سفر"، مشمولہ تہذیب نسواں ، جلد ۳۳، نمبر ۳۳ (۱۶ اگست ۱۹۳۰ء): ص ۸۶۷ تا ۸۶۸۔

۲۴۶۔ ایضاً، "پرسا"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۲۰(۱۹ مئی ۱۹۲۸ء): ص۴۷۵ تا ۴۷۷۔

۲۴۷۔ مبارک دلھن ، "مسلم انجمن گرل اسکول"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۹، نمبر ۱۶(۱۸اپریل ۱۹۳۶ء): ص۳۷۸ تا ۳۸۱۔

۲۴۸۔ ایضاً ، "غیر تعلیم یافتہ لڑکیوں کی شادی"، تہذیب نسواں ، جلد ۴۰، نمبر ۳۱(۳۱جولائی ۱۹۳۷ء): ص ۷۲۵ تا ۷۲۷۔

۲۴۹۔ ایضاً، "گھر کی ملکہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۹، نمبر ۴۱(۱۰ اکتوبر ۱۹۳۶ء): ص۹۹۰ تا ۹۹۲۔

۲۵۰۔ ایضاً، "انوناً شادیوں میں اصلاح کی ضرورت"، مشمولہ تہذیب نسواں ، جلد ۴۰، نمبر ۳۸(۱۸ ستمبر ۱۹۳۷ء): ص۸۹۹ تا ۹۰۱۔

۲۵۱۔ ایضاً، "حریت نسواں"، مشمولہ تہذیب نسواں ، جلد ۴۰، نمبر ۴۶(۱۳نومبر ۱۹۳۷ء): ص ۱۰۸۸ تا ۱۰۹۰۔

۲۵۲۔ م ۔ب۔ ش، "بے زبان لڑکیاں"، مشمولہ تہذیب نسواں ، جلد۵، (۲۶ مئی ۱۹۲۳ء): ص ۲۸۲ تا ۲۸۴۔

۲۵۳۔ حمیرا اشفاق، مجموعہ محمدی بیگم (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء): ص۹۔

۲۵۴۔ محمدی بیگم، "رسم و رواج کی پابندی"، مشمولہ تہذیب نسواں شمارہ ۲۸(۱۴جولائی ۱۹۲۸ء): ص۶۸۶ تا ۶۸۷۔

۲۵۵۔ ایضاً، "ذہین بچے"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۲۹ (۲۱جولائی ۱۹۲۸ء): ص۷۰۳ تا ۷۰۶۔

۲۵۶۔ ایضاً، "خاکساری"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۳۰(۲۸جولائی ۱۹۲۸ء): ص۷۲۲۔

۲۵۷۔ مریم بائی، "دوستی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۲۰(۱۶ مئی ۱۹۳۱ء): ص۴۷۵۔

۲۵۸۔ مسز برلاس، "پرائمری تعلیم"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۱۱(۱۶مارچ ۱۹۳۵ء): ص ۲۴۱ تا ۲۴۲۔
۲۵۹۔ ایضاً، "پرائمری تعلیم"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۱۲(۲۳مارچ ۱۹۳۵ء): ص ۲۶۱ تا ۲۶۳۔
۲۶۰۔ ایضاً، "کوبے میں مسز برلاس کی تقریر"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۱۳(۳۰مارچ ۱۹۳۵ء): ص ۲۸۱ تا ۲۸۴۔
۲۶۱۔ مسز حامد علی، "ہماری موجودہ تعلیم"، مشمولہ تہذیب نسواں جلد ۴۶، (۲۰مارچ ۱۹۴۳ء): ص ۱۹۰۔
۲۶۲۔ مسز داؤد الرحمن، " ایک نوید قومی خواتین کے لیے"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۶، (یکم ستمبر ۱۹۲۳ء): ص ۵۴۹ تا ۵۵۱۔
۲۶۳۔ ایضاً، ص ۵۶۷ تا ۵۷۰۔
۲۶۴۔ مسز سید احمد مچھلی شہری "ہماری بے بسی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۲۴(۱۲جون ۱۹۳۷ء): ص ۵۴۹۔
۲۶۵۔ ایضاً، "جہالت اور توہم پرستی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۹، نمبر ۱۵(۱۱اپریل ۱۹۳۶ء): ص ۳۴۸ تا ۳۵۱۔
۲۶۶۔ ایضاً، "علی گڑھ میں مسلم خواتین کے لیے ڈگری کالج "، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۹، نمبر ۲۹ (۱۸جولائی ۱۹۳۶ء): ص ۶۸۹ تا ۶۹۰۔
۲۶۷۔ مسز ضیا الحسن، "مذہبی تعلیم "، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۳۴ (۲۳اگست ۱۹۳۰ء): ص ۸۴۲، ۸۴ تا۔
۲۶۸۔ ایضاً، "پردہ اور ہم"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۱۲(۲۰مارچ ۱۹۳۷ء): ص ۲۶۹ تا ۲۷۱۔
۲۶۹۔ ایضاً، "پردہ اور ہم"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۱۳(۲۷مارچ ۱۹۳۷ء): ص ۲۸۹ تا ۲۹۱۔
۲۷۰۔ مسز محمود، "طلسم آزادی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۸، نمبر ۱۱(۱۴مارچ ۱۹۲۵ء): ص ۱۷۳ تا ۱۷۲۰۔
۲۷۱۔ مسز ملک صاحبہ، "مغربی تعلیم کا اثر"، مشمولہ تہذیب نسواں جلد ۴۶(۱۶جنوری ۱۹۴۳ء): ص ۴۷ تا ۴۸۔
۲۷۲۔ ایضاً، ص ۴۸۔
۲۷۳۔ م۔ظ۔ا، "مظلوم فرقہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۳(۲۱جنوری ۱۹۲۸ء): ص ۶۵۔
۲۷۴۔ ن ب، "تعلیم نسواں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۹(۲۶جون ۱۹۲۳ء): ص ۳۵۳ تا ۳۵۴۔

۲۷۵۔ ایضاً، "تعلیم نسواں"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۲۶، شمارہ ۲۳ (۹جون ۱۹۲۳ء): ص ۳۵۳ تا ۳۵۴۔

۲۷۶۔ نذر سجاد حیدر، "تعلیم نسواں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۹، نمبر ۹،۱۴۱(۹ اکتوبر ۱۹۲۶ء): ص ۷۷۶ تا ۷۷۹۔

۲۷۷۔ ایضاً، "پردہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۹(۲۷ فروری ۱۹۳۷ء): ص ۱۹۳ تا ۱۹۵

۲۷۸۔ ایضاً "پہاڑ پر پردہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۶ (۱۸ اگست ۱۹۲۳ء): ص ۵۱۷ تا ۵۲۱۔

۲۷۹۔ ایضاً، "حریت نسواں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۸(۲۰ فروری ۱۹۳۷ء): ص ۱۷۳ تا ۱۷۵۔

۲۸۰۔ ایضاً، "حریت نسواں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۱۰(۶ مارچ ۱۹۳۷ء): ص ۲۱۷ تا ۲۲۰۔

۲۸۱۔ ایضاً، "میاں بیوی کے تعلقات"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۲(۱۳ جنوری ۱۹۴۰ء): ص ۳۷ تا ۴۰۔

۲۸۲۔ نفیس دلھن، "مسلم لیڈیز کانفرنس علی گڑھ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۱۵(۱۱ اپریل ۱۹۳۱ء): ص ۳۴۵ تا ۳۴۷۔

۲۸۳۔ نفیس فاطمہ، "باجے کا شوق"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۲۹(۲۱ جولائی ۱۹۲۸ء): ۷۰ تا ۷۱۰۔

۲۸۴۔ و۔ا، "مروجہ تعلیم نسواں"، مشمولہ تہذیب نسواں جلد ۲۸، نمبر ۱۱(۱۴ مارچ ۱۹۲۵ء): ص ۱۶۹، ۱۷۰۔

۲۸۵۔ ایضاً "شیخ عبداللہ کی تقریر پر"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۸، نمبر ۱۰(۶ جنوری ۱۹۲۵ء): ص ۱۸ تا ۲۱۔

۲۸۶۔ ایضاً، "تفویض"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۱(۱۰ مارچ ۱۹۳۳ء): ص ۲۲۹ تا ۲۳۱۔

۲۸۷۔ ایضاً، "بڑھے چلو"، مشمولہ تہذیب نسواں جلد ۴۶ (۱۰ اپریل ۱۹۴۳ء): ص ۲۲۵ تا ۲۳۰۔

۲۸۸۔ ایضاً، "ہنسیے نہیں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۱۵(۱۱ اپریل ۱۹۳۱ء): ص ۳۴۹ تا ۳۵۲۔

۲۸۹۔ ایضاً، "جہیز اور بری کی نمائش"، مشمولہ تہذیب نسواں جلد ۳۳، شمارہ ۳۲ (۹ اگست ۱۹۳۰ء): ص ۸۰۹ تا ۸۱۲۔

۲۹۰۔ ایضاً، "سہاگن بیٹی میکے میں"، مشمولہ تہذیب نسواں جلد ۳۳، شمارہ ۳۵ (۳۰ اگست ۱۹۳۰ء): ص ۸۶۱ تا ۸۶۳۔

۲۹۱۔ ہمشیرہ احمد مبین، "معاشرت کا اثر"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۱۷ (۲۸ اپریل ۱۹۲۸ء): ص ۲۹۲۔

۲۹۲۔ ایضاً، "تعلیم کیوں چھوڑیں"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۲۶، شمارہ ۲۲ (۲جون ۱۹۲۳ء): ص ۳۴۸ تا ۳۴۹۔

۲۹۳۔ ہمشیرہ سید آدم، "میاں بیوی کی رنجش"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۵، نمبر ۲۷ (۸جولائی ۱۹۲۲ء): ص ۴۲۷ تا ۴۲۹۔

۲۹۴۔ ایضاً، "کثرت و قلت اولاد"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۵، نمبر ۲ (یکم جولائی ۱۹۲۲ء): ص ۴۱۱ تا ۴۱۳۔

باب سوم:

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین کا نسائی شعور اور حقوق نسواں: برصغیر کی سماجی صورت حال کے تناظر میں

باب سوم:

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین کا نسائی شعور اور حقوق نسواں:

برصغیر کی سماجی صورت حال کے تناظر میں

حقوق نسواں سے مراد وہ حقوق ہیں جو انسان ہونے کے ناطے عورت کو حاصل ہیں۔ عورت کو بحیثیت فرد سماجی اور سیاسی سطح پر مکمل حقوق حاصل ہیں۔ سماجی اعتبار سے دیکھا جائے تو سماج کا حصہ ہونے کی بنیاد پر عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی زندگی اپنی من مرضی سے گزار سکے اس حوالے سے عورت خود مختار ہے کہ وہ اپنے فیصلے خود لے عورت کو اپنی ذات کے اظہار کا حق حاصل ہے جس میں تحریری اور تقریری دونوں صورتیں شامل ہیں۔ اسی طرح عورت جائیداد اور وراثت میں بھی اسی طرح حق رکھتی ہے جس طرح مرد کو اس کے حقوق دیے جاتے ہیں۔ پیشے کے انتخاب میں بھی عورت کو یہ اختیار ہے کہ وہ اپنی پسند کا پیشہ اختیار کرتے ہوئے اپنی صلاحیتوں کا اظہار کر سکے۔ علاوہ ازیں پسند کی شادی اور بہتر تعلیمی سہولیات بھی عورت کے بنیادی حقوق میں شامل ہیں۔ سیاسی حوالے سے خاص طور پر یہ تعصب پایا جاتا ہے کہ عورت سیاسی امور کی انجام دہی بخوبی نہیں کر سکتی جب کہ سیاسی امور کی انجام دہی کے لیے جنس کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ سیاسی امور کے حوالے سے دیکھا جائے تو وہ ووٹ کا حق، الیکشن میں نامزدگی کا حق، عوامی مسائل کے حل کے لیے کوشش کا حق رکھتی ہے۔ لیکن سماجی ڈھانچے میں عورت کے لیے ان تمام حقوق کی گنجائش موجود نہیں ہے جن کا وہ استحقاق رکھتی ہے۔

ابتدا میں دنیا کے تمام خطوں میں یہی رویہ پروان چڑھا اور عورتوں کو ان کے حقوق سے دور رکھا گیا اور سماجی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی سطحوں پر ان کا استحصال کیا جاتا رہا۔ عورت کو محض عورت ہونے کی وجہ سے ان تمام مسائل کا سامنا کرنا پڑا اور مرد کو ہمیشہ محض مرد ہونے کے ناطے فوقیت ملی۔ اس تفریق کے حوالے سے فہمیدہ ریاض لکھتی ہیں کہ:

> عورت کے مکمل انسانی وجود کو تسلیم کیا جائے اور اس کے کسی بھی پہلو کو کچل کر نابود کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔۔۔ ایک سطح پر اس میں عورت کے وجود کی "لا محدودیت" کا پہلو پنہاں ہے۔ انسان کے امکانات کسی خط فاصل کی قید میں نہیں آتے۔ عورت "انسان" کا نسوانی روپ ہے۔ اس کے امکانات بھی لا محدود ہیں۔[1]

انیسویں صدی کے آغاز میں اس کے خلاف آواز بلند کی گئی، مرد اور عورت کے یکساں حقوق کے لیے

کوششیں کی گئیں (اس حوالے سے تفصیلات باب دوم کے آغاز میں پیش کی گئی ہیں)۔ طویل عرصے کی کوششوں کے بعد انیسویں صدی میں کیے گئے اقدامات نے بیسویں صدی میں حقوق نسواں کے حصول کے لیے بنیاد فراہم کیں اور انھیں سماجی و سیاسی سطح پر وہ حقوق ملنا شروع ہو گئے جن کی وہ حقدار تھیں۔ جس میں معاشی خود مختاری، ملازمتوں میں یکساں اجرت، پسند کی شادی کا حق، افزائش نسل اور بچے کی ذمہ داری سے متعلقہ معاملات، جائداد میں حق اور بہتر تعلیمی سہولیات شامل ہیں۔ اس ضمن میں شبیر رانا کا موقف کچھ یوں ہے:

۔۔۔۔ مرد اور عورت کی مساوی حیثیت کے بارے میں بالعموم تحفظات کا اظہار کیا جاتا رہا ہے۔۔۔۔ تانیثیت پر مبنی نظریے نے خواتین کو مژدہ جاں فزا سنایا کہ قید حیات اور بند غم سے دلبرداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ زندگی تو جوئے شیر، تیشہ اور سنگ گراں کا نام ہے۔ عزت اور وقار کے ساتھ زندہ رہنا، زندگی کی حیات آفریں اقدار کو پروان چڑھانا، خوب سے خوب تر کی جستجو کرنا، کامرانی اور مسرت کی جستجو کرنا، اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانا۔۔۔۔ اپنے تخلیقی وجود کا اثبات کرنا ان کا اہم ترین منصب ہے۔ تانیثیت نے افراد، معاشرے، علوم اور جنس کے حوالے سے ایک موزوں ارتباط کی طرف توجہ مبذول کروائی۔ [۲]

نو آبادیاتی ہندوستان میں عورت کے بنیادی حقوق کے حوالے سے جب مغربی اثرات مرتب ہونا شروع ہوئے تو یہاں کے مصنفین نے اس کی حمایت کی اور اپنی تحریروں کے ذریعے خواتین میں یہ شعور بیدار کرنے کی کوشش کی کہ وہ اپنے حقوق کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہوں۔ پہلے پہل راشد الخیری نے اصلاحی ادب کے زمرے میں معاشرتی رویوں کو بہتر بنانے اور تربیت نسواں کا آغاز کیا۔ اسی دوران سجاد حیدر یلدرم نے ہندوستانی عورت کو درپیش مسائل کی طرف توجہ دلائی اور ذہنی سطح کی رفاقت پر زور دیا۔ پہلے پہل ان مصنفین کی حوصلہ شکنی بھی کی گئی لیکن بعد ازاں یہ اثر انگیز ثابت ہوا اور مرد اور خواتین لکھنے والوں کی ایک جماعت تیار ہوئی جس نے سماجی بیداری کا کام کیا۔ لیکن مولوی ممتاز علی، شیخ عبداللہ اور ان کے رفقائے کار کی مسلسل کوششوں سے خواتین کے راہ کی بہت سی رکاوٹیں تحلیل ہونا شروع ہو گئیں۔ تحریک نسواں کے مقاصد اور حاصلات کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہیں کہ:

جدید دنیا میں تحریک حقوق نسواں نئی اور واضح ترجیحات کے ساتھ ابھری ہے اور یوں سیاست، جنس، اختیار و طاقت اور معاشی برابری کے نئے تقاضے ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ نوکریوں اور معاوضوں میں صنفی امتیاز، جنسی استحصال، فیصلے کے عمل میں عورت کی عدم شراکت کا اصول اور ایسے ہی کئی استحصالی مظاہروں نے عورت کو اس ناانصافی سے نجات حاصل کرنے پر آمادہ کر دیا ہے جو تہذیب و تمدن کے ہر ارتقائی مرحلے پر عورت کے ساتھ روا رکھی گئی۔ [۳]

شمس الرحمٰن فاروقی عورت اور مرد کے سماج میں مساوی کردار کے حوالے سے لکھتے ہیں:

۔۔۔۔یہ کہنا غلط ہے کہ عورت بطور صنف نازک مرد کے مقابلے میں کمزور یا کم عقل ہے۔ یہ بھی کہنا غلط ہے کہ بعض خصوصیات مثلاً نازک دلی، رقیق القلبی، شرم وحیا ضد وغیرہ عورتوں میں مردوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں عورتوں کے بارے میں جو تصورات معاشرے میں رائج ہیں وہ اصلاً اور اصولاً معاشرہ کے وضع کردہ ہیں، حقیقی نہیں۔[۳]

ہندوستانی صورت حال کے پیش نظر مولوی ممتاز علی اور ان کے رفقائے کار کی خدمات قابل ستائش ہیں جنھوں نے نا صرف سماجی اعتبار سے خواتین کے حقوق کے تحفظ کے لیے آواز بلند کی بل کہ خواتین میں بھی یہ شعور بیدار کرنے کی سعی کی کہ وہ اپنے حقوق کے حصول کے لیے کوشش کریں اور کسی دوسری صنف یا جنس کو یہ اجازت نا دیں کہ ان کے حقوق کا استحصال کر سکیں۔ وہ اس کوشش میں کامیاب بھی ہوئے جس کے نتیجے میں بعد ازاں خواتین کی ایک بڑی تعداد نے اپنے حقوق کے حصول کے لیے عملی کوششوں کے ساتھ ساتھ شعور وبیداری نسواں کے لیے اپنی صلاحیتوں کا اظہار کیا اور ایسا ادب تحریر کیا جو بعد میں آنے والوں کے لیے بھی یکساں اہمیت کا حامل تھا۔ اس کا مفصل جائزہ ذیل کی سطور میں پیش کیا گیا ہے۔

حقوق نسواں:

شعور وبیداری نسواں میں تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے خواتین میں اس وقت کی ضرورت کے مطابق شعور ذات پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انھیں اپنی زندگی کا مصرف سمجھانے کی سعی تاکہ ان میں یہ ادراک پیدا ہو کہ انھیں کیوں پیدا کیا گیا؟ ان کی ذات کا مقصد کیا ہے؟ وہ سماجی و قومی ترقی میں کیا کردار ادا کر سکتی ہیں؟ اور اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے کیا کر سکتی ہیں۔ پدر شاہی نظام میں عورت ہمیشہ مسائل کا شکار رہی۔ ریاست، جاگیرداری، سرمایہ داری، مذہب اور سماجی اعتبار سے ہمیشہ اس کا استحصال ہوتا رہا۔ عورت کو انھی مروجہ طریقوں کے مطابق اپنی زندگی گزارنے پر مجبور کیا جاتا۔ اگر وہ ان روایتی معاملات اور سماجی تقاضوں کو پورا کرتی تو اچھی عورت کہلائی جاتی اور اگر اس سے روگردانی کرتی یا کوئی غفلت برتتی تو وہیں سے بری عورت کی مہر اس پر ثبت کر دی جاتی۔ تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے ان مسائل کے پیش نظر خواتین کو یہ باور کروایا کہ وہ محض گھر گرہستی اور فرائض کی انجام دہی کے لیے پیدا نہیں کی گئی ہیں بحیثیت انسان جو حقوق انھیں تفویض کیے گئے ہیں ان کے حصول کے لیے عملی کوشش کرنا ضروری ہے تاکہ معاشرے میں ایک وقار کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے ہندوستانی عورت تعلیم، ازدواجی زندگی سے متعلقہ مسائل، شادی کے معاملے میں لڑکی کی پسند ناپسند کا اختیار، خلع اور طلاق سے متعلقہ مسائل، بیوہ کے لیے بنائے گئے اصول، وراثت اور جائداد میں حصہ، اقتصادی ترقی میں عورت کا کردار، عورت کی سماجی زندگی کی ذیل میں پردے کے مباحث، آزادیِ اظہار اور سیاسی معاملات و مسائل کے حوالے سے ان کے حقوق کے بارے میں آگاہ کیا۔ پدر سری معاشرے میں عورت سے یہ تمام حقوق غصب کیے گئے تھے کہیں مذہب کو بنیاد بنا کر تو کہیں سماجی ڈھانچے کے پیشِ نظر عورت کو ایک خاص دائرے میں مقید رکھا جاتا تھا اور یہ دائرہ مردانہ معاشرے کا کھینچا گیا تھا اس میں مذہب کا سراسر کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ عورت کو محض مذہب کے نام پر مجروح کیا جاتا تھا۔

ذیل کی سطور میں برِ صغیر کی سیاسی و سماجی صورتِ حال کے تناظر میں تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین کا نسائی شعور پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور یہ دیکھا گیا ہے کہ انھوں نے ہندوستانی خواتین کو کن حقوق کے حصول کی خاطر کوشش کرنے کی تلقین کی ہے۔

ا۔ تعلیم نسواں:

تعلیم انسان کو ذی شعور، ذی فہم بنانے اور اس کی فکری آبیاری کے لیے دی جاتی ہے اس میں تعلیم محض کسی خاص طبقے اور کسی خاص جنس کے انسان کے لیے ضروری نہیں بل کہ اس کی اہمیت تمام انسانوں کے لیے یکساں ہے۔ اور خواتین کے لیے تعلیم کی اہمیت تو اس وجہ سے بھی زیادہ ہے کہ اس پر آئندہ نسلوں کی تربیت کی ذمہ داری بھی عائد ہے۔ اگر وہ خود تعلیم یافتہ اور باشعور نہیں ہوگی تو اس سے آئندہ آنی والی نسلوں کا مستقبل تاریک ہونے کے امکانات زیادہ ہو جاتے ہیں۔

نو آبادیاتی صورتِ حال پر نظر دوڑائی جائے تو ہندوستان میں خواتین کے لیے تعلیمی سہولیات میسر نہیں تھی۔ جس کی وجہ سماجی اور مذہبی اجارہ داروں کی فرسودہ خیالی اور روایت پسندی تھی۔ ہندوستان کے رہنے والوں کی نظر میں عورت کے لیے محض اتنی ہی تعلیم کافی تھی کہ وہ مذہبی کتب کا مطالعہ کر لے، اس کے سوا خواتین کے لیے تعلیم کا کوئی خاص مقصد نہیں تھا۔ برطانوی مشنریوں نے جب ہندوستان میں تعلیم نسواں کی کوشش کی تو انھیں غیر ضروری اور مضر سمجھتے ہوئے تمام کاوشیں رد کر دی گئیں۔

بعد ازاں مردانہ رسمی تعلیم کے بعد جب کچھ روشن دماغ تعلیم نسواں کی اہمیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے خواتین کی رسمی تعلیم کے لیے کمربستہ ہوئے، جنھیں خاصی تنقید کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ وہاں یہ تصور رائج تھا کہ اگر عورتوں گھر سے باہر جا کر تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دے دی گئی تو وہ ان کے پنجہ استبداد سے نکل کر بے قابو ہو جائیں گی یا پھر

دوسرے مذہب کی خواتین کی صحبت میں رہتے ہوئے مذہب سے منحرف ہو جائیں گی۔ لیکن ان کی کوششیں آہستہ آہستہ اپنا رنگ دکھانے لگیں اور شرفانے اپنی خواتین کے لیے چار دیواری میں جدید تعلیمی سہولیات کا بندوبست کیا۔ اور یوں ایسی خواتین کی ایک تعداد سامنے آئی جنھوں نے بعد ازاں عام عورت کے لیے بھی تعلیمی سہولیات کی فراہمی کو ممکن بنانے کے لیے آواز اٹھائی۔ ابتدا میں تمام تعلیمات رسائل کے ذریعے پہنچانے کی کوشش کی گئی تاکہ خواتین گھر بیٹھے ان کا مطالعہ کرتے ہوئے تعلیم کی اہمیت کو سمجھ لیں۔ اہلیہ خواجہ حسین علی کے مضمون میں ان مسائل کی عکاسی بھی ملتی ہے ان کے مطابق "جو لوگ تعلیم اسکول کے خلاف ہیں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ کل مضامین جو وہاں پڑھائے جاتے ہیں۔ گھر میں ہی پڑھائے جائیں۔ وہ کسی قسم کی پڑھائی کے خلاف نہیں ہیں بل کہ گھر سے نکل کر باہر جانے اور غیر مذہب استانیوں کی صحبت کے خلاف ہیں۔ اس لیے کہ ان پر برا اثر نہ پڑے۔ مگر ان کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ جب تک زیادہ تعلیم نہ دی جائے گی اور عقلی دلائل سے مذہب کی وقعت دل پر نہ جمائی جائے گی یہ غرض حاصل ہونی مشکل ہے۔ یوں تو ہر شخص بچپن سے اپنے مذہب کا دل دادہ رہتا ہے اور اسی کو سچا سمجھتا ہے۔ مگر اس حالت میں دل میں شک پڑ جانا قرین قیاس ہے۔۔۔۔ مذہب کی حفاظت کے لیے یہ تدبیر کار آمد نہیں ہے کہ غیر مذہب والیوں سے چھپتا رہے۔"[۵]

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے بھی اپنی تحریروں کے ذریعے تعلم کی ضرورت اور اہمیت کو واضح کرنے کی کوشش کی اور یہ کسی حد تک کارگر ثابت ہوئی۔ ان مصنفین نے سماجی مسائل اور وقتی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے خواتین کی تربیت کا آغاز کیا۔ انھوں نے آغاز میں ایسے مضامین کا سلسلہ شروع کیا جن میں عورت کے لیے جدید تعلیم کی اہمیت کو واضح کیا جا سکے لیکن یہ اس قدر آسان نہیں تھا انھوں نے ایسے مضامین شائع کیے جن میں تعلیم یافتہ اور ان پڑھ خواتین کی عادات و اطوار اور خصائص کے تجزیات پیش کیے گئے تاکہ تعلیم نسواں کے حوالے سے لوگوں کے خدشات دور کیے جا سکیں۔ ابتدا میں محض گھر گرہستی، تربیت اطفال اور ذاتی معاملات کے موضوع پر مضامین تحریر کیے گئے بعد ازاں انھیں سماجی دائرہ کار میں رہتے ہوئے خود کو باشعور بنانے کی تربیت دی گئی۔ کیوں کہ ماں کی گود بچے کی پہلی درس گاہ مانی جاتی ہے اور بچہ اپنی عمر کا ابتدائی حصہ زیادہ تر ماں کے ساتھ گزارتا ہے اور بہت سی چیزیں اسی دوران پختہ کر لیتا ہے اس لیے خواتین کی تعلیم کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ پڑھی لکھی ، باشعور ماں ہی سماجی تقاضوں اور وقتی ضروریات کے مطابق اپنے بچے کی بہتر نشو نما اور نگہداشت کر سکتی ہے۔ ابتدائی تعلیم میں ان فرسودہ رسوم و رواج اور توہمات کی حوصلہ شکنی کی گئی جو ان کی بہتر تربیت کے راستے میں آن پڑتی تھی۔ نجمہ سلطانہ عورتوں کی تعلیم کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:

عورت کا ترقی یافتہ ہونا بے حد ضروری ہے خواتین کو ترقی کے دھارے میں لانے کے لیے عورت

کو تعلیم یافتہ بنایا جائے کیوں کہ عورت سماج کا نصف حصہ ہوتی ہے اور اس نصف حصے کو بھی ترقی کے دھارے میں شامل کرنا چاہیے۔ تعلیم سے آراستہ خاتون کو خاندان میں خود مختاری ملتی ہے۔ خواتین زندگی کے مختلف میدانوں میں مردوں کے مقابلے میں پیچھے سمجھی جاتی ہیں اس کی وجہ تعلیم کی کمی ہے۔[۶]

آصفہ خاتون اپنے مضامین میں پدر سری معاشرے کے خلاف ایک نحیف آواز اٹھاتے کی سعی کی۔ انھوں نے خواتین کو ان کے حقوق کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کی ترغیب دی اور یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ جب انسان کا بنیادی حق ہے کہ اسے آزادی سے زندگی بسر کرنے دی جائے تو عورت سے ہمیشہ یہ حق کیوں چھین لیا جاتا ہے؟ خاص طور پر تعلیم کا حق جو عورت میں اتنا شعور پیدا کر دیتی ہے کہ اسے اپنی ذات کا شعور ہو سکے، اس پر کیے جانے والے جبر و زیادتیوں سے آگہی مل سکے تو کیوں معاشرہ اسے تعلیم کے حصول سے روکنے کے لیے طرح طرح کے ہر ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے؟ اپنے ایک مضمون "تعلیم کیوں چھوڑیں" میں انھوں نے اس کا برملا اظہار کیا ہے۔ جس کی مثال ذیل کی سطور میں پیش کی گئی ہے:

۔۔۔عدم تعاون کے سلسلے میں تعلیم نہیں چھوڑنی چاہیے۔ سچ پوچھو۔ تو اتنی عقل ہم میں تعلیم سے ہی آئی ہے۔ کہ ہمیں اپنی قید کا احساس ہوا۔ اگر تعلیم نہ ہوتی تو وہی حالت رہتی۔ اور غلامی کی زنجیریں پڑی رہتیں۔۔۔۔[۷]

ہندوستانی نظام میں تعلیم نسواں کے لیے گنجائش اور مواقع بہت کم تھے۔ خواتین کی تعلیم کے لیے کوشش کرنے والوں کو بھی اس کے لیے کڑی تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ جس سے تعلیم حاصل کرنے والی خواتین کے حوصلے مزید پست ہو گئے۔ ان کے حوصلے بلند کرنے کے لیے ضروری تھا کہ خواتین کو یہ یقین دلایا جائے کہ تعلیمی میدان میں ترقی کوئی جرم نہیں ہے بل کہ یہ ان کا جائز حق ہے۔ اور حصول تعلیم کے بعد ہی خواتین کسی دوسرے میدان میں ترقی کر سکتی ہیں۔ امت الوحی نے بھی تعلیم کو زندگی کے تمام معاملات میں ترقی کا وسیلہ بتایا ہے۔ اس ضمن میں وہ لکھتی ہیں کہ:

یہ واضح رہے کہ ہر کام کے لیے علم کی سخت ضرورت ہے۔ اس لیے میری صلاح یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے علم سیکھنا چاہیے۔ بغیر اس کے کوئی کام خوش اسلوبی سے انجام نہیں پا سکتا۔ علم حاصل کرنے کے بعد بہت سے راستے انسان کے واسطے کھل جاتے ہیں۔ جن سے وہ اپنی زندگی کو خوشگوار بنا سکتا ہے۔[۸]

بنت کبریٰ نے اپنے مضامین میں ہندوستانی معاشرے میں تعلیم یافتہ عورت کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کی مخالفت کی اور یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ محض تعلیم یافتہ ہو جانا بھی عورت کا جرم قرار پاتا ہے۔

بہت سے عیوب جو بظاہر کسی طور عیب نہیں ہیں انھیں بھی محض تعلیم کے ساتھ جوڑ کر لڑکیوں کی تعلیم کی مخالفت کی جاتی ہے۔ اپنے مضمون "منصفانہ نظر" میں اس رویے کے حوالے سے وہ یوں رقمطراز ہیں کہ:

> ۔۔۔بات اصل یہ ہے کہ آج کل اس قسم کی لڑکیوں کی جنھیں انگریزی تعلیم میں کچھ دخل ہے۔ سخت مشکل میں جان ہے۔ کچھ لکھ پڑھ کر تو اور بھی طعن و تشنیع کا نشانہ بن گئیں۔ عیب کی متلاشی نگاہیں ان پر پڑتی ہیں۔ اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر عیب نکالتی ہیں۔ غرض جہالت میں اور طرح طرح کی مصیبت تھی اور اس میں اور قسم کی آفت۔۔۔۹

خدیجۃ الکبریٰ مروجہ "تعلیم نسواں نمبر ۲"۱۰ میں سماجی صورت حال کو پیش کرتے ہوئے جدید تعلیم اور قدیم تدریسی طریقہ کار پر قلم اٹھاتے ہوئے جدید تعلیم کی حمایت بھی کرتی ہیں۔

ہندوستانی سماجی نظام میں پردے کو بنیاد بنا کر خواتین کو تعلیم سے محروم رکھا جاتا تھا۔ ایسی لڑکیاں جن کے گھروں میں پردے کی سختی کی جاتی تھی ان کے لیے تعلیم کا حصول ناممکن تھا۔ بجائے اس کے کہ مناسب پردے کے اقدامات کر کے خواتین کو تعلیمی سہولیات فراہم کی جائیں وہاں کے لوگوں نے بے پردگی کے ڈر سے لڑکیوں کی تعلیم سے انکار کر دیا۔ مناسب پردے کے بندوبست کے بعد اس سفر کو یقینی بنایا جا سکتا تھا۔ تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے اس اہم مسئلے پر قلم اٹھایا کہ بجائے اس کے کہ عورتوں کو محروم رکھا جائے ان کے لیے پردے کے اقدامات کیے جانے چاہیں۔ اس کی مثال ذیل میں پیش کی گئی ہے:

> ۔۔۔ہر ایک شہر میں میونسپلٹی کی طرف سے ایسے مدرسے قائم کیے گئے ہیں جہاں نارمل سکولوں کی سیکھی ہوئی استانیاں مقرر ہیں۔ لیکن ان مدرسوں میں یہ بڑی خرابی ہے کہ مذہبی تعلیم جس کی ہر ایک مسلمان کو اشد ضرورت ہے بالکل نہیں دی جاتی۔ اور پردہ کا بھی پورا انتظام نہیں کیا جاتا۔ اس سبب سے اکثر شریف لوگ اپنی لڑکیوں کو ایسے مدرسوں میں تعلیم دلوانا پسند نہیں کرتے۔ اور اپنے اپنے مکان پر ہی تعلیم کا بندوبست کر لیتے ہیں۔۔۔"

تعلیم کی اہمیت بیان کرتے ہوئے ثریا عندلیب نے اس بات کی حمایت کی ہے کہ علم ہی ان کے دلوں کو منور کرے گا اور وہ اس کے ذریعے بہت سی ایسی معاشرتی برائیوں کے ارتکاب سے بچ جائیں گی جو ناسمجھی میں ان سے ہو جاتی ہیں:

> تو عورت ہے اس لیے سراپا محبت و عفت ہو جا۔
> یہ جان لے کہ عورت و حیا ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ خوش مزاجی کو اپنا مسلک بنا۔ مگر تمسخر سے اپنا دامن بچا۔
> اکتساب علم کر۔ وہ علم جس کی روشنی میں تیرا ضمیر اس قدر بیدار اور حساس ہو جائے کہ تجھ میں

برائی کی طرف مائل ہونے کی سکت بھی باقی نہ رہے
پھر تو ایک بہترین انسان بن جائے گی۔"[۱۲]

تہذیب نسواں میں لکھنے والی کچھ خواتین ایسی تھیں جو تعلیم نسواں کی حمایت تو کرتی تھیں لیکن اعلیٰ تعلیم کے حصول کے خلاف تھیں۔ ان کے مطابق عورتوں کو اللہ نے عقل و شعور تو عطا کیا ہے لیکن ان کے لیے محض دینی تعلیم ہی کافی ہے۔ ان کو اعلی تعلیم اس حد تک دی جائے کہ وہ دینی علوم سیکھ جائیں تا کہ ان کے گھریلو کام کاج کا ہرج نہ ہو۔ انھیں جس مقصد کے تحت پیدا کیا گیا ہے اس کام میں کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔ وہ اپنی اکثر تحریروں میں تعلیم نسواں کی محض اس لیے ضرورت محسوس کرتی ہیں کیوں کہ ان کا کام محض تربیت اولاد ہے اور عورت اولاد کی پہلی درسگاہ ہوتی ہے۔ نجمہ امتیاز علی اس ضمن میں یوں لکھتی ہیں:

اگر اب مسلمانوں کو لائق تربیت یافتہ اولاد کی ضرورت ہے تو وہ اپنے ہادی برحق کے قول و فعل کی تقلید کریں۔ جو حصول تعلیم کو مرد عورت دونوں پر یکساں واجب فرماتے ہیں۔ جب تک ہماری معاشرت صحیح اور ہم عورتوں کی تعلیم درست نہ ہو گی ہمارے بچے لائق نہیں بن سکتے۔"[۱۳]

نو آبادیاتی ہندوستان میں تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے متعدد کوششیں کی گئیں۔ ان میں پہلے پہل گھر کے اندر چار دیواری میں خواتین کے لیے ابتدائی تعلیمی سہولیات میسر کی گئیں بعد ازاں دیگر اقوام کی طرح مسلم خواتین کی رسمی تعلیم کی ضرورت کو محسوس کیا گیا لیکن اس دوران یہ مسئلہ آڑے آیا کہ رسمی تعلیمی ادارے تمام اقوام کی مستورات کے لیے یکساں تعلیمی سہولیات فراہم کرتے تھے لیکن مسلم گھرانوں کی کچھ فرسودہ خیالی ان کے راہ کی رکاوٹ بنی ہوئی تھی انھیں لگتا تھا کہ ان کی خواتین اگر دیگر مذاہب کی خواتین کے ساتھ تعلیم حاصل کر لیں گی تو شاید خدانہ خواستہ تبدیلی مذہب اختیار کر لیں گی یا پھر اخلاقی قدریں مجروح ہو جائیں گی۔ یہ تعصب محض مردوں میں موجود نہ تھا بعض خواتین نے بھی اس حوالے سے اپنے خدشات کا اظہار کیا ہے۔ اور مسلم خواتین کے لیے الگ سے اسکولوں کی ضرورت کا تقاضا کیا ہے۔ م۔ خ۔ بدایونی اس حوالے سے یوں لکھتی ہیں:

چند سکولوں کو چھوڑ کر جو سکول عام طور پر اس وقت لڑکیوں کے واسطے رائج ہیں وہ ہمارے لیے بالکل بیکار ہیں۔ اور شاید ان اسکولوں میں کوئی شریف لڑکی تعلیم نہیں پاتی ہے۔ اور کوئی شخص بھی چاہے کتنا ہی تعلیم نسواں کا حامی ہو یہ گوارا نہیں کرے گا کہ ہماری لڑکیاں ان اسکولوں میں تعلیم پائیں کیوں کہ ان اسکولوں میں رذیل قوم کی لڑکیوں کی صحبت میں رہ کر شریف لڑکیوں کے اخلاق پر بہت برا اثر پڑنے گا۔۔۔۔"[۱۴]

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے اپنے مضامین میں جہاں تعلیم کو خواتین کا بنیادی حق تسلیم

کرتے ہوئے تعلیم نسواں کی پر زور حمایت کی ہے وہیں وہ ان مستورات کو تنبیہ کرتی بھی نظر آتی ہیں جو تعلیم کے حصول کے بعد اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کو بوجھ سمجھ کر ان سے سبکدوش ہو گئی ہیں۔ محض فرائض کی انجام دہی تک ہی نہیں بل کہ ان خواتین کے مزاج میں آنے والے فرق کو بھی ہدف تنقید بنایا گیا ہے اور انھیں یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان کا یہ رویہ کسی طور بھی قابل قبول نہیں ہے کیوں کہ تعلیم نسواں کے فروغ میں مردانہ معاشرے کے یہی خدشات ایک عرصہ تک مستورات کی تعلیمی راہ کی رکاوٹ بنے رہے اور ایک عرصہ گزرنے کے بعد اس سوچ کو بدلا گیا کہ ضروری نہیں تعلیم ہی خواتین کے مزاج کو خراب کرنے کا باعث بنے گی۔ خواتین کو یہ باور کروایا گیا کہ اگر وہ ایسے برتاؤ کریں گی تو ان کی وجہ سے آئندہ آنے والی خواتین کی تعلیم کی راہیں پھر سے رکاوٹ کا شکار ہو جائیں گی۔ اور مردانہ پیشین گوئیاں سچ ثابت ہو جائیں گی۔ اس لیے ضروری ہے کہ تعلیم کے حصول کے بعد اپنی روایات، اپنے رسوم و رواج اور اخلاقیات پر خاص توجہ دیں ورنہ سب کے لیے مشکل کا باعث بن جائیں گی۔ اخلاق نسواں کے ضمن میں فاطمہ صغرا بیگم اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہیں۔

> ۔۔۔۔حامی تعلیم نسواں بزرگوں کو خاص طور سے اس طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ ورنہ زنانہ تعلیم کے لیے ان کی کوشش ضرور لاطایل ثابت ہوگی۔ کیوں کہ عام طور سے لوگ اصل سبب پر غور نہیں کرتے اور جس کے اول روز سے مخالف ہیں۔ اس کو پکڑ کر مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ اگرچہ ان کا یہ طرز عمل بہت غیر مناسب ہے لیکن پھر بھی وہ اس سے باز نہیں رہ سکتے۔ اس لیے ضروری ہے کہ تعلیم نسواں کی چلتی گاڑی میں روڑا اٹکے اور حامیان تعلیم کی کوشش محض رایگاں جائے۔۔۔۔۔اس وقت اخلاق نسواں توجہ کا محتاج ہے جو تھوڑی سی غفلت سے بالکل ہی نیست و نابود ہو جائے گا۔ جس کا نتیجہ تمام قوم کو بھگتنا پڑے گا۔[۵]

وحیدہ یعقوب نے ہندوستانی معاشرے میں تعلیم نسواں کی راہ میں درپیش مسائل کا احاطہ کیا۔ انھوں نے خواتین کو یہ تلقین کی کہ تعلیم کے حصول کی خاطر اپنے گھر کے ماحول کو خراب مت ہونے دیں بل کہ اپنے اچھے اخلاق اور قابلیت سے ایسا ماحول پیدا کریں کہ مرد خود بخود تعلیم کی اہمیت کو سراہنے لگیں۔ انھوں نے مستوراتِ ہندوستان کو یہ بھی باور کروایا کہ فی زمانہ مردوں سے ضد کر کے یا ان کے مخالف جا کر کوئی قدم اٹھانا عقل مندی نہیں ہے یوں تو اجارہ دار طبقہ اور مشکلات کھڑی کر دے گا۔ بہتری اسی میں ہے کہ مفاہمت کا راستہ اختیار کرتے ہوئے اپنے مقاصد کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔ اس ضمن میں تعلیم یافتہ خواتین کو تاکید کرتے ہوئی لکھتی ہیں کہ:

> اگر تعلیم یافتہ بیویاں اپنے شوہروں کو رضامند رکھنے کی کوشش کریں گی تو ان کو تعلیم نسواں کے پھیلانے کا شوق ہو گا۔ اور اگر انھوں نے اپنے شوہروں کی پاس داری اور خاطر داری نہ کی تو مرد تعلیم نسواں کے مخالف ہو جائیں گے۔ اور چوں کہ عورتوں کی تعلیم کم از کم ہندوستان میں اب

تک بالکل مردوں کے ہاتھوں میں ہے۔اس واسطے اگر مردوں نے تعلیم یافتہ بیبیوں کے برتاؤ کا
ناپسند کیا تو عورتوں کی ترقی کا راستہ بند ہو جائے گا۔[۱۶]

ہندوستان میں تعلیم نسواں کی تحریک کے فروغ کے بعد ہندوستانی عوام میں ایک رد عمل پیدا ہوا۔ بعض ایسی خواتین سامنے آئیں جنھوں نے تعلیم کے حصول کے بعد ریت رواج کو یکسر نظر انداز کرنا شروع کر دیا بل کہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ کہ جانتے بوجھتے روایت سے انحراف کی راہ اپنائی جس سے تعلیم نسواں کے حوالے سے مخالف فرقے کے تحفظات سچ ثابت ہونا شروع ہو گئے۔ اس سے یہ خطرہ بھی پیدا ہوا کہ آئندہ خواتین کی تعلیمی ترقی پھر سے متاثر ہو گی اور معاشرے کا بااثر فرقہ اس سے متعلق اپنی رائے دینے سے گریز نہیں کرے گا۔ ایسی صورت میں بعض باشعور مصنفین نے ایسے مضامین تخلیق کیے کہ خواتین کو ضروری ہدایات دی جا سکیں اور انھیں حدود کو مد نظر رکھتے ہوئے جدید علوم فنون سکھائے جائیں تاکہ آئندہ آنے والی خواتین ان کے کسی بھی عمل سے متاثر نہ ہوں۔ اس سلسلے میں تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے بھی سماجی معاملات و مسائل کو مد نظر رکھتے ہوئے تعلیم نسواں کی راہ ہموار کرنے کے لیے اپنے نظریات پیش کیے۔بشیر بیگم تعلیم نسواں کی اہمیت واضح کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:

> کل عمدہ باتیں خیالات کی درستی پر موقوف ہیں،اور خیالات کی درستی اس قت تک نہیں ہو سکتی،جب تک تعلیم نہ ہو گی۔کیوں کہ علم ہی وہ آلہ ہے جو جہالت کے زنگ کو صیقل کر کے دور کر سکتا ہے۔[۱۷]

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے جہاں تعلیم نسواں کی حمایت کی ہے وہیں اس تعصب کی مخالفت بھی کرتی نظر آتی ہیں جو تعلیم یافتہ عورتوں کے حوالے سے پایا جاتا ہے۔ انھوں نے ایسی خواتین کا تذکرہ کیا ہے جو اگر اچھی عبارت لکھ لیں تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ کسی مرد سے لکھوائی ہے گویا ان کے نزدیک عورت کا اچھی عبارت لکھنا کوئی انوکھی بات ہے۔ ہمشیرہ مراد میاں اپنے مضمون "عورتوں کی تعلیم" میں اس کی مذمت ان الفاظ میں کرتی ہیں:

> ۔۔۔مجھے اس بات کا ضرور افسوس اور رنج معلوم ہوتا ہے۔جب کسی کا ایسا خیال ظاہر ہوتا کہ عورتوں میں کوئی ایک بھی لائق نہیں یہاں تک کہ اگر کسی نے کوئی مضمون اچھا لکھ دیا تو خیال کیا جاتا ہے کہ یہ مرد سے لکھوایا ہے۔۔۔۔[۱۸]

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین کو اس بات کا ادراک تھا کہ ایک خاص اور یکساں ماحول میں رہتے ہوئے خواتین اس طرح سے نہیں سیکھ پاتیں جو وہ ایک باقاعدہ ماحول میں جا کر سیکھ سکتی ہیں۔اس امر کی اہمیت اجاگر

کرنے کی خاطر مستورات نے بھی مضامین لکھے تا کہ خواتین کی رسمی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا جاسکے۔

تہذیبِ نسواں کی مضمون نگار خواتین نے حالات وواقعات کو سمجھتے ہوئے ہندوستانی خواتین میں یہ شعور پیدا کرنے کی سعی کی کہ تعلیم ان کا بنیادی حق ہے اور انھیں اپنے اس حق کے حصول کے لیے کوشاں ہونا چاہیے۔ اس ضمن میں چند خواتین کے مضامین درج ذیل ہیں:

مضمون نگار	مضمون کا عنوان
بیگم ڈاکٹر ایوب خاں	مذہبی تعلیم[۱۹]
شاہزادجہاں بیگم	تعلیم نسواں کی ترقی[۲۰]
ایضاً	اصلاح مسلم خواتین[۲۱]
ایضاً	تعلیم نسواں کے متعلق غلط فہمی[۲۲]
ہاجرہ	ہماری تعلیم[۲۳]
جمیلہ بیگم	تعلیم یافتہ خواتین کا مستقبل[۲۴]
ایضاً	بچی کی تعلیم[۲۵]
بیگم شارق	تعلیم نسواں پر ایک نظر[۲۶]
ہمشیرہ مراد میاں	عورتوں کی تعلیم[۲۷]
امت الوحی	لڑکیوں کی تعلیم سے بے پروائی[۲۸]
مسز حامد علی	ہماری موجودہ تعلیم[۲۹]
ب،ز،ب	تعلیم نسواں[۳۰]
ط۔خ	عورتوں کو اعلیٰ تعلیم[۳۱]
بیگم یار محمد خاں	تعلیم نسواں اور دعوتِ عمل[۳۲]
ایضاً	ہماری تعلیمی پستی کا واحد سبب[۳۳]
فاطمہ بیگم	عورتوں کی تعلیم[۳۴]
جانِ جہاں	تعلیم نسواں[۳۵]
رفعیہ بیگم	انگریزی تعلیم نسواں[۳۶]
سردار محمدی بیگم	عورتوں کو لکھنا پڑھنا سکھانا[۳۷]

ہمشیرہ احمد مبین	تعلیم کیوں چھوڑیں[38]
امۃ الحمید	عورتوں کی تعلیم[39]
ایضاً	مسلم گرلز سکول علی گڑھ[40]
مسز سید احمد مچھلی شہری	علی گڑھ میں مسلم خواتین کے لیے ڈگری کالج[41]
حسینی بیگم	زنانہ مدرسہ[42]
مبارک دلھن	مسلم انجمن گرل اسکول[43]
بنت مظفر کریم	مسلم گرلز سکول میرٹھ[44]
سعیدہ خاتون	دیہاتی لڑکیوں کا شوق تعلیم[45]
اہلیہ عبد الباری	علم کے ساتھ ہنر بھی[46]
کیو۔ایس۔کے	آج کل کی لڑکیوں کا تعلیمی شوق[47]
مبارک دلھن	غیر تعلیم یافتہ لڑکیوں کی شادی[48]

۲۔ازدواجی زندگی سے متعلقہ معاملات:

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔اس نے تمام انسانوں کے برابر کے حقوق وضع کیے ہیں تاکہ معاشرہ عدم توازن کا شکار نہ ہو جائے لیکن برصغیر کے لوگوں کی مخلوط رہائش سے ہمارے نام نہاد سماجی اصول ان اصولوں پر حاوی آگئے جو انسان کا اصل مقصد حیات ہیں۔ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے اثرات مسلمانوں پر اس قدر واضح مرتب ہوئے کہ وہ اپنے ضابطہ حیات کو فراموش کر بیٹھے اور اس سے سماجی سطح پر مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے ان مسائل کو مد نظر رکھتے ہوئے ایسے مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا جس نے عورتوں کی ذہنی و فکری آبیاری تو کی ہی ساتھ ساتھ انھیں اپنے جائز حقوق کے بارے میں علم بھی ہو جائے کیوں کہ اکثریت ایسی خواتین کی تھی جنھیں اپنے اصل حقوق سے واقفیت نہیں تھی۔اسی وجہ سے وہ ایسی زندگیاں گزارنے پر مجبور تھیں جو ایک عام انسان کی زندگی سے مختلف ہوتی ہیں۔ازدواجی زندگی سے متعلق جن مسائل و مباحث کو اہمیت دی گئی ان میں شادی کے متعلق عورت کی پسند ناپسند کا خیال، صغر سنی کی منگنیوں اور شادیوں سے گریز، خلع کا حق، جہیز اور حق مہر سے متعلقہ معاملات، بیوہ کے لیے بنائے گئے اصول اور اسلام میں بیوہ کے حقوق وغیرہ جیسے موضوعات

شامل ہیں۔ ان مضامین میں عورت اور مرد کے حقوق و فرائض کو موضوع بنایا گیا۔ اس حوالے سے تفصیل ذیل کی سطور میں ہے۔

۲.۱۔ شادی کے معاملات میں عورت کے اختیارات:

شادی دو افراد کے مابین عمر بھر کا معاہدہ ہے جسے نبھانا اسی صورت میں ممکن ہے جب مرد اور عورت کی طبیعتیں ایک دوسرے سے میل کھاتی ہوں اور ان کی ذہنی ہم آہنگی ہو۔ لیکن ہندوستانی معاشرے میں شادی کے وقت اس پہلو پر کبھی غور نہیں کیا گیا۔ رشتہ ازدواج میں منسلک کرتے وقت مرد و عورت اور بالخصوص عورت سے کبھی اس کی پسند ناپسند نہیں پوچھی گئی بل کہ اسے معیوب سمجھا گیا کہ لڑکی اپنے لیے بر کا انتخاب کرے یا پھر اس سلسلے میں اپنی رائے کا اظہار کرے۔ حالانکہ اسلامی احکامات اور قوانین کے مطابق بھی لڑکیوں کا شادی کے لیے رضامند ہونا ضروری قرار دیا گیا۔ انھیں ان کی مرضی کے بنا کسی کے ساتھ منسوب کر دینا کسی طور جائز نہیں ہے۔

تہذیب نسواں میں اس حوالے سے مضامین لکھے گئے تاکہ خواتین کے لیے یہ مشکل مرحلہ بھی آسان ہو اور وہ اپنی رائے دینے کا حق حاصل کر سکیں۔ اس معاملے کی نزاکت سمجھتے ہوئے متعدد خواتین نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے اس سلسلے میں پیش آنے والے مسائل کا احاطہ بھی کیا اور اس مشکل سے بچنے کا راستہ بھی تجویز کیا۔ ان کے مطابق ہندوستانی مخلوط تہذیب سے بہت سے ایسے مسائل نے جنم لیا ہے جو ہماری اسلامی روایات اور احکامات کے خلاف ہیں۔ ہمیں اپنی زندگی ان اصولوں کے مطابق بسر کرنی چاہیے جو اسلام میں ضروری ہیں۔ تہذیب نسواں میں اس کی مثال یوں ملتی ہے:

> جب ہندوستان میں اسلام آیا تو بہت سے ہندو بھی وقتاً فوقتاً مسلمان ہوتے گئے۔ چنانچہ اب ہندوستان میں زیادہ تر مسلمانوں کی تعداد نو مسلموں کی ہے۔ شاہانِ اسلام کے ساتھ باہر سے بہت کم لوگ ہندوستان میں آئے تھے اور جو آئے تھے ان پر بھی صدیوں میں ہندوؤں کا رنگ جم گیا۔ فاتحین ملک مفتوحان کے رواج سے مفتوح ہو گئے۔ شادی کے موقعوں پر لڑکی لڑکا آپس میں دیکھ بھال سے محروم ہو گئے۔ اگرچہ قرآن میں صاف لکھا ہے "فانکحوا ماطاب لکم" یعنی نکاح کرو اس سے جو تم کو پسند آئے (نہ کہ جو تمھارے اعزا و اقربا کو پسند آئے)۔۔۔[۳۹]

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں عورت کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی شادی کے معاملے میں اپنی رائے کا اظہار کر سکتی ہے لیکن ہندوستانی معاشرے کی حدود و بندیاں اسے یہ کرنے سے باز رکھتی ہیں۔ تہذیب نسواں کی خواتین نے اپنی فہم و فراست سے اس مسئلے کو سلجھانے کے لیے اپنی بہترین آرا اور مشوروں سے نوازا۔ (شادی کے معاملے میں عورت کے اختیارات کے حوالے سے تہذیبِ نسواں کی مضمون نگار خواتین کی

آگہی اور شعور کے حوالے سے تفصیلی جائزہ باب چہارم میں لیا گیا ہے۔)

۲.۲۔صغر سنی کی منگنی اور شادی:

نو آبادیاتی ہندوستان کے دیگر مسائل میں ایک مسئلہ صغر سنی منگنی اور نکاح بھی تھا۔شادی کے لیے لڑکے اور لڑکی کا بالغ ہونا ایک لازمی شرط ہے جسے یکسر نظر انداز کر دیا گیا اور بچپن ہی میں بچوں کی منگنیاں اور نکاح طے کر دیے جانے لگے جس سے بعد ازاں متعدد مسائل نے جنم لیا۔کم سنی میں لڑکا اور لڑکی دونوں اس قابل نہیں ہوتے کہ اپنی زندگی کے اتنے بڑے فیصلے کے بارے میں کوئی رائے دے سکیں۔ جس سے بعد ازاں دونوں کی زندگی پر برا اثر پڑتا ہے۔ بعض تو خاندانی دباؤ اور جھوٹی شان کو قائم رکھنے کے پیش نظر اس رشتے کو نبھانے کی سعی بھی کرتے لیکن اس کے نتائج اچھے نہیں آتے ۔ بعض اوقات تو دونوں میں باہمی محبت کا رشتہ بھی نہیں بن پاتا اور زندگی مشکل ہو جاتی ہے۔تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے اس حوالے سے والدین اور بزرگوں کو ان کی ذمہ داری کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے اور یہ باور کروایا ہے کہ ان کے ایسے فیصلے ان کی زندگی میں مشکلات کا باعث بن سکتے ہیں۔اس لیے انھیں چاہیے کہ شریعت کے مطابق بچوں کی شادی کی جائے تاکہ وہ سرخرو ہو کر خوش وخرم زندگی بسر کر سکیں۔ بچپن اور پیدائش کے وقت کی منگنی کے حوالے سے ایم جے بیگم اپنے خیالات کی عکاسی یوں کرتی ہیں:

> اول تو یہ رسم ہمارے مذہب کے خلاف ہے۔شرع صاف طور سے یہ بتاتی ہے کہ شادی کے لیے عورت اور مرد کی رضامندی ضروری ہو۔ بھلا پیدائش کے وقت ان معصوم بے زبان بچوں سے کون کچھ دریافت کر سکتا ہے اور بالفرض محال ان دونوں میں سے ایک اس قابل ہے جو بول سکتا ہے تو اس کی عمر اتنی نہیں کہ جو وہ اس قدر اہم مسئلہ پر کوئی رائے زنی کر سکے۔لہٰذا محض والدین کی خوشی اور مرضی شرع اور قانون کے اعتبار سے قابل تسلیم و وقعت نہیں۔[۵۰]

ان مصنفین نے صغر سنی کی منگنیوں اور شادیوں کی مخالفت کرتے ہوئے یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ بچپن میں کی جانے والی منگنی کی رسم سراسر شرع کے خلاف ہے۔اسلامی تعلیمات کے مطابق شادی کے معاملے میں عورت اور مرد کا باہم متفق ہونا بہت ضروری ہے اگر وہ متفق نہیں ہوں گے تو ان کی پوری زندگی محض رشتہ نبھانے میں گزر جائے گی اور ان میں کبھی ذہنی موافقت پیدا نہیں ہو پائے گی۔ لیکن ہندوستانی سماج میں پیدائش کے وقت ہی بچوں کی منگنی کر دی جاتی ہے اس وقت جب بچہ خود اپنی ذات سے بھی واقف نہیں ہوتا تو وہ اپنی زندگی کے اتنے بڑے فیصلے پر کیا بات کر سکتا ہے۔(یہاں محض صغر سنی کے منگنی اور کم عمری کی شادی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔اس ضمن میں تفصیلی معلومات باب چہارم میں پیش کی گئی ہیں۔)

۳.۲۔ خلع اور تنسیخ نکاح کے مسائل:

اسلام نے تمام انسانیت کے لیے زندگی کے معاملات آسان کیے۔ اس میں مرد وزن کو ان کے بنیادی حقوق تفویض کر کے زندگیاں آسان بنائی گئیں۔ اسلام وہ پہلا مذہب ہے جس میں عورتوں کو ایک خاص مقام و مرتبہ عطا کیا گیا۔ اس سے پہلے یہ طبقہ زبوں حالی کا شکار تھا۔ اسلام نے عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دیے۔ لیکن اس کے باوجود ہندوستان کی مسلم خواتین کے ساتھ بھی ایسا سلوک روا رکھا گیا جو ہندو خواتین کے ساتھ رکھا جاتا تھا، انھیں بھی وہ بنیادی انسانی حقوق نہیں دیے گئے اور ان تمام حقوق و مراعات سے دور رکھا گیا جو اسلام نے تفویض کیے تھے۔ اس میں سماج اور معاشرتی رویوں کا بڑا دخل تھا۔ سماجی اعتبار سے عورت کی اہمیت کو کبھی قبول نہیں کیا گیا۔ اسے ہمیشہ ایک ادنیٰ درجے کی کم عقل مخلوق سمجھا گیا۔ نا صرف یہ بل کہ زندگی کے بسر ان کے لیے بھی اس کی رائے کو کوئی اہمیت نہ دی گئی۔ جن ملکی قوانین میں عورتوں کے حقوق کے حصول کے لیے بل پاس کیے گئے تو علمائے کرام نے بھی اس کی خلاف ورزی کی۔ اسی میں ایک اہم نکتہ شادی بیاہ سے متعلقہ مسائل کا تھا۔

اسلام نے عورت کو یہ آزادی دی ہے کہ وہ اگر کسی ایسے شخص کے ساتھ نہ رہنا چاہے تو اس سے علیحدگی اختیار کر سکتی ہے۔ اسے خلع کا حق کہا جاتا ہے۔ تہذیب نسواں میں بھی اس مسئلے کے لیے متعدد مضامین لکھے گئے جس میں خواتین کو اس حق کے حصول کے لیے باشعور بنانے کی کوششیں کی گئیں۔ عام طور پر کوئی عورت اگر اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کرنا چاہے تو اسے حقارت بھری نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اور اس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں بنائی جانے لگتی ہیں۔ لیکن اگر شوہر اور بیوی میں باہمی تفاوت کا رشتہ قائم نہیں ہو رہا یا پھر شوہر کی کسی خصلت کی وجہ سے وہ اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہ رہی تو اسے جبراً اس رشتے کو قائم رکھنے پر مجبور نہیں کیا جانا چاہیے۔

خلع کی طرح عورت یہ حق بھی رکھتی ہے کہ اگر اسے اس کا شوہر حق خلع نہیں دے رہا تو وہ قانون کی مدد لیتے ہوئے تنسیخ نکاح کرے۔ اور قانون ساز اداروں کو بھی اس سلسلے میں خواتین کی امداد کرنی چاہیے۔ اس سلسلے میں مضمون نگار خواتین کے ساتھ ساتھ مرد مصنفین نے بھی عورتوں کے حق میں آواز اٹھائی۔ تنسیخ نکاح کے حوالے سے اس کی مثال یوں ملتی ہے:

> ۔۔۔۔ تفویض طلاق بوقت نکاح کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ یعنی یہ کہ نکاح کے وقت لڑکی کو یہ اختیار دے دیا جائے کہ فلاں حالات کے پیش آنے پر وہ اپنے نکاح کو تنسیخ کر سکتی ہے۔ یہ طریق اختیار کرنا ہو تو ایک دستاویز جس کا نام ""کابین نامہ " ہے۔ نکاح کے وقت تحریری کر دیا جائے۔ جس میں عورت کو یہ اختیار دیا جائے کہ فلاں صورتوں میں وہ قاضی کو درمیان میں ڈالے بغیر نکاح تنسیخ کر سکتی ہے۔[۵۱]

امت الوحی نے اپنے مضمون "گلا گھونٹ نکاح" ۵۴ میں شادی بیاہ کے معاملات اور خلع کے مسئلے پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ان کے مطابق ہندوستانی عورت کے زیادہ تر مسائل کی ذمہ داری مرد معاشرے اور مذہبی اجارہ دار طبقے پر عائد ہوتی ہے کیوں کہ انھوں نے شرعی معاملات کو بھی رسوم ورواج میں اس طرح خلط ملط کر دیا کہ عورت اپنے جائز حقوق سے محروم ہے۔ ہندوستان میں عورت چاہتے ہوئے بھی شرعی معاملات پر کچھ نہیں بول سکتی۔ اس مضمون میں انھوں نے رشتہ ازدواج کے حوالے سے خلع کے مسئلے پر بھی اظہار خیال کیا۔ ان کے مطابق بہت سی ایسی خواتین ہیں جو نام نہاد روایات کے چکر میں زبوں حالی کا شکار ہیں اور ایسے مردوں کے ساتھ نباہ کرنے پر مجبور ہیں جو ان کے حقوق نظر انداز کر رہے ہیں اور مثل کسی حیوان کے کے برتاؤ کر رہے ہیں۔

۲.۵۔ بیوہ کے لیے بنائے گئے اصول:

ہندوستانی معاشرے میں بیوہ عورت کی زندگی کسی طور بہتر نہیں ہے۔ شوہر کی وفات کے بعد عورت کو اس کی بنیادی انسانی حقوق سے بھی محروم کر دیا جاتا ہے۔ اسے کسی خوشی غمی میں جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اپنی مرضی سے لباس کے انتخاب تک سے روک لیا جاتا ہے یعنی زندگی کی خوشیوں کا راستہ اس کی طرف سے موڑ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح جائیداد میں بھی اس کے مختص حق کو چھین لیا جاتا ہے وہ ہر معاملے میں دوسروں کی محتاج ہو کر کسم پرسی کے عالم میں زندگی گزارنے پر مجبور ہے حالاں کہ اسلامی قانون کے حوالے سے دیکھا جائے تو ایک عورت کا شوہر اگر وفات پا گیا ہو تو اسے دوسری شادی کا حق ہے لیکن ہندوستانی معاشرے میں خود کار اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے عورت کو اس حق سے بھی محروم کیا جاتا ہے۔ تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے بیوگان میں یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ عورت کو اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنی چاہیے تاکہ لوگوں کی مرہون منت نہ رہیں اور اپنی ضروریات پوری کرنے کی خاطر کسی دوسرے کی امداد کا انتظار نہ کرتی رہیں۔

شوہر کی وفات کے بعد اسے بھی اپنی زندگی جینے کا پورا حق حاصل ہے۔ وہ چاہے تو اپنی عدت کی تکمیل کے بعد عقد کر سکتی ہے۔ اسلامی تعلیمات میں بھی اسے یہ حق تفویض کیا گیا ہے کہ وہ بطور ایک عام انسان اپنی زندگی کا بسر ان کرے۔

یہاں بھی مسلمان ہندو رسوم ورواج کے زیر اثر نظر آتے ہیں ہندوؤں میں شوہر کے انتقال کے بعد اس کی بیوہ کو کھونٹے سے بندھا رہنے پر مجبور کیا جاتا تھا اور زندگی کی خوشیوں کے تمام در اس پر بند رکھے جاتے تھے لیکن جدیدیت کی لہر سے وہاں بھی تبدیلیاں رونما ہوئی اور انسانی حقوق کے پیش رو کی وجہ سے ہندوں نے بھی اپنے رسوم و رواج میں اصلاحات کیں لیکن مسلمان اب بھی وہیں کھڑے ہیں۔ ان نظریات کے متعلق مسز جی۔ ایم قریشی لکھتی

ہیں کہ:

---ہم لوگ اپنی ہر خوبی کو غیر مذہب والوں کے لیے چھوڑ رہے ہیں اور وہ لوگ اسے اختیار کر کے مہذب بنتے جا رہے ہیں۔ دیکھیے ہندوؤں میں نکاح ثانی کا پرچار کیسے ہو رہا ہے۔ ملک بھر میں انجمنیں بن گئی ہیں۔ کثرت سے بیواؤں کی شادیاں ہو رہی ہیں۔ ہم لوگ مطلب کے وقت اسلامی شریعت کا سہارا لیتے ہیں۔ ورنہ ہر کام گھر کی شریعت کے مطابق طے کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے خاندان اسی لیے کمزور ہو رہے ہیں۔[۹۴]

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے سماجی مسائل کا احاطہ کیا اور ان مسائل کو ختم کرنے کے لیے طریقہ کار متعارف کروایا۔

۲.۶۔ میاں بیوی کی ذہنی ہم آہنگی:

عموماً خوشگوار ازدواجی زندگی کی تمام تر ذمہ داری عورت پر لاد دی جاتی ہے۔ لیکن یہ بات کوئی نہیں جانتا کہ زندگی کو خوشگوار طریقے سے گزارنے کے لیے دونوں فریقین کی باہمی ہم آہنگی ضروری ہے۔ جب تک دونوں اپنے مسائل کو باہمی مشاورت، محبت اور خوش اسلوبی سے نہیں نبھائیں گے مسائل بڑھتے چلے جائیں گے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ لڑکیوں کو تو کم سنی میں ہی یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ اسے اپنے گھر کے ماحول کو بہتر بنائے رکھنے کے لیے کیا کیا اقدامات کرنے ہیں۔ کس طرح مسائل کے حل کے لیے تجویز کرنی ہے لیکن لڑکوں کو اس معاملے سے ہمیشہ سبکدوش سمجھا جاتا ہے جس کے نتیجے میں وہ گھر کی تمام تر ذمہ داریاں عورت سے منسوب کر کے خود بری الذمہ ہو جاتا ہے۔تہذیب نسواں میں اس مسئلے پر بھی قلم اٹھایا گیا۔ ایک مصنفہ "ت" کے نام سے اپنے ایک مضمون میں اس مسئلے کا احوال بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:

مجھے اکثر اوقات خیال آتا ہے کہ رفیق حیات کو خوش رکھنے کے جتنے سبق کنوار پن میں لڑکیوں کو ملے تھے۔ اگر اس سے نصف لڑکوں کو بھی مل جاتے تو بہت سے گھر اس سے وقت بگڑے ہوئے نظر نہ آتے۔ آخر یہ کیا غضب ہے کہ ازدواجی زندگی کی نسبت اپنے فرائض انھیں قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئے ہیں اور بات بات پر لڑکیوں کی تعلیم و تربیت پر اعتراض شروع ہو جاتے ہیں؟--- تعلیم کے علاوہ ضرورت اس بات کی بھی رہتی ہے کہ لڑکا لڑکی چھوٹی چھوٹی باتوں میں ایک دوسرے کو خوش رکھنے، معمولی شکووں کو ٹال جانے اور باہم خوش اسلوبی سے زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ سیکھیں۔ لیکن لڑکوں کو قطعی اس ضرورت سے بے نیاز سمجھا جاتا ہے---والدین کو چاہیے کہ جہاں وہ اپنی بیٹیوں کے متعلق یہ فکر کرتے ہیں کہ وہ دوسرے گھروں میں جا کر ہنسی خوشی زندگی گزار سکیں وہاں بیٹیوں کا خیال کر کے لڑکوں کو بھی انھیں خوش

رکھنے کی تعلیم دیں۔[۵۴]

ان مصنفین نے خواتین میں یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش کی کہ نا صرف لڑکیوں کو بل کہ لڑکوں کو بھی برابر تربیت دی جائے کہ انھوں نے اپنے گھر کے معاملات کو بہتر بنانے کے لیے کیا اقدامات کرنے ہیں تاکہ معاشرہ متوازی رویوں کے ساتھ تعمیر و ترقی کر سکے۔ ان کے مطابق گھر کے نظام کو بہتر طریقے سے چلانے اور گھریلو زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے دونوں پر برابر ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس ضمن میں شاہزادہ جہاں بیگم نے "ہماری خانگی زندگی"[۵۵] کے عنوان سے ایک مضمون درج کیا اور خواتین کو آگہی دینے کی کوشش کی۔

۳۔ معاشی معاملات و مسائل:

معاش انسانی ضروریات کو پورا کرنے اور سماجی استحکام میں مدد دیتا ہے۔ دنیاوی نظام کے مطابق معاشی طور پر مستحکم انسان کی قدر و منزلت زیادہ ہوتی ہے جب کہ غیر مستحکم انسان کے ساتھ مختلف رویہ برتا جاتا ہے۔ یوں کہنا بے جا نہ ہو گا کہ دنیا میں انسان کی قدر و منزلت اس کی معاشی حیثیت کے مطابق متعین کی جاتی ہے۔ جب ایک عام انسان کی قدر و منزلت اس کی معاشی حیثیت پر موقوف ہے تو عورت جسے پہلے ہی گوناگوں مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہو اور اس کی انسانی حیثیت کو بھی قبول نہ کیا گیا ہو تو اس کی حالت کیا ہو گی۔

> دنیا کے تمام سماجوں اور نظاموں نے عورت کو معاشی حیثیت سے بہت ہی کمزور رکھا، سوائے اسلام کے، پھر اس کی یہی معاشی کمزوری اس کی مظلومیت اور بیچارگی کا سبب بن گئی۔[۵۶]

اسلام میں عورت کو وہ تمام حقوق دیے گئے ہیں جو اسے معاشی طور پر بہتر بناتے ہیں جن میں حق مہر، وراثت کے حقوق، مال و جائداد رکھنے کا حق، مال کا اپنی مرضی سے خرچ کرنے کا اختیار وغیرہ شامل ہیں۔ ان تمام حقوق کے حصول کے بعد عورت موثی طور پر مضبوط ہو جاتی ہے اور کسی دوسرے کے آگے دستِ سوال دراز کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ لیکن سماجی علمبردار خواتین کو ان کے جائز حقوق سے یکسر محروم کر دیتے ہیں اور عورتیں فرسودہ سماجی روایات کے پیش نظر ان کے حصول کی کوشش بھی نہیں کرتی جن کا وہ استحقاق رکھتی ہیں۔

> ۔۔۔ یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ اسلام نے آج سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے عورت کو معاشی حقوق دیے۔ ان حقوق میں بہت سی چیزیں شامل ہیں۔۔۔ ایک عاقل بالغ مسلمان عورت جائداد خرید سکتی ہے، رکھ سکتی ہے، بیچ سکتی ہے۔ خواہ وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ۔ وہ بغیر کسی پابندی کے اپنی مرضی سے اپنے مال کے بارے میں وہ تمام فیصلے کر سکتی ہے جو ایک مرد کر سکتا ہے۔[۵۷]

تہذیب نسواں کی مصنفین نے ہندوستانی خواتین میں اپنے حقوق کی خاطر آواز اٹھانے کی جدوجہد کو جنم

دیا۔ لیکن اس سے پہلے ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ ان عورتوں کو اپنے جائز حقوق سے متعارف کروائیں تاکہ ان کے لیے ان کا حصول ممکن ہو۔ معاشی استحکام کے حوالے سے عورت کو دیے گئے حقوق پر تہذیب نسواں کی خواتین کے افکار کا جائزہ ذیل کی سطور میں لیا گیا ہے۔

۱.۳۔ وراثت میں حصہ:

نو آبادیاتی ہندوستان میں عورت کو باپ، اور شوہر کی جائیداد سے دستبردار سمجھا جاتا تھا۔ سماجی اعتبار سے اس تصور کو اس قدر تحریک ملی کہ عوام نے اسے من و عن قبول کر لیا۔ خواتین نے بھی اسے قانونی معاملہ سمجھ کر درخور اعتنا نا سمجھا۔ اور اپنی زندگی معمول کے مطابق گزارتی گئیں۔ شعور و بیداری نسواں کی تحریک نے زور پکڑا تو خواتین کے دیگر حقوق کے ساتھ ساتھ وراثت اور شوہر کی جائیداد میں عورتوں کے حق کا معمہ بھی کھلا۔ جس سے یہ انکشاف ہوا کہ عورت بھی جائداد میں حصہ رکھتی ہے اور یہ حق اسے اسلام نے عطا کیا ہے۔

اسلام میں عورت کو شوہر اور باپ دونوں کی جائیداد میں مخصوص حصے کا حق دیا ہے، جبکہ سماجی علمبرداروں نے اسے اپنی مرضی سے توڑ مروڑ کر پیش کیا اور اسے اس کے حق سے محروم رکھا۔ یہاں کی خواتین نے بھی ان کی تمام باتوں کو من و عن قبول کیا اور محض نان نفقے پر راضی ہو گئیں۔ تہذیب نسواں کی مصنفین نے اس محرومی کو دور کرنے کے لیے خواتین میں یہ شعور پیدا کرنے کی سعی کی کہ انھیں یہ تمام حقوق مذہب کی طرف سے ملے ہیں اور ان کے حصول کی کوشش کرنا ان کا شرعی حق ہے۔ بلقیس بانو وراثت میں خواتین کے حصے کے حوالے سے اپنے نظریات کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہیں:

> ۔۔۔۔ شوہر کے ہاں بھی ہمارا شرعی ورثہ مانا ہوا ہے۔ جو شوہر کے صاحب اولاد ہونے کی صورت میں آٹھواں اور لاولدی کی حالت میں چوتھا حصہ ہے۔ اور شوہر کی وفات کے بعد اگر اس کے دوسرے ورثا مزاحمت کریں تو یہ بذریعہ عدالت وصول کیا جاتا ہے۔[۵۸]

بلقیس بانو نے وراثت کے اسلامی قوانین کے حوالے سے عورتوں کو متعارف کروانے کے لیے اپنے نظریات کی عکاسی "وراثتِ نسواں"[۵۹] میں کی۔

۲.۳۔ ترکے میں حصہ:

ترکے سے مراد وہ مال و اسباب اور جائیداد ہے جو مرنے والا اپنے وارثین کے لیے چھوڑ جائے۔ اس حوالے سے بھی بہت سے تعصبات پائے جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنی جائیداد کی تقسیم نہیں کر کے گیا تو اس کے جانے بعد ترکے کی تقسیم کے حوالے سے ورثا میں تنفر پیدا ہو جاتا ہے۔ اور عموماً ہر کوئی ایک دوسرے کا حصہ غصب کرنے کے درپے ہوتا ہے۔ اس صورت میں خواتین کو ان کے حقوق ملنا ایک مشکل مرحلہ ہے۔ اسلام نے

اس حوالے سے بھی مکمل تعلیمات دی ہیں کہ بعد میں آپس جھگڑے پیدا نہ ہوں اور تمام فریقین کو ان کا جائز حق مل جائے۔ جس کی دلیل درج ذیل آیت سے ملتی ہے:

---جو مال ماں باپ اور رشتہ دار ترکہ چھوڑ جائیں خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ (کم ہو یا بہت) اس میں مردوں کا بھی حصہ ہے اور عورتوں کا بھی۔ یہ حصے (اللہ کے) مقرر کیے ہوئے ہیں۔(۴:۷)"[۹۰]

مندرجہ بالا آیت سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ عورت بھی ترکے میں اسی طرح حصہ دار ہے جس طرح کہ مرد ہے۔ اسے اس کے حق سے محروم رکھنا اسلامی تعلیمات سے انحراف کرنا ہے۔ مزید یہ کہ قرآن میں ترکے کی حصہ داری کے حوالے سے بھی تفصیل موجود ہے۔ جس میں بیوی، بیٹی اور بیٹے کے حصے مختص کیے گئے ہیں۔ اس کی وضاحت ذیل میں آیات کے ترجمے سے ہوتی ہے۔

اللہ تمھاری اولاد کے بارے میں تم کو حکم فرماتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے اور اگر اولاد میت صرف لڑکیاں ہی ہوں (یعنی دو یا دو سے زیادہ) تو کل ترکے میں ان کا دو تہائی۔ اور اگر صرف ایک لڑکی ہو تو اس کا حصہ نصف۔ (۴:۱۱)"[۹۱]

اسلام کی رو سے عورت کا اپنے شوہر کی جائیداد میں اور بیٹی کا اپنے والد کی جائیداد میں حصہ مختص کیا گیا ہے لیکن عورت کو ان حقوق سے محروم رکھا جاتا رہا۔ تمام تر تعلیمات اور شعور ہونے کے باوجود مشرقی معاشرے میں عورت کو اس کے حقوق سے محروم رکھا جاتا رہا۔ اور وہ ہمیشہ مرد کے دست نگر رہی۔ اس تنگی کو دور کرنے کے لیے تہذیب نسواں میں مختلف خواتین نے اپنے افکار پیش کیے تاکہ عورتوں میں ان کے حق کے لیے آواز اٹھانے کی ہمت پیدا ہو سکے۔ مثال کے لیے اقتباس ملاحظہ ہو:

---سالہا سال سے شریعت کے خلاف قانونی رواج پر عمل درآمد ہوتا چلا آتا ہے۔ یعنی بیٹیاں اپنے باپوں کے متروکہ میں سے اور بیویاں اپنے شوہروں کے ترکہ میں حصہ نہیں لے سکتیں۔ حالانکہ قانون اسلام کی رو سے وہ اپنے والدین اور خاوندوں کی جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ کی حقدار رہی ہیں۔ پنجاب میں تو ظلم اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ اگر کوئی شخص متوفی اولاد نرینہ نہ رکھتا ہو۔ صرف دختر ہی ہو تو وہ بدنصیب اپنے باپ کی وراثت سے محض اس لیے محروم کر دی جاتی ہے کہ وہ عورت ہے اور اس کے باپ کی تمام جائیداد غیر لوگ لے جاتے ہیں۔ جو یک جدی کہلاتے ہیں۔---"[۹۲]

اسی طرح کے مسائل پر ک۔ن نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ انھوں نے ترکے میں بیوہ، اولاد اور رشتہ داروں کو دیے گئے حصے کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار اسلام کے اصولوں کے مطابق کیا۔[۹۳]

۲.۳۔ حق مہر:

مہر عورت کو دیا گیا وہ اسلامی حق ہے جو بوقت نکاح مقرر کیا جاتا ہے اور جس کی ادائیگی مرد پر لازم ہوتی ہے۔ اگر بیوی اپنی خوشی سے اسے معاف کرنا چاہے تو یہ الگ بات ہے لیکن مرد پر عورت کا یہ بنیادی حق ادا کرنا لازم ہوتا ہے۔ لیکن ہندوستانی معاشرے میں دیگر حقوق کی طرح یہ حق بھی تلف کر دیا جاتا رہا اور مرد نے اس سے فرار کے لیے بہت سی گنجائشیں پیدا کر لیں۔ تہذیب نسواں کے مضامین کے ذریعے خواتین کو ان کے حقوق سے متعارف کروایا گیا تا کہ وہ ان کی محرومی سے بچ سکیں۔ انہی معاملات کو امت الوحی نے اپنے مضمون میں یوں رقم کیا ہے:

> ۔۔۔ اکثر تو یہ دیکھا گیا ہے کہ صاحب جائیداد شوہر تو بیوی کے مہر کے خوف سے جائیداد باپ ماں یا بھائی کے نام کر دیتے ہیں اور جو صاحب جائیداد نہیں ہوتے ان کا بیکس بیوی کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ غرض عام طور سے مہر کے معاملے میں مردوں کو مطلق کوئی اذیت یا پریشانی نہیں پہنچی۔۔"[۶۴]

(باب چہارم میں حق مہر اور ازدواجی زندگی سے متعلق معاملات پر تہذیب نسواں کی خواتین کے شعور کا جائزہ تفصیل سے لیا گیا ہے۔ اسی لیے یہاں حق مہر کے حوالے سے زیادہ تفصیلات بیان نہیں کی گئی اس کا مفصل احوال باب چہارم میں رقم ہے۔)

۳.۳۔ اقتصادی ترقی میں عورت کا حصہ:

سماجی دائرے میں رہتے ہوئے خواتین کو اقتصادی طور پر مضبوط کرنا اور مردوں کے شانہ بشانہ معاشی مضبوطی بھی اس دور کا اہم مسئلہ تھی۔ عورتوں کو گھر بیٹھے ہر شے مہیا کی جاتی تھی لیکن جب حالات بدلے تو خواتین میں شعور بھی پیدا کرنے کی کوششیں کی گئیں کہ محض مرد کے ذمے ہی گھر گرہستی کا خرچہ اٹھانا نہیں ہے بل کہ خواتین کو بھی اس میں اپنا حق ادا کرنا چاہیے۔ اس کے لیے مغربی خواتین اور عالمی تناظر میں خواتین کی خدمات کو سراہا گیا اور ہندوستانی عورتوں کو بھی ترغیب دی گئی کے وہ ان خواتین سے سبق لیں اور اپنی زندگیوں کو بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ تہذیب نسواں کی مصنفین نے عالمی تناظر میں خواتین کی جدوجہد کو سراہا اور ہندوستانی خواتین کو ان کی طرح اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرنے کے لیے پیغام عمل دیا۔ تاج النسا بیگم نے اپنے مضمون "باہمت عورتیں"[۶۵] میں بین الاقوامی سطح پر عورتوں کی کوششوں کو سراہا اور ہندوستانی عورت کو ان سی کوششیں کرنے پر ابھارا۔

دیگر خواتین نے بھی اسی سلسلے میں مضامین رقم کر کے عورتوں میں یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش کی کہ ملکی اقتصادیات کو بہتر بنانے کے لیے عورت کا مرد کے دوش بدوش کام کرنا ضروری ہے۔ جمیلہ بیگم اپنے مضمون "امریکہ

کی کارکن بیبیاں" میں عورتوں کو اپنی خدمات سر انجام دینے کی تحریک دیتی نظر آتی ہیں، ساتھ ہی وہ قدامت پرستی کو بھی ہدف تنقید بناتی ہیں مثال کے طور پر:

---۔ عورت کی سینہ زوری کے آگے مردوں کی پیش نہیں چل سکتی۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ عوام کے رجحانات قدامت پرستی کی طرف مائل ہیں۔ اور عوام اب پھر اس نظریہ پر کاربند ہوتے نظر آتے ہیں کہ عورت کی جگہ گھر میں ہونی چاہیے۔ [۶۶]

مندرجہ بالا سطور سے اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ اس دور کی عورت باشعور تھی اور ان خواتین نے دیگر خواتین کو بھی تحریک دی کے وہ اپنے معاملات اور حالات بہتر بنانے کے لیے مل جل کر محنت کریں۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ بہت سے ایسے مرد بھی موجود تھے جو خواتین کی راہ میں کسی طور رکاوٹ نہیں بن رہے تھے محض خواتین کی ذاتی سستی کی بنا پر انھیں ان کے حقوق کے حصول میں مشکلات پیش آرہی تھیں۔

تہذیب نسواں کی مصنفین نے عورت کو اقتصادی طور پر مضبوط ہونے کے لیے عملی کوشش کرنے کی ترغیب دی۔ ان کے مطابق ہندوستانی خواتین محض شادی، بچے اور گھر گرہستی کو اپنا مقصد حیات تصور کرتی ہیں حالاں کہ یہ طور درست نہیں ہے۔ ہندوستانی خواتین کے عام رویے کو ان الفاظ میں پیش کرتی ہیں:

----۔ یہاں کی عورتیں زیادہ ترقی نہیں کر سکیں۔ وہ شادی کے ساتھ ہی اپنی عملی زندگی کا خاتمہ کر کے ازدواجی زندگی کے جھگڑوں میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ اس امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے خواہ مخواہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اب انہیں کمانے کی ضرورت نہیں رہی۔ چنانچہ ہندوستانی اور بالخصوص مسلمان لڑکیوں میں اب تک اپنے علیحدہ مستقبل کی تعمیر کا شوق پیدا نہیں ہوا۔--- [۶۷]

عورتوں کو اپنی مدد آپ کے تحت کام کرنا چاہیے انھیں مردوں پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے۔ تاکہ وہ کسی پر بوجھ بنے بغیر اپنی خود مختار زندگی گزار سکیں اور ان کے دم سے قوم و ملت کو بھی فائدہ پہنچے۔ بیگم آباد احمد خاں نے اپنے مضمون "اقتصادی آزادی" [۶۸] میں خواتین کی اقتصادی آزادی کی اہمیت کو بیان کیا ہے۔ ان کے مطابق ہندوستان کی موجودہ صورت حال میں عورت کو اقتصادی طور پر مضبوط اور آزاد ہونے کی اشد ضرورت ہے۔ انھوں نے جدید وقتی تقاضوں کو تذکرہ کرتے ہوئے عورتوں کو اپنی قوتِ بازو پر بھروسا کرتے ہوئے دنیا میں مقام و مرتبے کے حصول کے لیے متحرک کیا۔ اور تعلیم کو ہر عورت کے لیے لازمی قرار دیا تاکہ وہ اپنے علم اور معلومات کو بروئے کار لاتے ہوئے مشکل کے وقت میں ہر صورت حال سے نبرد آزما ہو سکے۔ انھوں نے خواتین کو تلقین کی کہ ان کی تعلیم محض نمائش کے لیے نہ ہو بل کہ ایسے خطوط پر ہو کہ زندگی کے ہر مرحلے اور ہر دشوار موڑ پر اس کی معاونت کرے اور وہ حالات سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ اس ضمن میں شاہزاد جہاں بیگم نے اپنی فکر کا احاطہ کسب معاش" [۶۹] میں کیا۔

۴۔ عورت کی سماجی زندگی:

سماج کے معنی ایک ساتھ رہنے یا اکٹھا رہنے کے ہیں۔ جہاں انسان ایک دوسرے کے تجربات سے سیکھ کر شعور کی منزلیں طے کرتا ہے۔ انسان کی فکری بقا اور ارتقا کے لیے اسے ایک خاص قسم کا ماحول چاہیے ہوتا ہے جہاں اس کی باقاعدہ نشوونما ہو سکے۔ ایک خاص سماجی دائرے میں رہتے ہوئے انسان کی ذہنی نشوونما ہوتی ہے جو اس کے فہم و فراست اور نقطہ نظر کی پختگی کا باعث بنتی ہے۔ لیکن ہندوستانی عورت کو یہاں بھی بہت سی جکڑ بندیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ کچھ بھی سیکھنے، سمجھنے کے لیے مردوں کی محتاج ہوتی ہے اسے وہی معلومات پہنچائی جاتی ہیں جو مرد ان کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ یا یوں کہیے کہ جن کے پہنچائے جانے سے عورت شعور کی وہ منازل طے نہیں کر سکتی جو اس کے لیے ضروری ہیں۔

تہذیب نسواں کی لکھنے والی خواتین نے اس مسئلے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے خواتین کے لیے سماجی سرگرمیوں کی اہمیت کو واضح کیا۔ ان خواتین نے ہندوستانی معاشرے کی عورت کو درپیش مسائل اور ان کے حل کا جائزہ بھی پیش کیا۔ جس کی تفصیل ذیل کی سطور میں ہے۔

۴.۱۔ پردے سے متعلق معاملات:

ہندوستانی نظام میں عورت کو پردے کے نام پر چار دیواری میں مقید رکھا جاتا تھا۔ جو ان کی فکری آبیاری کی سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ یہ پردہ محض اسلامی اقدار کو مد نظر رکھتے ہوئے نہیں کروایا جاتا تھا بل کہ اس کا مقصود عورت کو محکوم رکھنا تھا۔ اور وہ شریعت کے اصولوں سے تجاوز بھی کرتا تھا کیوں کہ اسلام میں کہیں بھی عورت کو گھر میں قید رکھنے کی تعلیم نہیں دی گئی بل کہ اسے علم سیکھنے اور غور و فکر کرنے کی ترغیب دی گئی۔ اسی مسئلے کے پیش نظر تہذیب نسواں میں خواتین پر عائد پردے کی پابندی کو خاص طور پر موضوع بنایا گیا۔

تہذیب نسواں کی لکھنے والی خواتین نے ہندوستانی سماج میں رائج پردے کے نظام کو ہدفِ تنقید بنایا۔ ان خواتین نے پردے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا۔ لیکن اس پردے کی خلاف ورزی ضرور کی جو مستورات کے شعور و آگہی کی راہ میں رکاوٹ تھا۔ ان مصنفین نے متوسط طبقے کی خواتین کی فکری آبیاری کی کوشش کی اور انھیں جدید رویوں سے متعارف کروانے کے ساتھ ساتھ جدید رجحانات کی اہمیت بھی بتائی۔ مبارک دلھن نے اپنے مضمون "موٹر کا سفر" میں پردے کے موضوع پر اپنے خیالات کی پیش کش کی اور شریعت کے مطابق زندگی کے گزر بسر کی اہمیت کو سراہا۔ مبارک دلھن نے روایات کی پاسدار عورتوں کو مستقبل کے خطروں سے آگاہ کیا۔ اس ضمن میں وہ لکھتی ہیں کہ:

۔۔۔اگر ہم کو ہندوستان میں کسی قوم کے دوش بدوش رہ کر عزت و آبرو کی زندگی بسر کرنا ہے۔ تو ہم کو چار دیواری کی سختی کو خیر باد کہ دینا چاہیے۔ اور شرعی پردہ اختیار کرنا چاہیے۔ تعلیم میں حصہ لینا چاہیے ۔ ورنہ وہ زمانہ دور نہیں کہ اوسط طبقے والیاں ایک کمانے والے کی آنکھ بند ہونے پر دربدر کی ٹھوکریں نہ کھاتی پھریں۔۔۔"

تہذیب نسواں کی مصنفین نے شریعت کے احکامات کو مد نظر رکھتے ہوئے ہندوستان میں رائج پردے کے تصور پر تنقید کی ہے۔ انھوں نے بطور خاص ان افراد کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے جو محض خواتین کو رسوم ورواج کا پابند کرتے ہیں اور حقیقت میں انھیں خود اصلاح کی ضرورت ہوتی ہے ۔ انھوں نے معاشرتی رسوم و رواج کے پیش نظر اصلاح پردہ نسواں کی کوششیں کی۔ ان مصنفین نے یہ باور کروانے کی سعی کی کہ ہندوستانی نظام میں پردہ اسلامی شعار کے مطابق رائج نہیں کیا گیا۔ اسلام میں عورت کے ستر اور اس کی نگاہ کی حفاظت کی خاص تلقین کی گئی ہے اور اسے اپنی آرائش وزیبائش غیر محرموں کے سامنے کرنے سے منع فرمایا ہے لیکن ہندوستانی معاشرے نے اس کی تعبیر و تشریح اپنی فہم کے مطابق اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کی اور عورت کو پردے کے نام پر مقید کر کے مفلوک الحال کر دیا۔ خدیجۃ الکبریٰ اپنے مضمون "ہندوستان کا مروجہ پردہ" میں یوں رقمطراز ہیں:

ہندوستان کے مسلمانوں میں پردہ اسلامی شعار کی حیثیت سے قائم نہیں ہے۔ کہ احکام شریعت کی رو سے اس کی اصلاح کی فکریں کی جارہی ہیں۔ بل کہ یہ ایک معاشرتی رسم ہے۔ جو مقامی حالات نے پیدا کر دی ہے۔ لہٰذا اس پردہ کی اصلاح منحصر ہے ہندوستان کی معاشرت اور تمدن کی اصلاح پر۔ اور اس کی ابتدا یوں ہو سکتی ہے کہ جو بااثر مرد صرف بحث کی خاطر نہیں۔ بل کہ فی الحقیقت پردہ کی موجودہ شدت کو ملک و قوم کے لیے مضر سمجھتے ہیں۔ وہ بجائے کوری بحث بازی کے میدان عمل میں قدم بڑھائیں۔ یعنی اپنے زیر اثر مستورات اور خواتین کو پردہ کی غیر ضروری قیود سے آزاد کر کے بے تکلف پھرنے پھرانے اور خرید و فروخت کرنے کی اجازت دیں اور مثالیں قائم کریں۔"[1]

ان مصنفین کا مقصد محض عورت کو فکر و عمل کے لیے تیار کرنا تھا۔ کیوں کہ پردے کی پابندی سے ہندوستانی عورت محدود ہو کر رہ گئی تھی اور ایک خاص قسم کا گھٹا ہوا موجودہ رجحانات سے بے خبر طبقہ جنم لے رہا تھا جو سماجی ترقی میں کوئی کردار ادا نہیں کر رہا تھا۔ اسی لیے مستورات کو ان حد بندیوں سے باہر نکل کر سوچنے سمجھنے اور سیکھنے کی ترغیب دی گئی۔ امت الوحی کے مطابق:

۔۔۔موجودہ رسمی پردہ ہندوستانی مسلمانوں کا خود ساختہ پردہ ہے۔ اور رفتہ رفتہ مردوں کی طبیعتیں مستورات کو پردہ کے نام سے گھروں میں مقید رکھنے کی ایسی خوگر ہو گئی ہیں کہ اب اس میں کسی

اصلاح کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ اور کوئی طبیعت اس کو جائز نہیں سمجھتی کہ عورتوں کو پردہ کے معاملہ میں شرعی حدود سے فائدہ اٹھانے دیا جائے۔۔۔[۶۲]

ان مصنفین نے عورتوں کی اخلاقی، فکری اور ذہنی نشو و نما کے لیے سماجی تعامل کو ضروری قرار دیا۔ تا کہ وہ ملکی صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے اپنا کردار ادا کر سکیں۔ لیکن یہاں کی مستورات تو پردے کی اوٹ میں ایسی چھپی بیٹھی تھیں کہ جدید رجحانات کے کسی بھی جھونکے کی لہر ان تک نہیں پہنچتی تھی۔ تہذیب نسواں میں لکھنے والی خواتین نے انھیں یہ ترغیب دی کہ وہ اپنے فرائض ادا کر سکیں۔

۔۔۔ برقع کا ہندوستان ہی میں محدود ہو کر رہ جانا یہاں کے ماحول کا باعث ہے۔ یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ محکومیت انسان کو اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی، تمدنی غرض ہر پہلو سے ذلیل کر دیتی ہے۔ البتہ اس ماحول میں انسان اپنی عزیز ترین شے کو حاکموں کی دست برد سے محفوظ رکھنے کے لیے نئے نئے ڈھنگ سوچتا ہے اور یہ امر واقع ہے کہ برقع کا رواج ہندوستان میں مدتوں سے چلا آرہا ہے۔ دراصل اس زمانہ محکومی کا ماحول مقتضی تھا کہ عورت کو پردے میں رکھا جائے۔[۶۳]

اس زمانے میں عورت کا عورت سے بھی پردہ کروایا جاتا تھا۔ جیسے ہی لڑکی بلوغت کی عمر کو پہنچتی اسے عورتوں اسے بھی چھپانا شروع کر دیا جاتا تھا۔[۶۴] یہ امر کوئی مثبت تاثر نہیں دیتا کیوں کہ شریعت میں کہیں بھی ایسے پردے کا کوئی ذکر موجود نہیں ہے۔ اس عمل سے عورتوں کا دائرہ مزید محدود ہو جاتا ہے اور وہ کچھ بھی نیا سیکھنے سمجھنے سے قاصر رہتی ہیں۔

تہذیب نسواں کی کچھ مضمون نگار خواتین نے ان مستورات کو بھی ہدف تنقید بنایا جو پردے کو ڈھال بناتے ہوئے محض مردوں پر بوجھ بنی بیٹھی تھیں۔ انھوں نے ایسی خواتین کو یہ تحریک دینے کی کوشش کی کہ بلا ضرورت کسی پر بوجھ بن جانا کوئی اچھی بات نہیں ہے اس لیے ان خواتین کو چاہیے کہ وہ اپنی عام ضروریات کے لیے خود سے کوشش کریں۔[۶۵]

صفیہ مدحت خانم اپنے مضامین کے ذریعے خواتین کی اصلاح کرتے ہوئے ان پردہ دار خواتین پر اعتراض کرتی ہیں۔ جو خود پردے کی پابندی کرتی ہیں لیکن ان خواتین کا مذاق اڑاتی اور انھیں برا بھلا کہتی ہیں جو پردہ نہیں کرتیں اور عام اجلاس میں شرکت کرتی ہیں۔ صفیہ مدحت نے یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ ہر شخص کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنی زندگی اپنی مرضی سے بسر کرے ہمیں کسی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ ہاں اگر کوئی مذہبی حدود سے تجاوز کرے یا غیر اخلاقی حرکات سر انجام دے رہا ہو تو اسے ٹوکنا اور اس کی اصلاح ضروری ہے لیکن ہر وقت ہر شخص پر تنقید کرنا کوئی مثبت عمل نہیں ہے۔ اس ضمن میں ان کے نظریات کی عکاسی ان الفاظ میں ہوتی ہے:

۔۔۔۔بعض خواتین جو خود پردہ کی پابند اور اس کی حامی ہیں۔ اکثر بے پردہ خواتین کو اس طرح ملعون کرتی ہیں۔ گویا انھوں نے پردہ کیا ترک کیا شرافت ہی کھو دی۔ اس میں شک نہیں کہ حد سے زیادہ بے حجابی اور بے باکی عورت کی شرافت کے خلاف ہے لیکن اگر کسی نے صرف پردہ ترک کیا ہو اور اسے مردوں کی علمی مجالس میں شرکت کرنے اور ان سے گفتگو کرنے کے مواقع بھی پیش آتے ہوں تو اس سے اس کی شرافت اور حرمت پر ہرگز حرف نہیں آسکتا۔[۷۶]

ہندوستانی خواتین میں پردے کی حد سے بڑھی ہوئی سختی انسانی حدود سے آگے نکل چکی تھی اور وہ اپنے علاج معالجے کے لیے بھی طبیب کے پاس جاتے ہوئے کتراتی تھیں۔تہذیب نسواں کی مصنفین نے یہاں خواتین میں شعور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایک خاص حد میں رہتے ہوئے طبیب سے معائنہ کروانے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ سعیدہ ہمشیرہ ڈاکٹر سید شفیع الدین اپنے مضمون "ڈاکٹر سے پردہ"[۷۷] میں اس سماجی مسئلے پر قلم اٹھاتی ہیں کہ عورت پر ہر قسم کا پردہ لازم کر دیا گیا ہے۔ اس میں مریض اور ڈاکٹر کے درمیان پردے پر تمسخرانہ انداز میں بات کی گئی ہے اور یہ طنز سماجی رویوں پر کیا گیا ہے۔ بہت سی خواتین محض اس پردے کی رکاوٹ کی وجہ سے اچھا علاج نہیں کرواتیں ور جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں:

مرض کی حالت میں جب کہ زندگی اور موت کا سوال ہو۔ایسا رویہ بہت قابل اعتراض ہے۔طبیب ہر وقت معائنہ اپنے عزیزوں کی طرح کرتا ہے۔اس سے ایسی شدت کا پردہ کرانا دانستہ مریضہ کی زندگی کو خطرے میں ڈالنا ہے"(مذہب کے نام پر تواہمات کے خلاف آواز اٹھانا۔[۷۸]

انیتا چترجی نے اپنے مقالے میں ہندوستانی سماج میں رائج پردے کے نظام کو مردوں کے مفادات سے تعبیر کیا۔ ان کے مطابق یہاں کے مرد عورتوں کو پردے کی قید میں محض اس لیے بھی رکھنا چاہتے ہیں کہ وہ ان کے پنجہ استبداد سے نکل کر آزاد نہ ہو جائیں۔وہ لکھتی ہیں کہ:

The custom of Purdah restricted women from takin formal education outside home,girls were withdrawn from school before attaining puberty and also there were not many female teachers in schools.but , the elite middle class men who received English education wanted their wives to be educated so that they can efficiently run the household and guide the children in education[۷۹]

ہندوستان میں عورت کے لیے محض ظاہری پردے کی تلقین نہیں تھی بل کہ ان کے لیے اپنی آواز اور نام تک کا پردہ رکھنے کا حکم جاری تھا۔ اس کی مثال تہذیب نسواں کی لکھنے والی مستورات کے ناموں کے انتخاب سے بھی

ہوتی ہے جو اپنے اصل نام کی بجائے، دختر، ہمشیرہ، بیگم اور والدہ وغیرہم کے الفاظ استعمال کیا کرتی تھیں۔ بعض تو انگریزی اور اردو حروفِ تہجی میں اپنے نام درج کیا کرتی تھیں جن سے ان کا تشخص واضح نہیں ہوتا تھا۔

شاہزادجہاں بیگم نے بھی اسی ضمن میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے ہندوستانی مستورات کو لکھتے وقت نام ظاہر کرنے اور مخففات سے گریز کرنے کی تلقین کی۔ ان کے مطابق مضمون کی قرات کے دوران اگر مضمون نگار کا تعارف نہ ہو تو پڑھنے کے باوجود تشنگی باقی رہتی ہے۔ اس فکر کا اظہار ان کے مضمون "نام چھپانا"[80] میں ملتا ہے۔ بلقیس بیگم کا مضمون "اپنا نام کیونکر لکھیں"[81] بھی خواتین میں پردے کے حوالے سے شعور پیدا کرنے کی ایک کڑی ہے۔

ہندوستان میں رائج پردے کے مسائل، غیر شرعی پردے کی سختی اور اسلامی اور شرعی پردے کے نفاذ کے حوالے سے تہذیب نسواں کی مصنفین کی شعور و آگہی کی تفصیل باب پنجم کے جزو ۴ بعنوان "پردے کے مباحث" میں پیش کی گئی ہیں۔)

۲.۴۔ سماجی سطح پر عورت اور مرد کا مساوی حقوق:

نو آبادیاتی ہندوستان میں پردے کو مد نظر رکھتے ہوئے ہمیشہ یہ رویہ اختیار کیا گیا کہ عورت کی بے پردگی نہ ہو لیکن اس معاملے کو سراسر نظر انداز کر دیا گیا کہ خدا اور رسول نے بھی شرعی حدود میں رہتے ہوئے خواتین کو تعلیم و ترقی کی اجازت دے رکھی ہے۔ اسی معاملے کے پیش نظر مضمون نگار خواتین نے یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش کی کہ اگر ہم خواتین کو پردہ کروا کر گھر میں بٹھائے رکھیں گے تو اس سے نا صرف خواتین کے بنیادی حقوق کی پامالی ہوگی بل کہ سماجی ترقی کی راہ میں بھی رکاوٹ آئے گی۔ یہاں ضرورت اس امر کی ہے کہ خواتین پر سے پردے کی غیر ضروری پابندی ہٹائی جائے اور انھیں اپنا فرض پورا کرنے کا موقع دیا جائے۔ فاطمہ صغرا بیگم اس ضمن میں رقمطراز ہیں:

> ۔۔۔اول عورتوں کو جہالت کے عمیق گڑھے سے نکالنا چاہیے اور پھر سب ضروری اور مناسب پابندیوں کے ساتھ آہستہ آہستہ شاہراہ ترقی پر لے جاکر ایسی جگہ پر کھڑا کر دینا چاہیے۔ جہاں پہنچ کر وہ اپنے تمام ضروری فرائض کو بوجہ احسن انجام دے سکیں۔ اور مثل سابق کے ہر امر میں مردوں کی ممد و معاون ہو کر حقیقی رفیق زندگی ثابت ہوں۔ اور مثل مردہ نمازندہ کے نہ رہیں جو سکتہ کی حالت میں پڑا ہے۔[82]

تہذیب نسواں کی مصنفین نے سماجی ترقی میں خواتین اور مردوں کا شانہ بشانہ کام ضروری قرار دیا۔ یعنی اس دور میں خواتین میں شعور بیدار ہو گیا تھا کہ عورتیں بھی سماجی زندگی کی بہتری کے لیے اگر کام کریں گی تو بہتری

ممکن ہے۔ مثال ملاحظہ ہو:

> آپ نے کبھی یہ سوچا کہ قوم ہے کس چیز کا نام؟ افراد کے مجموعے ہی کو تو قوم کہتے ہیں۔ ہم اور آپ یہی سب مل کر تو قوم بنی ہے۔ اگر آج ہم میں سے ہر عورت اور ہر مرد اپنی اصلاح کا ارادہ کر لے تو قوم کی اصلاح آپ ہی ہو جائے گی۔ اگر آج ہم بیدار ہو کر مستعد ہو جائیں تو کل ہم کو قوم کی تباہ حالی کا ماتم نہ کرنا پڑے گا۔ [۸۳]

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے خواتین کو قومی و ملکی ترقی میں اپنا کردار ادا کرنے کے لیے تحریک دی۔ انھوں نے اس عام رویے پر تنقید کی ہے جن میں خواتین محض گھر گرہستی میں الجھی مقررہ امور سرانجام دے رہی ہوتی ہیں۔ ہندوستانی معاشرے میں یہ عام تصور تھا کہ عورت گھر اور رسوئی تک محدود ہے اور اس کی زندگی کا واحد مقصد ان دو اکائیوں کو ترتیب دینا اور اس سے متعلقہ امور اچھے سے چلانا ہے۔ لیکن جدید فکری رویوں نے اس کی حمایت نہ کی بل کہ خواتین میں یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش کی گئی کہ وہ گھر سے باہر قدم رکھے اور نئے جہان کی تسخیر کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ سماجی ترقی میں بھی اپنا کردار ادا کرے۔ عورت کو محض گھر کے لیے پیدا نہیں کیا گیا۔ تحریک آزادی نسواں کے حوالے سے جمیلہ بیگم "ہندوستانی خواتین اور تحریک آزادی" میں لکھتی ہیں:

> خواتین کی اس آزادی کی تحریک میں صرف سیاسی حقوق کے حصول پر زور نہیں دیا جا رہا تھا۔ بل کہ اس تحریک کا بنیادی اصول یہ تھا کہ انھیں کاروباری اور ملازمت کے سرکاری و غیر سرکاری تمام شعبوں میں وہی حقوق دیے جائیں جو مردوں کو اس وقت تک حاصل ہو چکے تھے۔ وہ ہر شعبے میں مردوں کے دوش بدوش چلنا چاہتی تھیں۔ تاکہ آزادی وطن کی جدوجہد وسیع پیمانے پر ہو سکے۔ [۸۴]

تہذیبِ نسواں میں ہندوستانی عورتوں کو اس بات کی ترغیب بھی دی گئی کہ وہ سماجی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہوئے شعور و ادراک میں بہتری لائیں کیوں کہ گھر گرہستی اور روزمرہ امور کی انجام دہی نے انھیں ایک سمت میں چلنے پر مجبور کر دیا۔ جب تک وہ سماجی میل ملاپ نہیں بڑھائیں گی تب تک اپنے حقوق کی بابت بھی معلومات حاصل نہیں کر سکیں اور اجارہ دار طبقہ ان کے حقوق پر قابض رہے گا۔ اس سلسلے میں جاپانی نژاد مسز برلاس نے بھی خواتین کو متحرک کرنے کی کوشش کی کہ وہ اپنی فکر کو وسعت دینے کے لیے سماجی روابط مضبوط کریں اور اقوام عالم کی خواتین کے کارہائے نمایاں سے سبق لیتے ہوئے زندگیوں کو بہتر ڈگر پر لائیں۔ اس ضمن میں مسز برلاس کا کوبے میں کیا گیا خطاب خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ جس میں انھوں نے ہندوستانی عورت کو سماجی میل ملاپ کی اہمیت باور کروائی۔ اس حوالے سے لکھے گئے دیگر مضامین میں "کوبے میں مسز برلاس کی تقریر"[۸۵]، ہماری

بے بسی"[86] اور [87] شامل ہیں۔

۳.۴۔ خود مختاری:

نو آبادیاتی ہندوستان میں خواتین پدر سری نظام کے زیر اثر تھیں اور انھیں اپنی زندگی کے ہر معاملے اور ہر فیصلے کے حوالے سے انہی کی رضامندی کا خیال رکھنا پڑتا تھا کیوں کہ وہاں یہ تصور عام تھا کہ اگر خواتین کو خود مختاری اور شعور و آگہی دی جائے تو وہ سماج کے اصولوں کی پابندی نہیں کریں گی اس سے باغی ہو جائیں گی۔ اس لیے ضروری ہے کہ انھیں رسوم ورواج اور اقدار کے شکنجے میں جکڑ کر رکھا جائے۔ اس کی مثال ذیل میں ہے:

> If given education, women will become independent and not abide by the rules of society .education should train girls in a way that they ensure a happy family life after marriage.[88]

جب کہ وہ زندگی کے کسی بھی شعبے سے متعلق کسی بھی فیصلے میں خود مختار ہے۔تہذیب نسواں کے مضامین کے ذریعے خواتین میں یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش کی گئی کہ عورت ہر اعتبار سے خود مختار ہے کہ وہ اپنی زندگی کے فیصلے اپنی مرضی سے کر سکے۔ چاہے وہ شادی ہو، تعلیم ہو یا کوئی معاملہ وہ کسی کی رہین منت نہیں ہے۔ حجاب اسماعیل اس حوالے سے لکھتی ہیں:

> مزاج اور خیال کی آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے اور ہر فطرت کا خاصہ لازمی ہے۔ اس آزادی کو انسان اپنی محبوب سے محبوب ہستی کے لیے بھی فروخت نہیں کر سکتا۔[89]

عورت کو فطرتاً یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اپنا طرز اختیار کرے اس کے لیے وہ کسی بھی قانون کی پابند نہیں ہے۔ اسے اپنے قول و فعل، عمل و حرکت، طرز معاشرت کے اختیار کرنے میں کسی کی اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ سماج کا ایک ذی شعور فرد ہے اور اپنا برا بھلا خود پہچانتی ہے تو کیوں ہر عمل کے لیے دوسروں کے رحم و کرم پر رہے۔ جمیلہ بیگم اس حوالے سے لکھتی ہیں کہ:

> آزادی نام ہے خود مختاری کا۔ اگر کسی کو اپنے قول و فعل، طرز معاشرت، سیر و تفریح کسی بات پر بھی اختیار نہ ہو۔ اور یہ رعایتیں تمام تر دوسروں کی مرضی اور خوشی پر موقوف رکھی جائیں تو اسے آزادی کسی صورت میں نہیں کہا جا سکتا۔ ایسی آزادی در اصل طفل تسلی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اگرچہ صورت واقعات میں تبدیلیاں پیدا کر دی گئی ہیں مگر دونوں کا ماحصل ایک ہی ہے۔[90]

ہندوستانی معاشرے میں عورت ہر شعبہ زندگی میں مرد کی مرہونِ منت تھی اسے کسی بھی معاملے، اپنے کسی بھی مسئلے اور کسی بھی فیصلے کے حوالے سے یہ اختیار حاصل نہیں تھا کہ وہ اپنی مرضی سے کوئی کام کر سکے۔

ہندوستانی عورت کو کبھی بھی مرد کی طرح مکمل آزادی نہیں ملی وہ نا صرف اپنے فیصلوں بل کہ اپنی فکر بھی مرد کے تابع رکھنے کی مجاز تھی۔ حالاں بحیثیت انسان اسے یہ حق قدرت نے عطا کیا ہے کہ وہ اپنے فیصلے خود مختاری سے لے سکے۔تہذیب نسواں میں ہندوستانی معاشرے کی خواتین کی زبوں حالی کا بیان اس طرح کیا گیا ہے۔

> ہندوستانی معاشرے میں جو عورتیں ضدی اور سرکش ہونے کی شہرت رکھتی ہیں۔ان کی آزادی بھی محدود ہوتی ہے۔ایک خاص حد کے اندر رہتے ہوئے وہ من مانی کارروائی کرتی رہتی ہیں۔اس خاص حد کے باہر نہ وہ خود جانا چاہتی ہیں نہ وہ جانے دی جاسکتی ہیں۔۔۔ یہ عورت کی قسمت ہی میں نہیں کہ اسے کبھی مرد کی سی مکمل آزادی نصیب ہو۔وہ بحیثیت جنس کے ہمیشہ سے مرد کے ماتحت چلی آئی ہے اور شاید کبھی اسے مرد کے اقتدار سے مخلصی حاصل نہ ہو۔"[۹۱]

تہذیبِ نسواں کی مضمون نگار خواتین نے ہندوستانی مستورات کو یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ اپنی زندگی سے متعلق ہر معاملے میں خود مختار ہیں خواہ وہ نجی زندگی سے متعلق کوئی معاملہ ہو یا گھر سے باہر کا کوئی معاملہ عورت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے لیے درست سمت کا انتخاب کرے۔اسی حوالے سے ایک معاملہ پیشے کا انتخاب ہے۔اس ضمن میں بھی عورت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی زندگی کی بہتر گزر بسر اور معاشی استحکام کے لیے جو پیشہ چاہے منتخب کر سکتی ہے۔اسے اس حوالے سے کسی کی حکم کے تابع رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے بل کہ یہ اس کا فرضِ اولین ہے کہ اپنی صلاحیتوں کو بہتر سمت دے کر قوم وملت کی ترقی کی راہ ہموار کرے۔ ہندوستانی ڈھانچے میں عام طور پر معاشی معاملات کی ذمہ داری صرف مرد پر عائد تھی اور خواتین کو اس سے یکسر دستبردار رکھا جاتا تھا لیکن خواتین کی بہت سی ایسی ضروریات تھیں جو محدود وسائل میں پوری نہیں ہو سکتی تھیں اسی لیے تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے انھیں اس بات کا شعور دلایا کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے لیے ایسے پیشے کا انتخاب کریں جس سے ان کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ان خواتین کو اس بات کا ادراک تھا کہ اگر مرد وزن مل کر ایک دوسرے کے شانہ بشانہ کام نہیں کریں گے تو خانگی زندگی میں روپے پیسے کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل کی کم نہیں ہو سکتے۔شاہزاد جہاں بیگم نے اپنے مضمون "عورتوں کے لیے پیشے"[۹۲] میں اسی فکر کا احاطہ کیا ہے اور ہندوستانی خواتین کے لیے ایسے پیشے کے انتخاب کی اہمیت کو واضح کیا ہے جو ان کی معاشی تنگدستی کے خاتمے کے ساتھ ساتھ ملکی صورت حال کی بہتری کے بھی ضامن ہوں۔اسی سلسلے کی ایک کڑی بیگم شارق کا مضمون "کیا لڑکیاں نوکری کریں؟"[۹۳] اور نذر سجاد حیدر کے مضامین بعنوان "حریتِ نسواں"[۹۴ اور ۹۵] ہیں۔

۴.۴۔ آزادیٔ اظہار:

تہذیب نسواں کی مصنفین نے خواتین میں یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش کی کہ انھیں اپنے جائز حقوق

کے حصول کے لیے صدا بلند کرنی چاہیے۔ اپنے ساتھ ہونے والے مظالم اور حق تلفیوں کے خلاف جب تک وہ خود رد عمل کا اظہار نہیں کریں گی ان کی زندگی ایسے ہی دوسروں کے رحم و کرم پر گزرے گی۔ آصفہ خاتون نے اپنے مضمون "تعلیم کیوں چھوڑیں"[96] میں اسی فکر کی آبیاری کی ہے۔ ان کے مطابق انسان کو اس کے مقررہ حقوق اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتے جب تک وہ خود کوشش نہ کرے۔ انسان کو یہ حق فطری طور پر دیا گیا ہے کہ وہ اپنی زندگی اپنی مرضی سے آزادانہ گزار سکے تو پھر عورتیں کیوں سماجی اجارہ داروں کے ہاتھوں اپنی حق تلفی کرواتی جا رہی ہیں۔ خواہ وہ تعلیمی میدان ہو یا سماجی دائرہ کار عورت کو اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق ہر میدان میں عمل پیہم رہنا چاہیے۔

شاہزادجہاں بیگم نے بھی خواتین کو اس ضمن میں تربیت دینے کی کوشش کی کہ وہ اپنی ذات سے متعلق معاملات میں اپنی پسند ناپسند اور کسی معاملے کے سرانجام دینے میں اپنی مرضی کے فیصلے کا اختیار رکھتی ہے۔ چاہے وہ معاملہ اس کی تعلیم کا ہو، شادی سے متعلق کوئی فیصلہ ہو، اولاد کے حوالے سے ہو یا کسی بھی قسم کی سماجی ضرورت ہو اسے اپنی روایات کو مد نظر رکھتے ہوئے اس پر ڈٹ جانا چاہیے۔ "زنانہ آزادی"[97] میں اسی فکر کا اظہار ملتا ہے۔

جمیلہ بیگم کے نزدیک آزادی خود مختاری کا دوسرا نام ہے۔ اور ہر انسان اپنے قول و فعل، طرز معاشرت، سیر و تفریح اور دیگر معاملات میں خود مختار پیدا کیا گیا ہے۔ اسی لیے عورت بھی ان تمام معاملات میں مرد کی طرح ہی خود مختار ہے لیکن ہندوستانی معاشرے میں ہر جگہ پا بہ زنجیر ہے۔ یہ پابندی کہیں رسوم و رواج کی وجہ سے ہے تو کہیں سماجی اجارہ داروں کی بے جا روک ٹوک سے، کہیں مذہبی اجارہ دار عورت کو پابند رسومات کرتے ہیں تو کہیں سماجی دباؤ۔ جمیلہ بیگم نے ہندوستانی عورت کو یہ آگہی دی ہے کہ وہ فطرتاً آزاد پیدا کی گئی اور اسے اپنا یہ فطری حق کسی بھی دباؤ میں آکر چھوڑنا نہیں چاہیے بل کہ اس کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے۔ اپنے مضمون "عورت کی آزادی"[98] میں وہ اسی حوالے سے اپنے نظریات کی عکاسی کرتی ہیں۔ اسی طرح امت الوحی نے بھی مستوراتِ ہندوستان کو آزادی اظہار کی تحریک دی ہے تاکہ وہ اپنے حقوق کی حفاظت کر سکیں اور کوئی بیرونی طاقت ان کے قلب و ذہن کی خود مختاری پر تسلط نہ جمانے پائے۔ اس ضمن میں امت الوحی کے مضمون "حریت و آزادی نسواں"[99] اور ع۔ب کے مضمون "عورت کی آزادی"[100] بھی اسی نظریے کی ترسیل کی گئی ہے۔

۵۔ سیاسی معاملات و مباحث:

سیاست ایک ایسی حکمت عملی اور پالیسی کا نام ہے جس سے کسی بھی گروہ کے حقوق کے حصول کے لیے راہیں ہموار ہوں۔ مختلف مفادات اور مختلف معاملات کے حصول کے لیے سیاست کئی طرح کی ہو سکتی ہے۔ جس میں اقتدار کے حصول کے لیے سیاست، انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے، مذہبی اقدار کے تحفظ کے لیے، جمہوری روایات

کے تحفظ کے لیے، اور ذاتی مفادات کے حصول اور تحفظ کے لیے ایک گروہ سیاسی حکمت عملی ترتیب دیتے ہوئے مفادات کے حصول کی کوشش کرتا ہے۔

ہندوستانی سماج میں سیاسی معاملات و مسائل کے لیے ہمیشہ مرد کو اہل سمجھا اور عورت کو اس سے ہمیشہ دور رکھا۔ ناصرف اس سے دور رکھا بل کہ عورت کو یہ آزادی تک نہ دی کے وہ اپنے مسائل کا اظہار کرتے ہوئے اپنے حقوق کی خاطر آواز بلند کر سکے۔

جدید فکری رویے جب ہندوستان میں پہنچے تو یہاں کی عورت میں یہ شعور پیدا ہوا کہ اسے بھی اپنے مسائل کے اظہار اور اپنے حقوق کے حصول کے لیے ایک پلیٹ فارم ملنا چاہیے تاکہ وہ بھی بحیثیت شہری اپنے حقوق حاصل کر سکے۔تہذیب نسواں کی مصنفین نے ہندوستانی عورت کو اپنے حقوق کے حصول کے لیے کوشاں ہونے کی ترغیب دی جہاں آرا شاہنواز اپنے مضمون "نیا آئین حکومت اور ہندوستانی عورتیں" میں ہندوستانی صورت حال بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ "سیاسیات کیا شے ہے۔ایک نیا علم۔ جس کا دروازہ ہندوستانی مستورات کے لیے مقفل سمجھا جاتا تھا۔ عورت اور شہری، ملکی اور سیاسی معاملات میں دخل انداز ہو۔اس کے لیے گناہ کبیرہ تصور کیا جاتا تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستانی عورتوں نے ایک خواب گراں کروٹ لی۔اور آہستہ آہستہ ان میں رفاہ عام کے کاموں میں دل چسپی لینے کا شوق پیدا ہوا۔پہلے دس برس بہت کم اور دوسرے دس برس میں کچھ زیادہ اور تیسرے دس برس میں نمایاں اور اب چوتھے دس برس میں ہر مذہب و ملت کی بہنیں سیاسیات کے وسیع میدان میں اتر آئیں۔اس کی زیادہ تر وجہ یہ ہے کہ تعلیم اور تہذیب جدید کی کرنیں جب گھروں کی تاریک چار دیواری میں ضیاپاشی کرنے لگیں تو عورتوں کے دلوں میں قدرتی طور پر اپنے جائز اور شرعی حقوق کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کا جوش اور دیگر ممالک کی مستورات کی طرح ترقی کے میدان میں تگ و دو کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ بہت جلد رفاہ عام کے کاموں میں حصہ لینے والی عورتوں کو معلوم ہو گیا کہ جب تک سیاسی فضا میں ان کی آواز ایک زبردست آواز نہ ہو گی۔ ان کے لیے تعلیمی ترقی، معاشرتی اصلاح میں کامیاب ہونا اور اپنے حقوق شرعی کو پالینا مشکل بل کہ ناممکن ہو گا۔"[۱۰]

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے ایسے مضمون لکھے اور لکھنے کی ترغیب بھی دی جس سے مستورات میں اپنے حقوق کے مطالبے کا شوق اور آگہی پیدا ہو۔ انھوں نے پہلے پہل خواتین کو سیاسی معاملات سے متعارف کروایا تاکہ وہ سیاسی معاملات سے ہم آہنگ ہو کر اپنے حقوق کے حصول کی کوشش کر سکیں۔بقول نجمہ امتیاز

> ہندوستان کے قدیم نیشن زن لارڈ سڈ نہم نے شاید اسی بات کو پیش نظر رکھ کر پارلیمنٹ میں کہا کہ "ہند کی عورتیں حقوق نہیں مانگتیں" اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کو اختیاری حکومت کے فوائد کے حقوق ابھی عام مستورات کی سمجھ میں نہیں آسکتے۔اور سیاسی حقوق کا مطالبہ جب ہی ہو

سکتا ہے جب سب عورتیں ان حقوق کے فوائد کو سمجھتی ہوں۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تہذیب میں ایسے مضامین بھی درج ہوں جو بہنوں میں سیاسی مسائل کی کچھ واقفیت تو پیدا کر سکیں۔ پھر کسی دن یہ بھی ہو جائے گا کہ ہماری بہنیں سیاسی حقوق کے حاصل کرنے کی جدوجہد کرنے لگیں گی۔[۱۰۲]

ان مصنفین نے سیاست میں خواتین کی عدم دل چسپی کا ایک مظہر یہاں کے پدر سری نظام کو ٹھہرایا ان کے مطابق یہاں کے نظام میں خواتین کے لیے اتنی گنجائش ہی نہیں پیدا کی گئی کہ وہ اپنے حقوق کے لیے جدوجہد تو درکنار اپنے حق کے لیے صدا بلند بھی کر سکیں۔ جمیلہ بیگم ہندوستانی معاشرے میں عورت کے سیاسی استحصال کی وجوہات بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:

ہندوستان میں عام طور پر مسلمان عورتیں اول تو سیاسیات کے مفہوم سے کماحقہ آشنا نہیں۔ دوسرے ہمارے اکابر قوم نے انھیں اس ضروری مسئلے کی طرف متوجہ کرنے اور ان میں اس سے دل چسپی لینے کی صلاحیت پیدا کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں فرمائی۔ غالباً انھیں یہ اندیشہ ہے کہ عورتیں جو قرونِ ماضی میں اپنے کارہائے نمایاں سے ایک عالم کو متحیر کر چکی ہیں۔ اگر خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر اسلاف کے نقش قدم پر چلنے کا تہیہ کر لیں اور جبراً عائد کی ہوئی غلامی کے بندھنوں کو توڑ ڈالیں تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ اور ہندوستان کے علما اپنے خود ساختہ فتووں اور دوراز کار تاویلوں سے انھیں اپنے حقوق حاصل کرنے سے باز نہیں رکھ سکیں گے۔[۱۰۳]

رشیدہ خاتون نے بھی ہندوستان کی سیاسی صورت حال اور خواتین کی سیاسی سرگرمیوں سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اپنے مضمون "ہندوستانی مائیں اور سیاسی معاملات"[۱۰۴] میں انھوں نے ہندوستانی ماؤں کی سیاست میں وابستگی کے حوالے سے اپنے خیالات رقم کیے ہیں۔ اس مضمون میں انھوں نے مستوراتِ ہندوستان کو سیاسی معاملات سے باخبر رہنے اور اس میں عملی شرکت کرنے کی ترغیب دی۔ ان کے مطابق جب تک ہندوستانی خواتین اپنے مخصوص معاملات میں الجھی رہیں گی تب تک ان کی حالت درست ہونے والی نہیں ہے اور نہ ہی ان سے وابستہ ان کی اولاد کے حالات میں کچھ تبدیلی واقع ہو سکتی ہے۔ اس حوالے سے دیگر مصنفین میں نفیس دلصن نے "مسلم لیڈیز کانفرنس علی گڑھ"[۱۰۵]، بسم اللہ بیگم نے "خواتین کی انتخابی کشمکش میں مفاہمات کے امکانات"[۱۰۶] اور نذر سجاد حیدر نے دو مضامین بعنوان "حریتِ نسواں"[۱۰۷] اور[۱۰۸] تحریر کیے۔

۱.۵۔ ووٹ کا حق:

ہندوستان کی سماجی ڈھانچے میں اس بات کی گنجائش نہیں تھی کہ عورتیں بھی ووٹ دینے کا حق رکھتی ہوں لیکن جب تک انھیں یہ حق حاصل نہ ہو گا معاشرتی عدم توازن اور بگاڑ بڑھتا جائے گا۔ خواتین بھی مردوں کی طرح

ہی اسی سماج میں رہتی ہیں جہاں ان کی حق تلفی کی جاتی ہے۔ اور انھیں اس بات کی اجازت ہی نہیں کہ وہ اپنے جائز مطالبات پیش کر سکیں جن کا وہ استحقاق رکھتی ہیں۔ اس سلسلے میں اوائل میں خواتین میں حقوق کے مطالبات کے لیے شعور و آگہی دلوائی گئی بعد ازاں ایسی انجمنوں کا قیام عمل میں لایا گیا جو خواتین کے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لیے امداد کر سکیں۔

ہندوستانی خواتین کے لیے جو انجمنیں بنائی گئیں ان میں اس امر کا خصوصی خیال رکھا گیا کہ خواتین کو ووٹ کا حق دلوایا جائے اور ان کا کوئی خاص مطالبہ نہیں تھا بل کہ وہ سیاسی معاملات میں مساوات کی روادار تھی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ اگر ووٹ ہر عاقل و بالغ کا حق ہے تو طبقہ نسواں کیوں اس سے محروم ہے۔ اس لیے عورتوں کو ان کی آواز بلند کرنے کے لیے اور اپنے جائز شرعی حقوق کے حصول کے لیے ووٹ دینے کا حق حاصل ہونا چاہیے تا کہ ان کی آواز کی گونج بھی سنائی دے۔ بعد ازاں آئین کی ترمیم میں ہندوستانی عورت کو بھی ووٹ دینے کا مشروط حق حاصل ہوا۔ جہاں آرا شاہنواز ان شرائط کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں "نئے آئین حکومت میں عورتوں کو تین صفات کے ماتحت ووٹ کا حق حاصل ہوا اور یہ صفت مرد وزن دونوں کے لیے یکساں ہے:

۱۔ جس عورت کی اپنی جائداد ہو اور یہ صفت مرد وزن دونوں کے لیے یکساں ہے۔

۲۔ عورت پڑھی لکھی ہو۔ یہ صفت ہر ایک صوبے کے لیے مختلف ہے۔ اور مردوں اور عورتوں کے لیے بھی یکساں نہیں۔ کسی صوبے میں پرائمری سرٹیفکیٹ اور کسی صوبے میں صرف پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے۔ صوبہ پنجاب میں پڑھی لکھی عورت کو ووٹ کا حق دے دیا گیا۔

۳۔ تمام ان مرداں کی بیویوں کو رائے دینے کا اختیار دے دیا گیا۔ جن کے خاوند ۱۹۲۹ کے ووٹرز کی فہرستوں میں رائے دینے کا حق رکھتے تھے۔"[۱۰۹]

۶۔ عورت اور مرد کے یکساں انسانی حقوق:

ہندوستانی معاشرے میں لڑکا اور لڑکی میں تفریق ایک عام بات تھی۔ لڑکی کی پیدائش پر دکھ اور لڑکے کی پیدائش پر شادمانی وہاں کا ایک عام رویہ تھی۔ ہندوستانی معاشرے میں لڑکی اور لڑکے کی پیدائش پر روا رکھے جانے والے افتراقات تاعمر ان کے ساتھ رہتے تھے۔ جس میں لڑکوں کو عظیم تر اور لڑکیوں کو کم تر مخلوق کا درجہ دیا جاتا تھا۔ جن کا اثر ان کی تربیت اور ذہن پر براہ راست ہوتا ہے۔ لڑکی خود کو کم تر سمجھنا شروع کر دیتی۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی تھی یہ افتراقات مزید بڑھتے چلے جاتے تھے۔ اور لڑکی یہ محرومی اپنے ساتھ اپنے شوہر کے گھر لے جاتی تھی۔ وہاں بھی معاملہ کچھ ایسا ہی تھا۔ اسے تمام عمر ہر رشتے میں لڑکی ہونے کے ناطے اپنی سزا بھگتنا پڑتی تھی۔ تھوڑی سی

توجہ کی خاطر وہ اپنی ذات مزید مسخ کر دیتی تھی مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلتا تھا بل کہ جن رشتوں کے لیے وہ یہ کیا کرتی تھی وہ اسے اپنا ازلی حق سمجھ لیتے تھے۔ اس کی مثال تہذیب نسواں میں یوں پیش کی گئی ہے:

> یہاں تو لڑکی کی پیدائش کے دن ہی خوشی اور شگفتگی گھر والوں کے لیے معدوم ہو جاتی ہے۔ ہوش سنبھالتے ہی وہ اپنے بھائیوں کے طریقہ پرورش اور برتاؤ میں بین فرق معلوم کرتی ہے۔ اور محسوس کرتی ہے کہ میں ایک رذیل اور حقیر ہستی ہوں۔ اور آگے چل کر واقعات سے ثابت ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔[110]

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے اس مسئلے کے سد باب کے لیے والدین کو خصوصی تاکید کی اور انھیں یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ اولاد کے سلسلے میں اس قسم کی کوتاہی نہ برتیں۔ اللہ نے لڑکی اور لڑکے دونوں کو ان کے مکمل حقوق عطا کیے ہیں اس لیے انھیں بھی چاہیے کہ لڑکیوں کو محض لڑکی ہونے (جس کے ہونے میں ان کا ذرا عمل دخل نہیں ہے) کی سزا کے طور پر ان کے حقوق سے محروم نہ کیا جائے۔ اگر والدین خود ایسا کریں گے تو سماج میں انھیں باقی کون قدر کی نگاہ سے دیکھے گا؟ اس سلسلے میں شاہزادہ جہاں ہندوستانی والدین کو تلقین کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:

> والدین کو بیٹا بیٹی کی قدر یکساں کرنی چاہیے۔ ان کے کسی عمل سے یہ ظاہر نہ ہو کہ وہ بیٹے کی قدر بیٹی سے زیادہ کرتے ہیں۔ اگر بھائی بہن کو کبھی آپس میں فرق کرتے دیکھیں تو فوراً اس کو اپنی شفقت سے دور کر دیں۔ جب بیٹی کی قدر والدین کے گھر میں ہو گی تو سسرال میں بھی ہونا یقینی ہے۔ دور اندیش والدین کو چاہیے کہ اپنی زندگی میں شرع کے مطابق باقاعدہ وصیت نامہ لکھ کر بیٹیوں کے حقوق کی حفاظت کریں تاکہ ان کے بعد بھائی بہن کی محبت میں کسی قسم کا فرق نہ پڑے۔ اور دونوں ایک دوسرے کے رنج و راحت کے شریک رہیں۔[111]

اس زمانے میں جہاں لڑکی کی پیدائش باعث غم ہوا کرتی تھی محض یہی نہیں بل کہ جس خاتون نے بیٹی پیدا کی اس کی زندگی اجیرن تھی۔ گھر والوں کا رویہ اور سماجی دباؤ ایک بہت بڑا مسئلہ تھا لیکن دوسری طرف اگر کسی عورت کے ہاں بیٹا پیدا ہو گیا ہو تو اسے باعث افتخار سمجھا جاتا اور ماں بچے دونوں کی خوب خاطر کی جاتی تھی۔ اس حوالے سے لطیف اپنے مضمون "بیٹی سے نفرت" میں ایک ایسے گھرانے کی مثال پیش کرتی ہیں کہ:

> ۔۔۔ اس بیچاری کی زندگی اسی طرح روتے ہوئے کٹتی تھی اور ہر وقت لڑکا ہونے کی دعائیں مانگتی رہتی تھی۔ بارے خداوند تعالیٰ نے اس پر رحم کیا اور اس کی دعائیں قبول کیں اور اسے لڑکا عنایت کیا۔ لڑکا ہوتے ہی اس عورت کی کایا پلٹ گئی۔ آگے ہر وقت کام دھندا کرتی رہتی تھی تب بھی ساس لڑنے کو تیار رہتی تھی۔ اب ہر وقت خاطریں کرتی رہتی ہے اور بہو کو ذرا کام نہیں

کرنے دیتی کہ کہیں لڑکا نہ رو پڑے۔۔۔"[۱۱۲]

ہندوستانی عورتوں کا اپنی بیٹیوں کے ساتھ روا رکھا جانے والا سلوک اگلی زندگی میں ان کے لیے مشکلات پیدا کر دیتا ہے۔ ان کے عمل سے ان کے بیٹوں میں احساس تفاخر پیدا ہو جاتا ہے جو تمام عمر ان کے ساتھ رہتا ہے۔ پہلے وہ بہن اور بعد ازاں اپنی بیویوں کے حقوق اسی احساس برتری میں غصب کرتے چلے جاتے ہیں۔ ہندوستانی ماؤں کو چاہیے کہ وہ اپنے بچوں میں کسی قسم کا کوئی فرق روا نہ رکھیں کیوں کہ ان کے روا رکھے جانے والے سلوک سے ہی لڑکوں میں بچپن سے ہی احساس تفاخر پروان چڑھتا ہے اور وہ بچپن ہی سے عورت کو اپنے سے کم درجہ مخلوق تصور کر لیتا ہے اور اس کی حق تلفی اپنا حق سمجھ لیتا ہے۔ اس کے نزدیک عورت ایسی ذات بن جاتی ہے جسے محض اس کی خوش دلی اور معاونت کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور یہی سوچ عورت کی مظلومیت کی وجہ بنتی ہے۔ اس لے ضروری ہے کہ بیٹیوں کو بچپن میں ان کے حقوق دیے جائیں اور انھیں لڑکوں کے برابر وہ انسانی حقوق دیے جائیں جو اسے قدرت نے عطا کیے ہیں۔ اگر والدین بالخصوص مائیں اپنی بیٹیوں کی قدر نہیں کریں گی تو سماج میں کہیں کوئی ان کا قدر رساں نہیں ہو گا۔

> نیز ان بہنوں سے میری التجا ہے جو بیٹے بیٹی میں بہت تفریق کرتی ہیں۔ ان کو ایسا نہ کرنا چاہیے۔ بیٹے کی نظر میں بچپن ہی سے بہن کی کم وقعتی سما جاتی ہے اور وہ اپنے آپ کو عورت کا حاکم سمجھنے لگتا ہے۔ اس حالت میں بیوی کے ساتھ جو کچھ اس کا سلوک ہو گا وہ ظاہر ہے۔ بیٹوں کے دلوں میں ہمیشہ بہن کی قدر و محبت بڑھاؤ تا کہ وہ جوان ہو کر بیوی کے سچے قدر دان بنیں۔ اگر تمھارے بیٹے بیویوں کی قدر کریں گے۔ تو تمھاری بیٹیاں بھی قدر دانوں کے گھر جا کر آرام پائیں گی۔[۱۱۳]

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے عورتوں میں یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش کی کہ اسلام نے عورتوں کو مردوں کے برابر درجہ دیا ہے۔ ان میں سے کسی کو بھی دوسرے پر برتری نہیں دی گئی۔ اس لیے عورتوں کو اپنے وجود پر شرمندہ ہونے کی بجائے اپنی ذات کا صحیح ادراک کریں۔ انھیں چاہیے کہ وہ ایک نئی دنیا کی تسخیر کریں جہاں ان کی قدر و منزلت ہو۔ امت الوحی نے اپنے مضامین میں ہندوستانی معاشرے میں عورت اور مرد کے مابین روا رکھے جانے والے سلوک کے حوالے سے اپنے نظریات پیش کیے۔ انھوں نے خواتین میں یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش کی کہ خدا نے مرد اور عورت دونوں کو برابر کے حقوق دیے ہیں اور ایک دوسرے کے تئیں دونوں فریقین کی برابر ذمہ داریاں بھی عائد ہیں۔ لیکن ہندوستانی سماجی ڈھانچے میں عورت سے اس کے حقوق چھین کر اسے غیر ضروری فرائض میں الجھا دیا گیا ہے جن کی شرع یا قانونِ انسانی میں کہیں کوئی پابندی نہیں ملتی۔ وہ ہندوستانی عورت کی حالت اور معاشرتی جبر کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:

---مردوں کو یہ رقابت کب سے عورتوں سے ہوئی ہے۔ حالانکہ قدرت نے کوئی فرق تمیزی ان میں ایسا نہیں رکھا جو ایک دوسرے کو کمتر سمجھے۔ بل کہ نسل انسانی کے قیام میں ایک دوسرے کا ساتھ لازم وملزوم ہے اور بغیر ایک دوسرے کا وجود ناممکن ہے۔ اس اتحاد عمل پر بھی کیوں اس قدر نفرت ہے۔ اور کس طرح مردوں کو موقع مل گیا کہ انھوں نے ابتدا ہی سے حقوق نسواں کو اس طرح پائمال کرنا شروع کر دیا اور اس قدر ان کے مدارج کو مسخ کیا کہ اب بادی النظر میں عورت مرد سے ہر حیثیت میں کمتر ذہن نشین ہو گئی۔"[۱۴]

ایس۔ آر کرمانیہ نے اپنے مضامین میں عورت کو اس حقوق سے متعلق ادراک اور شعور بہم پہنچانے کی سعی کی۔ ان کے مطابق جب تک عورتوں میں اپنے حقوق کا شعور پیدا نہیں ہوتا تب تک سماجی سطح پر ان کا استحصال جاری و ساری رہے گا۔ اس ضمن میں انھوں نے عورت کو اس کے حقوق اور فرائض دونوں سے آگہی دی تاکہ وہ اپنے حقوق کے حصول کے ساتھ ساتھ اپنے فرائض بھی بخوبی سرانجام دے سکے اور سماجی اجارہ دار اسے کسی غیر ضروری فرض کے بندھن میں باندھنے کی کوشش نہ کر سکیں۔ اس سلسلے میں اپنے نظریات کی ترسیل کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں کہ:

جب عورتیں اپنی شخصیت کا صحیح احساس پیدا کر کے اور اپنے فرائض کو ان کی اصلی حالت میں پہچان کر اپنے حقوق اور اپنی قدر وقیمت سے واقف ہوں گی۔ تو نکاح بھی مرد و عورت دونوں کے لیے سعادت و فلاح کا حقیقی ذریعہ بن جائے گا۔ اگر دونوں کے دل اپنے اپنے فرائض سے آگاہ ہوں اور دونوں ہستیاں اپنی زندگی پر لطف اور پر کیف بنانے میں باہم برسرکار نظر آئیں تو اس کشمکش کا خاتمہ یقینی ہے---"[۱۱۵]

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے جہاں اس مسئلے کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ہندستانی معاشرے میں لڑکی اور لڑکے میں بہت فرق برتا جاتا ہے۔ لڑکیوں کو وہ حقوق نہیں دیے جاتے جو انھیں وعید کیے گئے ہیں وہیں وہ اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں کہ ان معاملات کی ذمہ دار لڑکیاں خود بھی ہیں۔ انھوں نے خواتین میں یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ کسی پر بوجھ بنے بنا اپنی زندگی کے بسر ان کی کوشش کریں۔ اگر وہ چھوٹے معاملات میں بھی والد اور بھائی پر بوجھ بنی رہیں گی تو ان کے ہوتے سے دوسرے بندے کو الٹا اکتاہٹ ہی ہوگی۔ اس لیے خواتین کو چاہیے کہ وہ خود کو اقتصادی طور پر بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ اس حوالے سے دختر سردار احمد نے اپنے مضمون "بیٹا اور بیٹی میں فرق"[۱۱۶] میں مدلل احوال درج کیے ہیں اور مشورہ بھی دیا ہے کہ کیسے زندگی کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

۷۔ عورتوں کی قومی و ملی خدمات:

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے ہندوستان میں خواتین کے لیے ایسے کلب کے انعقاد کرنے کی

تلقین کی جو عام خواتین کے لیے مفید ثابت ہو سکیں جہاں انھیں ملک وملت کی دیگر خواتین کی مدد کرنے کے مواقع فراہم کیے جا سکیں اور انھیں قومی معاشرت کو بہتر بنانے میں مدد مل سکیں۔ ان کے مطابق خواتین کو قومی اصلاح کے لیے مردوں کے دوش بدوش کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں بیگم غلام رسول خاں نے اپنے مضمون میں عورتوں کی خدمات کے حوالے سے درج ذیل نکات بیان کیے:

۱۔ مسلم لڑکیوں میں اتحاد پیدا کرنا۔

۲۔ مسلم لڑکیوں کا ایک ایسا گروہ پیدا کرنا جو قومی کاموں کی درمے۔ قدمے۔ سخنے امداد کرے۔

۳۔ مسلم لڑکیاں قوم کی اصلاح کو عملی جامہ پہنائیں۔

۴۔ مسلم گرلز کلب فنڈ سے نادار لڑکیوں کو وظائف دے کر ایسی درسگاہوں اور صنعتی اسکولوں میں داخل کیا جائے۔ جن میں وہ ایسے ایسے ہنر سیکھیں جو ان کی آئندہ زندگی کا بہتر وسیلہ ہو سکیں۔"[۷]

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے خواتین کو ان کی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے ابھارا۔ انھوں نے انھیں یہ تاکید کی کہ وہ اپنی فہم وفراست سے ملکی قومی مسائل کو حل کر سکتی ہیں۔ انھیں اپنی گوناگوں صلاحیتوں کو بیکار نہیں جانے دینا چاہیے بل کہ ان کا مثبت استعمال کرتے ہوئے وہ قومی وملی بہتری کے لیے اپنی خدمات سرانجام دے سکتی ہیں اور ان کی وجہ سے دیگر ہندوستانی خواتین کے لیے شعور و آگہی کے راستے ہموار ہوں گے۔

ایس آر کرمانیہ نے بھی قومی وملی ترقی کے لیے مرد و عورت دونوں کا مساوی کام کرنا ضروری قرار دیا۔ ان کے مطابق اس دور کے ہندوستان کو جن انقلابات اور کش مکش کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس میں ہر طبقے اور ہر صنف کے فرد کو یکساں کوشش کرنی چاہیے۔ باہمی اخوت واتحاد سے ہی معاملات بہتر ڈگر اور درست سمت اپنائیں گے۔ اگر یہاں کے مرد وزن باہمی جھگڑوں میں الجھے رہیں گے تو سماجی سطح پر تنزلی کا شکار ہو جائیں گے۔ اس فکر کا اظہار ان کے مضمون "ملکی ترقی اور عورتیں"[۸] میں ملتا ہے۔ اسی فکر کی عکاسی اہلیہ سید احمد سبزواری کے مضمون "خواتین ہند کی عام حالت"[۹] میں کی گئی ہے۔ ان کے مطابق قومی وملکی ترقی کا مکمل دارومدار عورت اور مرد کے اکٹھے کام کرنے میں ہے۔ اگر مرد اسے اپنی ذمہ داری سمجھ کر نبھانے کی کوشش کریں بھی تو اس سے وہ نتائج برآمد نہیں ہوں گے جو دونوں کے برابری کی سطح پر کام کرنے سے ہو سکتے ہیں۔ فاطمہ صغرا بیگم نے "عورتیں اور ترقی"[۱۰] میں اسی فکر کا احاطہ کیا۔

مختصراً دیکھا جائے تو ہندوستانی سماج میں عورت کو ان کے بنیادی حقوق سے یکسر محروم رکھا جاتا تھا۔ یہ رویہ دنیا کے تمام ممالک میں یکساں تھا اوائل میں مغرب میں خواتین کے حقوق کے حصول کے لیے آواز بلند کی گئی اور انھیں ان کے بنیادی انسانی حقوق حاصل ہوئے۔ جب یہ لہر مغرب کے توسط سے ہندوستان میں پہنچی تو یہاں کے سماجی

اور مذہبی علمبرداروں نے اس کی سخت مذمت کی۔ ان کے خیال میں اگر خواتین کو ان کے حقوق کے حوالے سے معلومات پہنچائی گئیں تو جو خواتین اب تک ان کے تسلط میں تھیں اپنے حقوق کے بارے میں جان گئیں تو ان کا خواتین پر اقتدار کمزور پڑ جائے گا۔ لیکن شعور نسواں حامیوں کی ان گنت کوششوں کے بعد وہ خواتین میں شعور و بیداری پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ پہلے پہل خواتین کا ایک ایسا گروہ تیار کیا گیا جو دیگر خواتین کو ان کے حقوق سے روشناس کروا سکے۔ بعد ازاں ان خواتین نے تحریری اظہار سے خواتین میں ان کے حقوق کے حصول کے حوالے سے آگہی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان خواتین نے جن مسائل اور حقوق کے حاصل کرنے کی تعلیم دی ان میں سب سے پہلے طبقہ نسواں کی تعلیمی ترقی تھی۔ ان کے مطابق ہندوستانی خواتین چوں کہ عرصہ دراز سے جہالت کے اندھیروں میں گم ہیں اس لیے انھیں تعلیم دینا سب سے پہلا قدم ہو گا۔ انھوں نے خواتین کی بنیادی تعلیم، گھر گرہستی کے معاملات، تربیت اطفال و غیر ہم کے بارے میں انھیں آگاہ کیا۔ بعد ازاں انھیں اپنے حقوق کے حصول کی جدوجہد کے لیے آمادہ کیا۔ ان میں شادی بیاہ سے متعلق لڑکی کی پسندیدگی، شادی کے بعد نجی مسائل سے بیزار عورتوں کے لیے خلع و تنسیخ نکاح کے حقوق، بیوہ کے عقد ثانی کا حق، عورت کو بطور عام شہری ہونے اس کے جائز شرعی حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد کا حق شامل تھا۔

ان مصنفین نے عورتوں کو معاشی طور پر بھی مضبوط کرنے کی کوششیں کی اور ان کے معاشی حقوق کے تحفظ کی کوشش کے لیے تیار کیا۔ خواتین کو دیے گئے معاشی حقوق میں وراثت میں حصہ، ترکے میں حصہ اور حق مہر کے حقوق شامل ہیں۔ ان خواتین کو اس بات کا خیال تھا کہ جب تک عورت معاشی طور پر مستحکم نہیں ہو گی اس کی آواز کی کوئی اہمیت نہیں ہو گی۔ اسلام میں عورت کے لیے جائیداد رکھنا، خرید و فروخت، اور اپنے مال کے اپنی مرضی سے استعمال پر کہیں کوئی پابندی نہیں لگائی۔ لیکن سماجی اجارہ داروں نے انھیں یہاں بھی محکوم رکھا ہے اور اپنی شریعت کے مطابق معاملات طے کرتے ہیں۔

تہذیب نسواں کی مصنفین نے اپنی تحریروں کے ذریعے خواتین کو ان کی ذمہ داریوں کے بارے میں بھی آگاہ کیا۔ انھوں نے خواتین کو یہ باور کروایا کہ ایک ذی شعور انسان ہونے کے ناطے ان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے شعور اور فہم و فراست سے قومی و ملی صورت حال کو بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ اگر وہ ملک کی اقتصادی ترقی میں کوئی کردار ادا کر سکتی ہیں تو انھیں اس کے لیے ضرور کوشش کرنی چاہیے۔

ان مصنفین نے ہندوستان میں رائج پردے کے قدیم اور فرسودہ نظام کو بھی ہدف تنقید بنایا۔ ان کے مطابق پردے کی اوٹ میں خواتین کو ان کے حقوق و فرائض سے محروم رکھا جاتا ہے کیوں کہ یہاں پردہ اسلامی شعار کے مطابق رائج نہیں ہے۔ اسلام میں پردے کے حوالے سے اتنی سخت تاکید نہیں کی گئی جتنی یہاں کی جاتی ہے۔ اسلام

میں عورت کو سماجی زندگی کو بہتر طور پر گزارنے کی مکمل آزادی دی گئی ہے۔ لیکن یہاں پردہ انھیں محدود کرنے کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔

مرد اور عورت کو اللہ نے یکساں انسانی حقوق دیے ہیں۔ لیکن نو آبادیاتی ہندوستان میں اس حوالے سے بھی بہت سے تفرقات ملتے ہیں۔ مردوں نے اپنی سہولت کی خاطر خواتین کو اتنا محدود کر دیا ہے کہ وہ اپنی رائے کا اظہار بھی نہیں کر سکتی۔ نا ہی وہ اپنی زندگی کے اہم فیصلے خود مختاری سے لے سکتی ہے۔ اسے سیاسی معاملات میں بھی مکمل آزادی ہے کہ وہ اپنے جائز انسانی حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد کر سکے۔ کیوں کہ جب تک فرد اپنی بہتری کے لیے خود کوشش نہ کرے اس کی فلاح و بہبود کا خیال کسی دوسرے کو نہیں آئے گا۔

مندرجہ بالا تمام معاملات پر تہذیب نسواں کی خواتین بہتر شعور رکھتی تھیں اور انھوں نے ہندوستان کی عام عورت کو بھی یہ ترغیب دی کہ وہ اپنی فلاح کے لیے کوشش کریں تاکہ معاشرے میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکیں۔ اور وہ خواتین کی حالت کو بہتر بنانے میں کامیاب بھی ہوئیں۔

حوالہ جات

۱۔ فہمیدہ ریاض، "فیمنزم اور ہم"، مشمولہ اردو ادب اور تانیثیت(منتخب مضامین)، مرتبہ قاضی عابد (اسلام آباد: پورب اکادمی ۲۰۱۶ء): ص۷۔

۲۔ غلام شبیر رانا، "اردو ادب میں تانیثیت کی روایت"، مشمولہ پیغام آشنا، جلد۱۴، شمارہ ۵۳-۵۴، (۲۰۱۳ء): ص۱۱۰تا۱۱۱۔

۳۔ نجیبہ عارف، "اردو ادب میں تانیثیت کی تحریک" مشمولہ رفتہ و آئندہ(اردو ادب کا منظر نامہ)، (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۸ء): ص۵۰۔

۴۔ شمس الرحمٰن فاروقی، "تانیثیت(Feminism) کی تفہیم"، مشمولہ اردو ادب اور تانیثیت، مرتبہ قاضی عابد (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۶ء): ص۴۷۔

۵۔ اہلیہ خواجہ حسین علی، "گرل اسکول کی مخالفت"، تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۳۷، (۱۱ستمبر ۱۹۱۵ء): ص۷۴۴۔

۶۔ نجمہ سلطانہ، "مسلم خواتین کی تعلیمی پسماندگی"، مشمولہ ماہانہ اردو دنیا(مارچ۲۰۱۸ء)۔

۷۔ آصفہ خاتون، "تعلیم کیوں چھوڑیں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۲۶(۱۰مارچ۱۹۲۳ء): ص۱۵۷۔

۸۔ شاہزادجہاں بیگم، "ہماری مصیبت کیونکر دور ہو"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۴۰، نمبر۱۵(۱۰اپریل ۱۹۳۷ء): ص۳۵۸۔

۹۔ بنت کبرٰے، "منصفانہ نظر"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۲۳، نمبر۲(۱۰، جنوری ۱۹۲۰ء): ص۲۱۔

۱۰۔ خدیجۃالکبریٰ، "مروجہ تعلیم نسواں"، مشمولہ تہذیب نسواں نمبر۳(۲۰مارچ۱۹۲۵ء): ص۲۸۔

۱۱۔ غوثیہ بیگم، "یادگار شہزادی ویلز"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۸، نمبر۲۶(اجولائی۱۹۰۵ء): ص۳۰۹۔

۱۲۔ ثریا عندلیب، تہذیب نسواں، جلد۴۴، نمبر، ۲۲(۱۲مارچ۱۹۴۱ء): ص۲۸۶۔

۱۳۔ نجمہ امتیاز علی، "قصور کس کا؟"، مشمولہ تہذیب نسواں، شمارہ۲۲(۲جون۱۹۲۳ء): ص۳۴۶تا۳۴۸۔

۱۴۔ م۔رخ بدایونی، "ہمارے لیے اسکولوں کی ضرورت"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۸، نمبر۳۴، (۲۶اگست ۱۹۰۵ء): ص۳۵۷، ۳۵۸۔

۱۵۔ فاطمہ صغرا بیگم، "اخلاق نسواں"، مشمولہ تہذیب نسواں ، جلد۱۷، نمبر۴۲(۱۷ اکتوبر ۱۹۱۴ء): ص۵۰۲، ۵۰۳۔

۱۶۔ وحیدہ یعقوب،"خوشنودی شوہر"،مشمولہ تہذیب نسواں ،جلد۱۷، نمبر۴۶(۱۴نومبر ۱۹۱۴ء): ص۵۵۵۔

۱۷۔ بشیر بیگم،"ہماری تعلیم"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۸، نمبر۳،(۲۱جنوری۱۹۰۵ء):ص۲۱۔

۱۸۔ ہمشیرہ مراد میاں ،"عورتوں کی تعلیم"،مشمولہ تہذیب نسواں ،جلد۸، نمبر۲۱(۲۷ مئی ۱۹۰۵ء): ص۱۹۲۔

۱۹۔ بیگم ایوب خاں،"مذہبی تعلیم "، مشمولہ تہذیب نسواں ،جلد۳۷، نمبر۱۳ (۳۱مارچ ۱۹۳۴ ء): ص ۲۹۱تا۲۹۳۔

۲۰۔ شاہزادجہاں بیگم،"تعلیم نسواں کی ترقی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۷، نمبر۳۳(۱۸اگست۱۹۳۴ء) ص۷۹۱تا۷۹۳۔

۲۱۔ ایضاً ،" اصلاح مسلم خواتین"، مشمولہ تہذیب نسواں ،جلد۳۷، نمبر۳۹ (۲۹ستمبر ۱۹۳۴ ء):ص ۹۳۰تا۹۳۱۔

۲۲۔ ایضاً، "تعلیم نسواں کے متعلق غلط فہمی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر ۲۲(۳۰مئی۱۹۳۶ء):ص ۵۰۵تا۵۰۸۔

۲۳۔ ہاجرہ، "ہماری تعلیم"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد۱۸، نمبر۶(۶فروری۱۹۱۵ء):ص۶۸-۶۶۔

۲۴۔ جمیلہ بیگم، "تعلیم یافتہ خواتین کا مستقبل"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۳۲(۱۸اگست۱۹۳۶ء): ص۷۶۵تا۷۷۰۔

۲۵۔ ایضاً، "بچی کی تعلیم"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۴۰، نمبر۲۹(۱۷جولائی۱۹۳۷ء):ص۶۸۹تا۶۹۲۔

۲۶۔ بیگم شارق، "تعلیم نسواں پر ایک نظر"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۸، نمبر۳۹(۲۸ستمبر۱۹۳۵ء) ص۹۳۳تا۹۳۵۔

۲۷۔ ہمشیرہ مراد میاں، "عورتوں کی تعلیم"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد، شمارہ۱۲(۱۹۰۵ء):ص۱۹۱تا۱۹۳

۲۸۔ امت الوحی، "لڑکیوں کی تعلیم سے بے پروائی" ہتہذیب نسواں، جلد۴۰، نمبر۱۴(۱۳اپریل۱۹۳۷ء): ص۳۲۱تا۳۲۴۔

۲۹۔ مسز حامد علی، "ہماری موجودہ تعلیم"، مشمولہ تہذیب نسواں جلد۴۶(۲۰مارچ۱۹۴۳ء):ص۱۹۰۔

۳۰۔ ب،ز،ب، "تعلیم نسواں"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۲۶، شمارہ ۲۵ (۲۳ جون ۱۹۲۳ء):ص ۳۸۶۔۳۸۵۔

۳۱۔ ط۔خ، "عورتوں کو اعلیٰ تعلیم"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۸، شمارہ ۲۵ (۱۹۰۵ء): ص ۲۳۹ تا ۲۴۰۔

۳۲۔ بیگم یار محمد خاں، "تعلیم نسواں اور دعوتِ عمل"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۲۲ (۲۹ مئی ۱۹۳۷ء): ص ۵۰۳ تا ۵۰۵۔

۳۳۔ ایضاً، "ہماری تعلیمی پستی کا واحد سبب"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۴۰ (۲ اکتوبر ۱۹۳۷ء): ص ۹۴۱ تا ۹۴۲۔

۳۴۔ فاطمہ بیگم، "عورتوں کی تعلیم"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۱۹، شمارہ ۵ (۲۹ جنوری ۱۹۱۶ء): ص ۵۹۔۵۷۔

۳۵۔ جانِ جہاں، "تعلیم نسواں"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۱۸، شمارہ ۲۷ (۳ جولائی ۱۹۱۵ء): ص ۳۲۲۔ ۳۲۱۔

۳۶۔ رفعیہ بیگم، "انگریزی تعلیم نسواں"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۱۸، شمارہ ۳۹ (۱۸ ستمبر ۱۹۱۵ء): ص ۴۶۶۔۴۶۵۔

۳۷۔ سردار محمدی بیگم، "عورتوں کو لکھنا پڑھنا سکھانا"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۳۲، شمارہ ۲۸ (۱۴ جولائی ۱۹۲۸ء): ص ۶۸۲۔۶۸۱۔

۳۸۔ ہمشیرہ احمد مبین، "تعلیم کیوں چھوڑیں"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۲۶، شمارہ ۲۲ (۲ جون ۱۹۲۳ء): ص ۳۴۹۔۳۴۸۔

۳۹۔ امۃ الحمید، "عورتوں کی تعلیم"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۱۹، شمارہ ۵ (۲۹ جنوری ۱۹۱۶ء): ص ۵۱۔ ۵۲۔

۴۰۔ ایضاً، "مسلم گرلز سکول علی گڑھ"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۲۵، شمارہ ۳۵ (۲۹ جولائی ۱۹۲۲ء): ص ۴۶۵ تا ۴۶۷

۴۱۔ مسز سید احمد مچھلی شہری، "علی گڑھ میں مسلم خواتین کے لیے ڈگری کالج"، مشمولہ تہذیب نسواں جلد ۳۹، نمبر ۲۹ (۱۸ جولائی ۱۹۳۶ء): ص ۶۸۹ تا ۶۹۰۔

۴۲۔ حسینی بیگم، "زنانہ مدرسہ"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۸، شمارہ ۲۲ (۱۹۰۵ء): ص ۲۰۷ تا ۲۰۸۔

۴۳۔ مبارک دلھن، "مسلم انجمن گرل اسکول"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۹، نمبر ۱۶ (۱۸ اپریل ۱۹۳۶ء): ص ۳۷۸ تا ۳۸۱۔

۴۴۔ بنت مظفر کریم، "مسلم گرلز سکول میرٹھ"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۲۵، شمارہ ۳۵(۲۹جولائی ۱۹۲۲ء): ص ۴۷۸تا۴۷۹۔

۴۵۔ سعیدہ خاتون، "دیہاتی لڑکیوں کا شوق تعلیم"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۳۲، شمارہ ۶(۹فروری ۱۹۲۹ء): ص۱۴۷۔۱۴۵۔

۴۶۔ اہلیہ عبدالباری، "علم کے ساتھ ہنر بھی"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۲۶، شمارہ ۳۰(۲۸ جولائی ۱۹۲۳ء): ص۴۷۸۔۴۷۶۔

۴۷۔ یو۔ایس۔کے، "آج کل کی لڑکیوں کا تعلیمی شوق"، تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۱۹(۸مئی ۱۹۳۷ء): ص۴۴۵تا۴۴۷۔

۴۸۔ مبارک دلھن، "غیر تعلیم یافتہ لڑکیوں کی شادی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۳۱(۳۱جولائی ۱۹۳۷ء): ص۷۲۵تا۷۲۷۔

۴۹۔ عنیزہ، "یک جدیوں میں شادی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۱۸، نمبر ۳۰(۲۴جولائی ۱۹۱۵ء): ص۳۵۸۔

۵۰۔ ایم۔ جے بیگم، "پیدائشی منگنی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۴۵(۱۰نومبر ۱۹۲۸ء): ص۱۰۹۶۔ ۱۰۹۵۔

۵۱۔ محمد یعقوب، "خلع بل: کونسل آف سٹیٹ میں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۲، نمبر ۱۶(۲۲ اپریل ۱۹۳۹ء): ص ۳۶۳۔

۵۲۔ امت الوحی، "گلا گھونٹ نکاح"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۵، نمبر ۳۹(۲۴ ستمبر ۱۹۳۲ء): ص۹۱۹۔

۵۳۔ مسز جی ایم قریشی، "بیوہ کی زندگی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۴۷ (۲۱نومبر ۱۹۳۱ء): ص ۱۲۰۱۔

۵۴۔ ت، "میاں بیوی کی ناموافقت"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۹، نمبر ۳۱(۳۱جولائی ۱۹۲۶ء): ص۵۱۸۔

۵۵۔ شاہزاد جہاں بیگم، "ہماری خانگی زندگی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۲۲(۲۹مئی ۱۹۳۷ء): ص ۵۰۲تا۵۰۳۔

۵۶۔ نغمہ پروین، "عورتوں کے حقوق سیرت نبوی کی روشنی میں"، تاریخ ملاحظہ: ۳۱۔۰۸۔۲۰۲۱،
-۰۲http://darululoom-deoband.com/urdu/magazine/new/tmp/
.html۴_Oct_۱۰Huquq_MDU_۲۰Ke%۲۰Auraton%

۵۷۔ ذاکر نائک، "اسلام میں عورت کے معاشی حقوق"، مشمولہ اسلام میں خواتین کے حقوق مترجم سید امتیاز احمد (لاہور: دارالنوادر۔۲۰۰۶ء): ص۲۵۔

۵۸۔ بلقیس بانو، "شرعی حقوق اور ہم"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۳، (۱۹ اگست ۱۹۳۹ء): ص۸۰۳۔

۵۹۔ تاج بیگم، "وراثت نسواں"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۳۲، شمارہ ۱۹ (۱۱ مئی ۱۹۲۹ء): ص۴۴۴۔ ۴۴۶۔

۶۰۔ القرآن۔انڈکس مضامین قرآن کریم (پاکستان: اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن ۲۰۰۲ء): ص۵۱۰۔

۶۱۔ ایضاً، ص۵۱۰۔

۶۲۔ تاج بیگم، "صوبہ پنجاب میں وراثت نسواں کا رواج عام"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۱۹ (۱۱ مئی ۱۹۲۹ء): ص۴۴۴۔

۶۳۔ ک۔ن، "ترکے میں رشتہ داروں کا حصہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۲۴ (۲۵ جون ۱۹۳۳ء): ص۵۸۸ تا ۵۹۰۔

۶۴۔ امت الوحی، "مرد خود مختار ہیں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۴۳ (۲۶ اکتوبر ۱۹۲۹ء): ص۱۰۳۶۔

۶۵۔ تاج النسا بیگم، "باہمت عورتی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۶ (۲۴ مارچ ۱۹۲۳ء): ص۱۸۲ تا ۱۸۳۔

۶۶۔ جمیلہ بیگم، "امریکہ کی کارکن بیبیاں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۳ (۲ دسمبر ۱۹۳۹ء): ص۱۱۶۹۔

۶۷۔ ایضاً، "عورتوں کی عملی زندگی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۲، نمبر ۲۵ (۲۴ جون ۱۹۳۹): ص۵۸۸۔

۶۸۔ بیگم آباد احمد خاں "اقتصادی آزادی"، مشمولہ تہذیب نسواں جلد ۲۶ (۲۶ جون ۱۹۴۳ء): ص۴۰۶ تا ۴۰۹۔

۶۹۔ شاہزاد جہاں بیگم، "کسب معاش"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۳۳، شمارہ ۲۴ (۱۴ جون ۱۹۳۰ء): ص۵۸۷ تا ۵۵۹۔

۷۰۔ مبارک دلھن، "موٹر کا سفر"، تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۳۳ (۱۶ اگست ۱۹۳۰ء): ص۸۶۷، ۸۶۸۔

۷۱۔ خدیجۃ الکبریٰ، "ہندوستان کا مروجہ پردہ"، تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۵ (۱۸ مئی ۱۹۲۸ء): ص۴۱۸۔

۷۲۔ امت الوحی، "پردہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۵۰ (۱۵ دسمبر ۱۹۲۸ء): ص۱۲۰۱۔

۷۳۔ ب۔ن آنسہ ابراہیم، "برقع"، مشمولہ تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۴۲ (۱۴ اکتوبر ۱۹۴۴ء): ص۶۱۶۔

۷۴۔ خاکسار بنت حفظ الکریم انصاری، "لڑکیوں کا پردہ عورتوں سے"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۵ (۲ فروری ۱۹۲۴ء): ص ۶۸ تا ۷۰۔

۷۵۔ خاکسار فاطمہ مس کے محمد حسین ،"وٹینگ روم اور ریل"، مشمولہ تہذیب نسواں ، جلد ۳۱، نمبر ۲۲ (۲ جون ۱۹۲۸ء): ص ۵۲۳ تا ۵۲۶۔

۷۶۔ صفیہ مدحت خانم، "پردہ نشین و بے پردہ خواتین"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۳۸ (۲۰ ستمبر ۱۹۳۰ء): ص ۹۳۴۔

۷۷۔ سعیدہ ہمشیرہ ڈاکٹر سید شفیع الدین"، ڈاکٹر سے پردہ"، مشمولہ تہذیب نسواں ، جلد ۳۶، نمبر ۱۵ (۱۵، اپریل ۱۹۳۳ء): ص ۳۵۶ تا ۳۵۷۔

۷۸۔ سعیدہ ہمشیرہ ڈاکٹر سید شفیع الدین ،"ڈاکٹر سے پردہ"، مشمولہ تہذیب نسواں ، جلد ۳۶، نمبر ۱۵ (۱۵، اپریل ۱۹۳۳ء): ص ۳۵۷۔

۷۹۔ Ananya Chatterji, *Women's Education in Colonial India: Transformation of Women's Identity by Colonial, Nationalist and Community reforms*(Education: In and Out) ۲۷ جنوری ۲۰۱۵ء بروز منگل , http://tiss-toss.blogspot.com/۲۰۱۵/۰۱/womens-education-in-colonial-india.html

۸۰۔ شاہزاد جہاں بیگم ،"نام چھپانا"، مشمولہ تہذیب نسواں ، جلد ۳۷، نمبر ۳۰ (۲۸ جولائی ۱۹۳۴ ء): ص ۷۱۰ تا ۷۱۱۔

۸۱۔ بلقیس بیگم، اپنا نام کیونکر لکھیں"، مشمولہ تہذیب نسواں ، جلد ۲۰، نمبر ۴۵ (۱۰ نومبر ۱۹۱۷ء): ص ۷۱۸۔

۸۲۔ فاطمہ صغرا بیگم ،"عورتیں اور ترقی "، مشمولہ تہذیب نسواں ، جلد ۱۸، نمبر ۳۴ (۲۱ اگست ۱۹۱۵ء): ص ۴۰۲۔

۸۳۔ امۃ الحمید خانم، تہذیب نسواں، جلد ۴۳ (۲۲ جولائی ۱۹۳۹ء): ص ۷۱۳۔

۸۴۔ جمیلہ بیگم ،"ہندوستانی خواتین اور تحریک آزادی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۴۲ (۱۵ اکتوبر ۱۹۳۸ء): ص ۱۰۷۷۔

۸۵۔ مسز برلاس ،"کوبے میں مسز برلاس کی تقریر"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۱۳ (۳۰

مارچ ۱۹۳۵ء): ص ۲۸۱ تا ۲۸۴۔

۸۶۔ مسز رضا، "ہماری بے بسی"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۲۶، شمارہ ۲۹ (۲۱ جولائی ۱۹۲۳ء): ص ۴۵۳۔ ۴۵۱۔

۸۷۔ ایضاً، "ہماری بے بسی"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۲۶، شمارہ ۳۰ (۲۸ جولائی ۱۹۲۳ء): ص ۴۶۶۔ ۴۶۰۔

۸۸۔ Ananya Chatterji, *Women's Education in Colonial India: Transformation of Women's Identity by Colonial, Nationalist and Community reforms*(Education: In and Out) ۲۷ جنوری ۲۰۱۵ء بروز منگل, http://tiss-toss.blogspot.com/۲۰۱۵/۰۱/womens-education-in-colonial-india.html

۸۹۔ حجاب اسماعیل، "خیال کی آزادی یا دخل در معقولات"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۴۳ (۲۷ اکتوبر ۱۹۲۸ء): ص ۱۰۲۹۔

۹۰۔ جمیلہ بیگم، "عورت کی آزادی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۳۱ (۳۱ جولائی ۱۹۳۷ء): ص ۷۲۱۔

۹۱۔ ع۔ب، "عورت کی آزادی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۳۳ (۱۴ اگست ۱۹۳۷ء): ص ۷۷۹۔

۹۲۔ شاہزاد جہاں بیگم، "عورتوں کے لیے پیشے"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۲۳ (۹ جون ۱۹۳۴ء): ص ۵۴۵ تا ۵۴۶۔

۹۳۔ بیگم شارق، "کیا لڑکیاں نوکری کریں؟"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۹، نمبر ۴۸ (۲۸ نومبر ۱۹۳۶ء): ص ۱۱۴۰ تا ۱۱۴۲۔

۹۴۔ نذر سجاد حیدر، "حریت نسواں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۱۰ (۶ مارچ ۱۹۳۷ء): ص ۲۱۷ تا ۲۲۰۔

۹۵۔ ایضاً، "حریت نسواں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۸ (۲۰ فروری ۱۹۳۷ء): ص ۱۷۳ تا ۱۷۵۔

۹۶۔ آصفہ خاتون، "تعلیم کیوں چھوڑیں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۶ (۱۰ مارچ ۱۹۲۳ء): ص ۱۵۷۔

۹۷۔ شاہزاد جہاں بیگم، "زنانہ آزادی" مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۲۳ (۵ جون ۱۹۳۷ء):
ص ۵۲۲ تا ۵۲۴۔

۹۸۔ جمیلہ بیگم، "عورت کی آزادی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۳۱ (۳۱ جولائی ۱۹۳۷ء):
ص ۷۲۱ تا ۷۲۳۔

۹۹۔ امت الوحی، "حریت و آزادی نسواں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۲۹ (۱۷ جولائی ۱۹۳۷ء):
ص ۶۸۱ تا ۶۸۴۔

۱۰۰۔ ع۔ب، "عورت کی آزادی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۳۳ (۱۴ اگست ۱۹۳۷ء):
ص ۷۷۸ تا ۷۷۹۔

۱۰۱۔ جہاں آرا شاہنواز، "نیا آئین حکومت اور ہندوستانی عورتیں"، تہذیب نسواں، جلد ۳۹، نمبر ۲۷
(۴ جولائی ۱۹۳۶ء): ص ۶۲۳۔

۱۰۲۔ نجمہ امتیاز، "تہذیب میں مضامین سیاست"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۳، نمبر ۲ (۱۰ جنوری ۱۹۲۰ء):
ص ۳۰۔

۱۰۳۔ جمیلہ بیگم، "عورتوں کی سیاسی ترقی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۹، نمبر ۸ (۲۲ فروری ۱۹۳۶ء):
ص ۱۷۳۔

۱۰۴۔ رشیدہ خاتون، "ہندوستانی مائیں اور سیاسی معاملات"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۹، نمبر ۱۲ (۲۱ مارچ
۱۹۳۶ء): ص ۲۷۱ تا ۲۷۳۔

۱۰۵۔ نفیس دلھن، "مسلم لیڈیز کانفرنس علی گڑھ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۱۵ (۱۱ اپریل
۱۹۳۱ء): ص ۳۴۵ تا ۳۴۷۔

۱۰۶۔ بسم اللہ بیگم، "خواتین کی انتخابی کشمکش میں مفاہمات کے امکانات"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۹، نمبر
۴۰ (۱۳ اکتوبر ۱۹۳۶ء): ص ۹۴۵ تا ۹۵۱۔

۱۰۷۔ نذر سجاد حیدر، "حریت نسواں" تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۸ (۲۰ فروری ۱۹۳۷ء): ص ۱۷۳ تا
۱۷۵۔

۱۰۸۔ نذر سجاد حیدر، "حریت نسواں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۱۰ (۶ مارچ ۱۹۳۷ء): ص ۲۱۷ تا
۲۲۰۔

۱۰۹۔ جہاں آرا شاہنواز، "نیا آئین حکومت اور ہندوستانی عورتیں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۹، نمبر ۲۷ (۴ جولائی ۱۹۳۶ء): ص ۶۲۵۔

۱۱۰۔ ح۔ب، "ہندوستانی عورتیں اور یورپین عورتیں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۳۶ (۶ ستمبر ۱۹۲۴ء): ص ۵۶۵۔

۱۱۱۔ شاہزادو جہاں، "بیٹی کی حق تلفی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۱۱ (۱۵، مارچ ۱۹۳۰ء): ص ۲۶۵۔

۱۱۲۔ لطیف، "بیٹی سے نفرت"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۱۷، نمبر ۴۶ (۱۴ نومبر ۱۹۱۴ء): ص ۵۵۲۔

۱۱۳۔ راقمہ رضوان، "بیٹی کی پیدائش"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۰، نمبر ۳۹ (۲۴ ستمبر ۱۹۲۵ء): ص ۷۹۱، ۷۹۲۔

۱۱۴۔ امت الوحی، "لڑکے کی خوشی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۹، نمبر ۴۵ (۶ نومبر ۱۹۲۶ء): ص ۷۴۳۔

۱۱۵۔ ایس آر کرمانیہ، "ازدواج"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۳۹ (۳۰ ستمبر ۱۹۳۳ء): ص ۹۳۸۔

۱۱۶۔ دختر سردار احمد، "بیٹا اور بیٹی میں فرق"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۸، نمبر ۳۱ (۵ اگست ۱۹۰۵ء): ص ۳۱۴ تا ۳۱۶۔

۱۱۷۔ بیگم غلام رسول خاں، "تحریک مسلم گرلز کلب لاہور"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۱۰ (۸ مارچ ۱۹۳۰ء): ص ۲۵۰۔

۱۱۸۔ ایس آر کرمانیہ، "قومی ترقی اور عورتیں" مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۵، نمبر ۴۵ (۵ نومبر ۱۹۳۲ء): ص ۱۰۵۵ تا ۱۰۵۸۔

۱۱۹۔ اہلیہ سید احمد سبزواری، "خواتین ہند کی عام حالت"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۴۴ (۴ نومبر ۱۹۳۳ء): ص ۱۰۷۱ تا ۱۰۷۵۔

۱۲۰۔ فاطمہ صغرا بیگم، "عورتیں اور ترقی"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۱۸، شمارہ ۳۴ (۲۱ اگست ۱۹۱۵ء): ص ۴۰۲۔۴۰۱۔

۱۲۱۔ آمنہ خاتون، "طبقہ نسواں پر رسول اللہ کے احسانات"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۲۵ (۲۳ جون ۱۹۳۴ء): ص ۵۷۰ تا ۵۸۱۔

۱۲۲۔ سعیدہ ہمشیرہ سید شفیع الدین احمد، "شادی میں رنجش"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۲۵ (۲۴ جون ۱۹۳۳ء): ص ۵۸۲ تا ۵۸۳۔

باب چہارم:

ازدواجی زندگی کے مسائل اور تربیت نسواں: تہذیب نسواں کی مصنفین کے افکار کی روشنی میں

باب چہارم:

ازدواجی زندگی کے مسائل اور تربیت نسواں:

تہذیب نسواں کی مصنفین کے افکار کی روشنی میں

ازدواجی زندگی کی خوشحالی کا تمام تر انحصار زوجین کے تعلق پر منحصر ہے۔ یہ تعلق جس قدر عزت اور محبت سے بھرپور ہو گا زندگی اسی قدر حسین اور خوشیوں سے بھرپور ہو گی۔ اسلام نے بھی زوجین پر ایک دوسرے کے حقوق و فرائض لازمی کیے ہیں تاکہ کوئی رنجش، کوئی کسر اور کوئی کدورت ان کے رشتے کو آلودہ نہ کرے۔ اور دونوں فریق باہمی ہم آہنگی سے زندگی گزاریں۔ ان میں سے کسی ایک کی بھی حق تلفی نہ ہو۔ وہ ایک دوسرے کے لیے راحت کا باعث بنیں۔ خوشیوں میں خوشی کو مل کر منائیں اور غم میں ایک دوسرے کا سہارا بنیں۔ جس میں کسی ایک کی بھی عزت نفس مجروح نہ ہو اور وہ زندگی کے تمام تر امور خوش اسلوبی سے نبھاتے رہیں۔

باہمی عزت و محبت ہی اس رشتے کی پائیداری کی ضامن ہے۔ لیکن دنیاوی نظام میں صورت اس کے بر عکس تھی۔ جس میں مرد کے ہاتھوں عورت کا استحصال کیا جا رہا تھا۔ ازدواجی رشتہ تو ایک طرف زندگی کے ہر شعبے اور رشتے میں عورت پائمال تھی۔ اسے اس کے جائز انسانی حقوق سے بھی محروم رکھا جاتا تھا۔ مغربی خواتین نے اپنے ساتھ ہونے والے غیر مساوی رویے کے خلاف اقدامات کیے اور اپنے حقوق کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہوئیں۔ جنھیں طویل جدوجہد کے بعد ان کے بنیادی انسانی حقوق مل گئے۔ جبکہ اسلام ایک دینِ مکمل ہے۔ جس میں ہر عمر، ہر رشتے، ہر گروہ کے انسان کے لیے اس کے حقوق کی وضاحت کی گئی ہے۔ اور تمام تر تحریکوں سے پہلے اسلام نے عورت کو اس کے حقوق کے بارے میں آگاہ کیا۔ لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں کی عرصہ دراز کی رفاقت کی وجہ سے ہندوستان کا سماجی ڈھانچا بری طرح متاثر ہوا۔ مسلمانوں نے اپنی تہذیب، روایات اور تعلیمات کو بھلا کر ہندوانی رسوم و رواج کو اپنایا اور اس حد تک تجاوز کر گئے کہ ان میں حد فاصل قائم کرنا مشکل ہو گیا۔ جہاں معاشرہ اپنی ریت رواج فراموش کر کے عدم توازن کا شکار ہوا وہیں عورت محکوم و مظلوم بن گئی۔ اور طرح طرح سے اس کا استحصال شروع ہوا۔ یہاں کے مرد نے عورت کو اپنی ملکیت سمجھتے ہوئے اسے اپنی مرضی سے ڈھالنے اور اپنی مرضی سے اس کی زندگی کے گزارنے کے لیے مجبور کر دیا۔ اور اسے اس کے جائز انسانی حقوق سے یکسر محروم کر دیا۔ مرد نے عورت کی زندگی کے بس ان کے لیے ایسے قوانین بنائے جن سے اس کی انا کی تسکین کے ساتھ ساتھ ذمہ داریوں میں کمی بھی واقع ہوئی۔ وہ عورت کو گھر میں مقید کر کے گھر گرہستی کی فکر سے بالکل آزاد ہو گیا۔ حالانکہ

اسلام میں جہاں عورت پر گھر کے نظام کو درست بنانے اور بچوں کی اچھی تربیت کرنے کی ذمہ داری عائد کی ہے وہیں مرد پر ان کے نان نفقے اور گھریلو زندگی کو خوشحال و خوشگوار بنانے کی ذمہ داری بھی عائد کی ہے۔ لیکن پدر سری معاشرے میں رہتے ہوئے مردوں نے ہر چیز کو اپنا حق سمجھ لیا اور اپنے فرائض نبھانا بھول گیا۔ جس سے خواتین اپنے شرعی حقوق سے بھی محروم ہو گئیں۔

ہندوستانی معاشرے میں عورت کو اس قدر محدود کر دیا گیا تھا کہ اس تک علم و فن اور روشن خیالی کی ہوا کا کوئی بھی جھونکا نہیں پہنچ پاتا تھا اور وہ اپنے حالات پر سمجھوتا کر کے زندگی گزارنے پر معمور تھی۔ یہ اس لیے بھی ضروری قرار دیا گیا کہ اگر خواتین شعور و آگہی حاصل کر لیں گی تو شاید مرد کے غلبے سے باہر نکل کر اپنے حقوق کے بارے میں سوال کر لیں گی، اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ عورتوں کو مثل ایک قیدی کے گھر میں بند رکھا جائے۔

مذہبی اجارہ داروں نے بھی مردوں کے فرائض اور خواتین کو دیے گئے حقوق کے حوالے سے من مرضی چلائی اور قوانین کو توڑ مروڑ کر مسخ شدہ شکل میں پیش کیا۔ جس سے اس کی اصل کہیں کھو گئی اور اس مسخ شدہ شکل کی پیروی کرنا ہر ہندوستانی عورت کے لیے فرض ہو گیا۔ جس نے اس سے انحراف کی کوشش کی اسے برا بھلا کہہ کر بد چلنی کا دھبہ بھی لگایا گیا۔

مندرجہ بالا تمام مسائل پر تہذیب نسواں کی خواتین کی گہری نظر تھی اور وہ عورتوں کی زبوں حالی پر پریشان بھی تھیں۔ اس لیے انھوں نے اپنے مضامین کے ذریعے ہندوستانی مستورات کو تربیت دینے کی کوشش کی تا کہ ان کی راہ میں حائل پردے کی رکاوٹ ان کے افکار کو دھندلا نہ کر دے اور وہ جدید رویوں سے متعارف ہونے سے رہ نہ جائیں۔ ان مسائل کو مد نظر رکھتے ہوئے مصنفین نے اپنے مضامین کے ذریعے ہندوستانی عورت کی تربیت کا کا فریضہ سرانجام دیا۔ اور یہاں کی عورتوں کو باشعور بنانے کی کوشش کی۔ انھوں نے اپنے مضامین میں عورت کی مرد کی مرضی کے مطابق اپنی زندگی گزارنے کی مجبوری کو خاص طور پر موضوع بنایا۔ ان کے نزدیک عورت اس لیے بھی مجبور ہے کہ وہ شعور نہیں رکھتی۔ اس لیے ان کی اس مجبوری کو ختم کرنے کے لیے انھیں باشعور بنانا ضروری ہے۔ ان مصنفین نے جدید معاشرتی مسائل اور اسلامی طرز زندگی کا ایک موازنہ پیش کیا۔ اور یہ باور کروایا کہ انسان ہونے کے ناطے عورت کو اللہ نے ان تمام حقوق سے نوازا ہے جو ایک مرد کو دیے گئے اس لیے مرد کو چاہیے کہ وہ اپنی من مرضی سے عورت کی زندگی اجیرن نہ کرے بل کہ اسے زندگی ایسے گزارنے دے جیسے خدا نے اس کے لیے آزادی کے ساتھ گزارنا ضروری قرار دیا ہے، عورت کو کوئی شے سمجھ کر اس پر اپنی مرضی تھوپنا کوئی عقل والا نہیں کرتا۔[1]

اس باب میں ہندوستانی عورت کے مسائل اور اس ضمن میں تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین کے شعور و آگہی کے حوالے سے بات کی جائے گی۔ جن میں بالخصوص ازدواجی زندگی سے متعلق مسائل پر تفصیل بیان کی

جائے گی۔اور یہ دیکھا جائے گا کہ تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے اپنے شعور و آگہی کے ذریعے کس طرح عورت کی خانگی اور ازدواجی زندگی کو بہتر بنانے کی تربیت دی ہے۔ جس سے ان کے اپنے حقوق کی تلفی نہ ہو اور سماجی نظام بھی بگڑنے نہ پائے۔ ذیل میں ازدواجی زندگی کے حوالے سے تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین کے افکار کا جائزہ لیا جائے گا اور یہ دیکھا جائے گا کہ انھوں نے کس طرح ہندوستانی عورت کی تربیت کا فریضہ سرانجام دیا۔

ازدواجی زندگی سے متعلقہ معاملات و مسائل:

مندرجہ بالا سطور میں ہندوستانی عورت کے حقوق کے حوالے سے تفصیل بیان کی جاچکی ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوا ہے کہ پدر سری معاشرہ عورت کے استحصال کی ایک بڑی وجہ ہے۔اور یہ استحصال ہر سطح پر جاری ہے۔ چاہے وہ شادی شدہ ہو یا کنواری، کم سن ہو یا بوڑھی، طلاق یافتہ ہو یا بیوہ اسے ہر حال میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور اس کی بڑی وجہ انھیں اپنے حقوق کا ادراک نہ ہونا ہے۔ اگر انھیں اپنے جائز حقوق کے بارے میں مناسب معلومات ہوں تو شاید یہ طبقہ اس قدر مشکل سے بچ جائے۔

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے عورتوں کو ازدواجی زندگی سے متعلق جن معاملات پر شعور و آگہی دینے کی کوشش کی ان میں صغر سنی کی منگنی اور نکاح، شادی کے معاملے میں لڑکی کی پسند کا خیال، حق مہر، خلع کا حق، فسخ نکاح، بیوہ کا عقد ثانی، شوہر کی جائیداد میں عورت کا حصہ، تربیت اطفال، عدت کے مسائل اور تعدد ازدواج جیسے اہم معاملات شامل ہیں۔ ان مصنفین نے اسلامی شریعت اور احکامات کے مطابق فرائض کی ادائگی کی اہمیت کو اجاگر کیا اور خوشگوار ازدواجی تعلقات کی بنیاد قرار دیا۔ ازدواجی زندگی اور اس سے متعلق مسائل و مباحث پر مشتمل مضامین میں ایس۔ آر۔ کے کا مضمون "ازدواج" [۲]، بنت معین الدین کا مضمون "شوہر پرستی" [۳] اور ام کلثوم کا مضمون "قصوروار کون" [۴] شامل ہیں۔

ا۔ صغر سنی کی شادی:

ہندوستانی معاشرے میں یہ نظام رائج تھا کہ لڑکوں اور لڑکیوں کی نسبت ان کے بچپن ہی میں طے کر دی جاتی تھی۔ جسے نبھانا دونوں کے خاندانوں کی روایات کے بقا کے لیے بہت ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ لیکن اس دوران وہ یہ بھول جاتے تھے کہ بلوغت سے پہلے لڑکا اور لڑکی اس قابل نہیں ہوتے کہ اپنی زندگی کے اتنے اہم فیصلے لے سکیں۔

عزیز رشتہ دار وقتی طور پر خاندانی دوستیاں اور رشتہ داریاں مضبوط کرنے کی خاطر ایسے اقدامات کرتے ہیں لیکن وہ اس سے بے خبر رہتے ہیں کہ اگر دونوں میں نابن پائی تو یہی قدم ان کے لیے ہمیشہ کی ناراضگی اور خفگی کا باعث

بن سکتا ہے۔ والدین کی اسی بے توجہی اور ضد کی وجہ سے ایسی لڑکیاں بڑی تعداد میں موجود ہیں جو اپنی زندگی کے بس دن گزار رہی ہیں۔ ان کے لیے ان کا رشتہ کوئی وقعت و معنیت نہیں رکھتا۔ کیوں کہ جب وہ شعور کی منزلیں طے کرتے ہوئے بلوغت کو پہنچے تو اس رشتے میں وہ کشش محسوس نہ کر سکے جو ہونی چاہیے اور بعد ازاں ایسی شادیاں محض سمجھوتا سمجھ کر نبھائی گئیں۔

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے بچپن کے عقد اور منگنیوں کی مخالفت کی ہے اور شادی کے لیے اسلام کی بتائی ہوئی مخصوص عمر کا ہونا ضروری قرار دیا۔ انھوں نے شادی بیاہ کے معاملے میں شریعت کے اصولوں کو مدنظر رکھنا ضروری قرار دیا۔ ایم۔ جے بیگم صغر سنی کے رشتوں کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ:

> ۔۔۔۔ عزیز بچہ کی پیدائش سے قبل ہی یہ کہ دیتے ہیں کہ اگر تمھارے ہاں لڑکی ہوئی تو ہم اپنے ننھے میاں یا منے میاں کے ساتھ اس کی شادی کریں گے۔۔ بس اس وقت یہ بات ہمیشہ کے لیے پکی سمجھی جاتی ہے۔ بعض جاہل تو اس غیر شرعی معاہدہ کو حکم خداوندی کی طرح فرض سمجھ کر اس کی مخالفت کو معاذ اللہ شرک و کفر خیال کرتے ہیں۔ بعد کو اگر لڑکے یا لڑکی کی مرضی نہیں بھی ہوتی تو بھی خاندان میں ناک کٹ جانے کے خیال سے دونوں کو شادی کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ درگور کر دیتے ہیں۔۔۔[۵]

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تہذیب نسواں کی مصنفین نے بچپن کی شادیوں کی مخالفت کی ہے۔ وہ ایسا کرنے والے کو اللہ کے احکامات کی خلاف ورزی اور شرک و کفر قرار دیتی ہیں۔ ان کے نزدیک ایسے رشتے بچوں کو زندہ درگور کر دینے کے مساوی ہوتے ہیں۔ مصنفہ ع نے بھی کم عمر کی شادیوں کے رواج کی مخالفت کی اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں شادی کی عمر کے حوالے سے اپنے نظریات کی عکاسی کی۔ اس ضمن میں ان کا مضمون "شادی کی قانونی عمر"[۶] ہندوستانی سماج میں رائج شادی کے حوالے سے فرسودہ رسومات اور اسلامی تعلیمات کے مطابق شادی کی عمر کے تعین کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے۔

۲۔ شادی کے معاملات میں عورت کے اختیارات:

اسلامی معاشرتی نظام کا ایک اہم رکن نکاح ہے۔ جس سے منسلک ہو کر ایک مرد اور ایک عورت اسلامی اصولوں کے مطابق اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ قرآن میں اس کی سختی سے تاکید کی گئی ہے تاکہ معاشرتی اقدار اسلامی اصولوں کے مطابق پروان چڑھ سکیں۔ نکاح نبی کریم ﷺ کی سنت ہے انھوں نے بھی نکاح کی تلقین کی اور کہا کہ نکاح میری سنت ہے، جس نے میری سنت پر عمل نہ کیا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

اسلام نے بہتر ازدواجی زندگی کے لیے جہاں نکاح کو لازمی قرار دیا وہیں اس کے لیے چند شرائط بھی رکھی

جس میں لڑکا اور لڑکی کا ایجاب و قبول، حق مہر اور گواہان کی موجودگی وغیرہ لازمی شرائط تھیں۔ ہندوستانی سماجی صورت حال کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہاں نکاح کی پہلی شرط یعنی ایجاب و قبول کو ہی نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ شادی یا نکاح کے معاملے میں اسلام نے عورت کو مکمل اختیارات دیے ہیں کہ وہ اپنی پسند ناپسند کا اظہار کر سکتی ہے لیکن سماجی اجارہ داروں نے جھوٹی شان کو برقرار رکھنے کے لیے عورت سے یہ حق چھین لیا۔ ان کے مطابق اگر عورت اپنی شادی کے لیے اپنی پسند کا اظہار کرے گی تو شاید وہ کوئی اچھی عورت نہیں ہے۔ اسی طرح کے مسائل اور افکار کی وجہ سے ہندوستانی عورت اپنے جائز شرعی حقوق سے محروم ہوتی گئی، اسے رسوم ورواج میں ایسا الجھایا اور فرسودہ خیالی کے اندھیروں میں بھٹکایا کہ وہ اپنی ذات کی بہتری کے لیے کہیں سے کوئی کرن اکٹھی نہ کر پائی۔ اور اس کی زندگی تاریکی میں ڈوبی رہی۔

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے ہندوستان کی عام خواتین کو ان مسائل سے نکالنے اور ان کے حقوق کے بارے میں آگاہ کرنے کے لیے مضامین لکھے تاکہ وہ کم علمی میں اپنی زندگیاں کسی دوسرے کے رحم و کرم پر نہ چھوڑ دیں۔ ان خواتین نے اسلامی تعلیمات اور قوانین میں عورت کو دیے گئے حقوق سے مثالیں دے کر عورتوں کے حقوق کی وضاحت کی۔ م۔ ب۔ ش شادی کے معاملے می لڑکی اور لڑکے کے اختیارات کو قرآن و سنت کی روشنی میں واضح کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:

> نبی کریم صلعم نے ایک بالغ لڑکی اور لڑکے کو شادی کی بابت اپنی رضامندی اور نارضامندی ظاہر کرنے کا پورا اختیار دیا ہے۔ اور والدین یا سرپرستوں کو اس امر کا حکم دیا ہے کہ وہ ان کی رضامندی کے بغیر ان کی شادی ہرگز نہ کریں۔۔۔[ے]

ہندوستانی معاشرتی پس منظر کے حوالے سے بات کی جائے تو یہاں کی خواتین کو شادی کے معاملے میں پسند ناپسند تو درکنار اپنی رضامندی کے اظہار کی بھی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے عین نکاح کے وقت جب عورت کی اجازت طلب کی جاتی ہے۔ عورت کی خاموشی کو اس کی روایتی شرم و حیا سے منسوب کر کے ہاں سمجھا جاتا ہے۔ حالاں کہ اسلام نے عورت کو شادی کے معاملے میں یہ اختیار دیا ہے کہ وہ اپنی پسند سے اپنے لیے ساتھی کا انتخاب کرلے۔ لیکن معاشرتی دباؤ اور غیر ضروری روایت پسندی نے یہ اختیار عورت سے چھین لیا۔ آنسہ اختر نے اپنے مضمون "ایجاب و قبول" میں اس مسئلے کی وضاحت کی ہے کہ شادی کے معاملے میں لڑکے اور لڑکی کی پسند نہایت ضروری ہے۔ انھوں نے شادی بیاہ کے لیے شرعی طریقہ کار کی اہمیت کو واضح کرنے کی کوشش کی ان کے مطابق۔ شریعت میں لڑکی اور لڑکے کو بنا کسی دباؤ کے اپنی مرضی کے اظہار کا اختیار دیا گیا ہے۔ اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں کہ:

> ۔۔۔۔درست اور شرع کے مطابق وہی نکاح ہو سکتا ہے۔ جس کے کرنے سے پیشتر لڑکے اور

> لڑکی دونوں کی رضامندی بغیر کسی دباؤ وغیرہ کے لے لی جائے۔ اور یہ اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ خداوند تعالیٰ والدین یا سرپرستوں کو احکام شریعت کی حقیقت اور اصلیت سمجھنے کی توفیق عنایت فرمائے۔ تا کہ وہ احکام شریعت کو صرف رسمیہ طور پر ہی ادا نہ کیا کریں۔[۸]

اسلامی تعلیمات کے مطابق شادی بیاہ کے معاملات میں لڑکے اور لڑکی پسندیدگی بہت ضروری ہے۔ لیکن نو آبادیاتی ہندوستان میں صورت کچھ مختلف نظر آتی ہے۔ایک طویل عرصہ مخلوط تہذیب میں زندگی گزارنے کے باعث مسلمان اپنی روایات سے ناآشنا ہو گئے اور انھوں نے ہندوسان کے مقامی لوگوں کی تہذیب اور اطوار کو اپنانا شروع کر دیا۔ جس کی وجہ سے رسوم ورواج میں بھی نمایاں تبدیلی نظر آئی۔ان میں سے ایک تبدیلی شادی بیاہ کے معاملات میں لڑکی اور لڑکے کے اختیارات اور پسندیدگی کا حق ہے۔ مسلمانوں نے شادی کی بنیاد کو ہی نظر انداز کر دیا اور لڑکے لڑکی کی باہمی پسند ناپسند کو در خور اعتنا نہیں جانا۔جب کہ اسلامی تعلیمات میں دونوں کی پسند کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

اس دور میں شادی کے معاملے میں ایک اور مسئلہ یہ بھی تھا کہ لڑکے اور لڑکی کو اپنے ہی خاندان میں رشتہ کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔اس کے پیچھے شاید یہ نکتہ کار فرما تھا کہ وہ بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور ایک دوسرے کی عادات و اطوار سے واقف ہیں اور شاید یہ ان کی خوشحال ازدواجی زندگی میں معاونت کر سکے۔ ایک حد تک تو یہ بات درست ہے کہ بچے ایک دوسرے کو اچھے طریقے سے جان لیتے ہیں لیکن اس حوالے سے دوسرا پہلو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ طویل عرصے کی رفاقت اور ساتھ کی وجہ سے انسان ایک دوسرے کے عیوب اور خامیوں سے بھی اچھی طرح واقف ہو جاتا ہے اور جنھیں جانتے ہوئے اس سے کسی قسم کا تعلق رکھنا انسان کے بس میں نہیں ہوتا۔ لیکن والدین اکثر بچوں کو اس کے لیے زبردستی مائل کرتے نظر آتے ہیں۔جو سراسر غلط ہے۔اس کی وضاحت کرتے ہوئے عزیزہ صاحبہ یوں لکھتی ہیں:

> ۔۔۔اپنی ہی برادری یا خاندان میں شادی کر کے لڑکا لڑکی میں اکثر دفعہ وہ محبت پیدا نہیں ہو سکتی جو دوسرے خاندان میں کرنے سے ہوتی ہے۔ کیوں کہ پہلی حالت میں دونوں ایک دوسرے کے عیبوں اور کمزوریوں سے واقف ہوتے ہیں اس لیے ایک دوسرے کو اتنی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ۔ایک قسم کا لحاظ ضرور ہوتا ہے کہ وہ اپنے رشتے دار کی بیٹی ہے مگر محبت ہونا دوسری بات ہے۔[۹]

شادی کے معاملے میں لڑکی رضامندی نہایت ضروری ہے۔ لڑکی کو اس کی پسند جانے بغیر کسی ایسے شخص سے باندھ دینا جسے وہ پسند نہیں کرتی شرع کے خلاف ہے۔ نجمہ عباسی نے اپنے مضمون "لڑکیوں کے لیے بر"[۱۰] میں انہی افکار کی ترسیل کی ہے۔اسی طرح شاہزادجہاں بیگم اپنے مضمون "پسند کی شادی"[۱۱] میں اسی نظریے کا پرچار کرتی

نظر آتی ہیں۔

تہذیب نسواں میں لکھنے والی بعض خواتین بھی قدیم روایات کی اسیر تھی۔ وہ خواتین کی تعلیم و ترقی تو چاہتی تھیں لیکن ایک مخصوص تہذیبی دائرہ کار میں رہتے ہوئے۔ انھوں نے جدید تہذیب کو ناپسند کرتے ہوئے اس کی مخالفت کی۔ یہی خیالات شادی کے معاملے میں لڑکیوں کی پسند ناپسند کے بھی تھے۔ اس ضمن میں س۔ الف اپنے مضمون "یک جدیوں میں شادی نمبر ۲" میں یوں رقمطراز ہیں:

> ۔۔۔۔ لڑکے لڑکی مرضی کی نسبت بھی جو یک جدیوں میں سہولتیں ہیں۔ وہ غیر جد میں کہاں؟ خدا تعالیٰ ہندوستانی لڑکیوں کی شرم وحیا قائم رکھے۔ اور وہ دن نہ دکھائے۔ کہ وہ امریکن عورتوں کی مانند بے شرم و بے باک بے پردہ پھر کر اپنے شوہر اپنی مرضی سے انتخاب کریں۔ اور بغیر دیکھے وہ مرضی کیا بتا سکتی ہیں۔۔۔ "[۱۲]

بعض مضمون نگار خواتین نے مغربی جدیدیت کی مخالفت کی۔ اور روایتی ہندوستانی طرز کو سراہا لیکن یہاں انھوں نے مشرقی و مغربی تہذیب کے مابین تفریق کی اور اسلامی تہذیب کو نظر انداز کر دیا۔ محولہ بالا اقتباس میں امریکی عورتوں کی مثال دی گئی ہے جب کہ شوہر کے انتخاب کی آزادی اسلام نے بھی عورت کو دی ہوئی ہے۔ اسی نظریے کی حمایت شاہزادجہاں بیگم نے بھی کی۔ انھوں نے شادی کے معاملے میں لڑکا اور لڑکی کی پسند کی اہمیت کو اجاگر کیا لیکن اس کے لیے حدود و قیود کا خیال رکھنا ضروری تصور کیا۔ ان کے نزدیک مذہبی اور معاشرتی روایات میں بھی اس چیز کو پسند نہیں کیا جاتا نہ ہی اس کی اجازت ہے کہ شادی سے پہلے لڑکا اور لڑکی میں مراسم بڑھیں۔ ان کے نزدیک دونوں کو ایک دوسرے کی عادات و خصائل، رجحانات اور پسند ناپسند کے بارے میں آگاہ کر دینا کافی ہے۔ اس فکر کی عکاسی ان کے مضمون "پسند کی شادی"[۱۳] میں کی گئی ہے۔ جمیلہ بیگم نے اپنے مضمون "بے جوڑ شادیاں"[۱۴] میں اسی فکر کا احاطہ کیا ہے۔

۳۔ حق مہر:

مہر کے اصطلاحی معنی ہیں اس مال کے جو عقد نکاح کے بعد عورت سے متمتع (فائدہ) ہونے کے عوض مرد کی جانب سے دیا جاتا ہے۔ یہ مال یا تو نکاح کے وقت عورت کو فوراً ادا کر دیا جاتا ہے یا ادا کرنے کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ "یہ شوہر اور بیوی کے تعلقات کی درستی، سچائی اور دوستی کی علامت ہے۔"[۱۵]

مہر شریعت کی رو سے نکاح کا ایک لازمی حصہ ہے۔ اور اسلام میں مرد کے لیے مہر کی ادائیگی لازمی قرار دی گئی ہے۔ قرآن مجید میں سورہ نسا میں مہر کے حوالے سے یہ آیات ملتی ہیں:

۔۔۔اور عورتوں کے مہر خوش دلی کے ساتھ (فرض جانتے ہوئے) ادا کرو البتہ اگر وہ اپنی خوشی سے مہر کا کوئی حصہ تمھیں معاف کر دیں تو اسے تم مزے سے کھا سکتے ہو۔[16]

ہندوستانی معاشرے میں یہ قانون عام تھا کہ عورتوں کے مہر یا معاف کروا لیے جائیں یا پھر ان کا حق مار لیا جائے۔ اگر عورت خود اپنا مہر معاف کر دیتی ہے تو پھر مرد اسے کھا سکتا ہے لیکن وہ عورت کو جبراً مہر کی معافی کے لیے رضامند نہیں کر سکتا۔

تہذیب نسواں کی خواتین نے عورت کے حقوق و فرائض کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا اور اسلام کی رو سے عورتوں کے حقوق کے حصول کی کوششیں بھی کی۔ اسلام میں نکاح کے وقت مہر کی ایک خاص رقم مختص کی جاتی ہے تا کہ مرد کے ذمے عورت کے فرائض اور مالی معاونت کا تعین کیا جا سکے۔ بعض لوگ یہ رقم ادا نہیں کر سکتے اور نا چاقی کے باوجود رشتے میں بندھے رہتے ہیں۔ جس سے ان کی ذہنی، گھریلو اور سماجی زندگی بہت متاثر ہوتی ہے۔

تہذیب نسواں کی خواتین نے اس موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے اس بات پر توجہ دلانے کی کوشش کی ہے کہ عورت کو اس کا مہر فوری ادا کر دینا ہی مناسب ہے اور ایسی رقم رکھوانا چاہیے کہ وہ ادا بھی کی جا سکے۔ بعض افراد زیادہ حق مہر رکھوا لینے کی وجہ سے ناچاہتے ہوئے بھی اس رشتے سے منسلک رہتے ہیں کیوں کہ وہ اس کو ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ شاہزادہ جہاں بیگم اس ضمن میں یوں رقمطراز ہیں:

طلاق نہ دینے کی وجہ یہ بھی ہے۔ کہ عورت کا مہر جس کا رواج ہندوستان میں طلاق کے وقت دینے کا ہے۔ دینا پڑتا ہے۔ اور روپیہ دینا ناگوار ہوتا ہے۔ بعض لوگ نادار ہوتے ہیں۔ جو اس قدر بڑی رقم نہیں دے سکتے۔ اس لیے طلاق دینے میں آسانی پیدا کرنے کے لیے چاہیے کہ مہر حسب حیثیت باندھا جائے۔ تا کہ اس کے ادا کرنے میں مشکل نہ ہو۔ مہر فوراً دے دیا جائے۔ اور ایسا نہ ہو کہ کسی وجہ سے روپیہ نہ رہے تو اس کا دینا مشکل ہو جائے۔[17]

عموماً مہر کی رقم زیادہ اس لیے رکھی جاتی ہے کہ شوہر عورت کو طلاق نہ دے سکے۔ شرعاً اور عقلاً یہ دونوں وجوہات غلط ہیں۔ کیوں کہ اگر مزاجوں میں اتنا اختلاف ہو کہ دونوں کا ایک جگہ ساتھ مل کر رہنا عذاب بن جائے تو اس عذاب سے چھٹکارا حاصل نہ کرنا کون سی عقلمندی ہو گی۔ لیکن یہ عذاب تو اسی وقت دور ہو سکتا ہے جب شوہر بیوی کو اس کا حق دے کر رخصت کر دے۔ شرعی اعتبار سے بھی زیادہ مہر مقرر کرنے کی ممانعت ہے جیسا کہ سید الانبیا ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ "زیادہ بابرکت وہ نکاح ہے جس میں تکلیف و پریشانی کم سے کم ہو"[18] اسلام میں جہاں عورتوں کو حقوق حاصل ہیں وہاں مرد کے لیے بھی کچھ گنجائشیں موجود ہیں۔ مہر کے معاملے میں مرد کو پابند نہیں کیا گیا کہ ایک خاص رقم کا مہر ہی ادا کرے بل کہ اس کے لیے یہ گنجائش موجود ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے

مطابق مہر کی ادائیگی کرے۔ ہندوستانی معاشرے میں مہر کے حوالے سے بہت سے مسائل موجود تھے۔ بعض خاندان محض اس لیے مہر کی رقم زیادہ لکھوا لیتے تھے کہ ان کی لڑکی کو طلاق نہ دی جا سکے۔ جبکہ ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے اور ناموافقت کی وجہ سے دونوں کی زندگی مسائل اور تلخیوں سے بھرپور گزرتی تھی۔ مرد میں اتنی استطاعت نہیں تھی کہ وہ مہر ادا کر کے اس رشتے سے فرار حاصل کر سکے۔ غرض یہ کہ ایک غلط فیصلے سے مرد اور عورت دونوں کی زندگی وبال بن جاتی تھی۔ امت الوحی نے مہر کے لیے اپنے ایک مضمون "طلاق اور مہر" میں مندرجہ ذیل تجاویز دی ہیں:

۱۔ شوہر یا اس کے باپ کی حیثیت کے مطابق مہر ہونا چاہیے۔ مثلاً

(الف) بننے والا شوہر جس قدر ماہوار آمدنی رکھتا ہو۔ اور اگر وہ بے کار ہے۔ اور اس کے کفیل والدین ہیں تو جتنی آمدنی ماہوار اس کے باپ کی ہو۔ اسی قدر مہر مقرر ہونا چاہیے۔ تاکہ عند الطلب یا طلاق کے وقت ایک مہینہ کی آمدنی سے بآسانی مہر ادا ہو سکے۔

(ب) شوہر یا خسر صاحب جائداد ہیں۔ تو جو مہر قرار پائے۔ اس کے برابر جائداد ہونے والی بیوی کے نام لکھ کر رجسٹری کرا دی جائے۔

(ج) یا مہر جو کچھ بھی قرار پائے۔ نکاح کے وقت نقد یا بصورت زیور وغیرہ ادا کر دیا جائے۔

(د) کچھ نقد جائداد کی صورت میں یا دونوں صورتوں میں ادا کر دیا جائے۔ اور کچھ ماہوار آمدنی سے عند الطلب ادا کیا جائے۔

۲۔ شوہر کی طرف سے ایسا اقرار نامہ تحریر ہوا کرے۔ کہ عند الطلب مہر بیوی کے نوٹس پر ادا نہ کروں۔ ایک سال سے تین سال تک بیوی کو اپنے پاس نہ رکھوں۔ یا اپنے ہاں نہ بلاؤں۔ اور نہ اس کے گھر جاؤں۔ یا نان و نفقہ ماہوار ادا نہ کروں۔ یا اس کو شریعت اور برادری کے منشا کے مطابق خوش نہ رکھوں۔ تو ان صورتوں میں اس میعاد کے بعد میری طرف سے طلاق سمجھی جائے گی۔ اور یا اس کو مفتی یا مقررہ کمیٹی یا ارکان برادری کے ذریعے میعاد گزر جانے کے بعد مجھ سے طلاق حاصل کرنے کا حق ہو گا اور وہ بقیہ مہر پانے کی مستحق ہو گی۔ علی ہذا بچے ہوں تو ان کے متعلق بھی شریعت کے مطابق عمل ہو گا۔ غرض یہ کہ سب شرطیں اور سہولتیں حدود شریعت کے اندر مقرر ہونا چاہیں۔"[۱۹]

بلقیس بانو مہر کی شرعی حیثیت اور خواتین کے حقوق کے حوالے سے اپنے خیالات پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:

> ـــــ مہر کی رقم جو ہر شریف گھرانے میں خاندانی روایات کے مطابق مقرر ہوتی ہے۔ اگرچہ اسی وقت نقد نہیں دی جاتی۔ لیکن اکثر گھرانوں میں ایک قرض سمجھی جاتی ہے۔ جس کے ادا کرنے کی

مختلف صورتیں ہیں۔ کہیں تو شوہر خود اپنی زندگی میں کوئی منقولہ جائداد (زمین یا مکان وغیرہ) بحق مہر زوجہ کو لکھ دیتا ہے۔ اور کہیں شوہر کی وفات کے بعد بیوہ مرحوم کی املاک پر بحق مہر قبضہ کر لیتی ہے۔ اور اگر دوسرے ورثا مزاحمت کرتے ہیں تو معاملہ عدالت تک جاتا ہے۔۔۔"[20]

تہذیب نسواں کی مصنفین نے ہندوستانی خواتین کو مہر کے حوالے سے ان کے شرعی حقوق سے متعارف کروایا تا کہ انھیں معاشی حقوق دلاوائے جاسکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ان عام غلطیوں کی طرف بھی اشارہ کیا جو مہر کے معاملے میں اکثر مسلمان گھرانوں میں پائی جاتی تھیں۔

صالحہ خاتون نے مہر کو مظلوم، کمزور، بے زبان اور بے بس عورتوں کے تحفظ کا ضامن قرار دیا۔ ہندوستانی معاشرے میں ایسے افراد موجود تھے جو چھوٹی چھوٹی باتوں اور ناچاقی کی وجہ سے غصے کی حالت میں اپنے رشتے سے فرار حاصل کر لیتے تھے۔ اس صورت میں مہر کی رقم ایک طرح سے ان عورتوں کے لیے تحفظ اور سہولت بن گیا کہ زن و شو کے معمولی مسائل کی بنا پر عورت طلاق جیسا دھبا لگنے سے بچ سکیں۔ ایسی صورت میں مہر مرد پر ایک طرح کا دباؤ ہوتا ہے کہ وہ چھوٹے موٹے جھگڑوں اور ناچاقیوں کی بنا پر علیحدگی اختیار نہیں کر پاتا۔ اس حوالے سے تفصیل ان کے مضمون "مہر"[21] میں ملتی ہے۔

جمیلہ ہاشمی نے اپنے مضمون "کچھ مہر کے متعلق"[22] میں مہر کی رقم کے حوالے سے اپنے خیالات پیش کیے۔ ان کے مطابق ہندوستانی معاشرے میں یہ رواج عام تھا کہ عورت کے تحفظ کے لیے مہر کی رقم اتنی زیادہ رکھوائی جاتی تھی کہ مرد تمام عمر اسے ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ یوں وہ اپنے شرعی فرض میں کوتاہی برتنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مصنفہ نے عورت کے حق کے ساتھ ساتھ اس بات کی اہمیت پر بھی زور دیا کہ مرد پر اتنا ہی بوجھ ڈالا جائے کہ وہ اسے برداشت کرنے کی طاقت رکھتا ہو، مہر کی رقم اتنی ہی لکھوائی جانا بہتر جتنی مرد کی استطاعت ہو اس سے زیادہ رقم کا مطالبہ شرعی معاملات کی خرابی کا باعث بن سکتی ہے۔ تہذیب نسواں کی ایک اور مضمون نگار خاتون ا۔ س نے بھی انہی خیالات کی تائید کی کہ مہر کو مرد کی استطاعت کے مطابق ہونا چاہیے تا کہ اس کی بروقت ادائیگی کی جا سکے۔[23] مہر کے حوالے سے مزید تفاصیل امت الوحی کے مضمون "طلاق اور مہر"[24] ب۔ ن کے مضمون "شادی اور مہر"،[25] اور جہاں آرا بیگم کے مضمون "مہر"[26] پیش کی گئی ہیں۔

۴۔ خلع اور فسخ نکاح کے حقوق:

اسلام ایک دین مکمل ہے جس میں تمام انسانوں کو ان کی بنیادی انسانی حقوق عطا کیے گئے ہیں اور ان پر عمل درامد کے لیے قوانین بھی مرتب کیے گئے ہیں۔ لیکن بسا اوقات تہذیبوں کے تصادم اور سماجی رسوم کی پابندی کی وجہ

سے ان احکامات اور قوانین کی پابندی نہیں کی جاتی۔ جس سے سماجی ڈھانچا متاثر ہوتا ہے اور انسانی حقوق کی پامالی ہوتی ہے۔

ہندوستانی معاشرے کی مخلوط تہذیب و ثقافت کے نتیجے میں جہاں اور مسائل نے جنم لیا ان میں ایک مسئلہ عورت کے لیے ازدواجی زندگی کی ناجائز پابندیاں تھیں۔ اسلام میں ازدواجی زندگی کے مسائل پر قابو پانے کے لیے ایک لائحہ عمل ترتیب دیا گیا تھا کہ اگر شوہر اور بیوی کی آپس میں کسی بھی معاملے پر نا اتفاقی ہو اور عورت اس سے چھٹکارا چاہتی ہو تو اسے خلع کا حق دیا گیا تھا۔ لیکن ہندو مذہب کی طرح مسلمانوں میں بھی یہ رواج عام پا رہا تھا کہ عورت کو اس کے اختیارات سے محروم کر کے محدود کیا گیا تھا۔ اور اسے کسی بھی صورت میں اپنے رشتے کو نبھانے کے لیے مجبور کیا جاتا تھا۔ مرد کے لیے اتنی گنجائش موجود تھی کہ وہ اپنے رشتے سے فرار کے لیے طلاق کا راستہ اختیار کر سکتا تھا لیکن عورت کو اس کا یہ شرعی حق حاصل نہ تھا۔ جس کی وجہ سماجی دباؤ کے علاوہ اور کچھ نہ تھی۔ جو عورت مرد سے علیحدگی کی خواہش مند ہوتی اسے برا بھلا کہ کر خاموش کروا دیا جاتا تھا۔

تہذیب نسواں کی مصنفین کی اس سماجی مجبوری کو سمجھتے ہوئے ایسے مضامین کا سلسلہ شروع کیا جس میں انھیں ان کے اسلامی اور شرعی حقوق سے متعارف کروایا گیا۔ اور انھیں اس بات کا یقین دلایا کہ خلع لینا کوئی جرم نہیں ہے بل کہ ان کا حق ہے۔ سماج کا کوئی بھی فرد اور کوئی بھی طاقت انھیں ان کے اس جائز حق سے محروم نہیں کر سکتا۔ اسلام نے عورت کو خلع کا حق دیا ہے اور خلع نہ ملنے کی صورت میں فسخ نکاح کے قوانین بھی موجود ہیں۔ اس حوالے سے تہذیب نسواں کی خواتین کے افکار ذیل کی سطور میں پیش کیے گئے ہیں:

۱۔۴۔ خلع کا حق:

ہندوستانی روایات کی پاسداری میں جب عورت کو اس کے خلع کے حق سے محروم کیا گیا تو مذہبی پیشوا اور قانون ساز اداروں نے بھی قرآن و حدیث کے احکامات سے تجاوز کیا۔ اس لیے ضروری تھا کہ عورتوں کو ان کے شرعی حقوق سے متعارف کروا کے ان کی زندگیوں کو آسان بنایا جائے۔ عورت کو اس کے حق سے محروم رکھنا سراسر زیادتی ہے۔ مسز نذیر حسین خواتین کو دیے گئے خلع کے شرعی حق کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ "اسلام نے جیسے مرد کو طلاق کا حق دیا ہے ویسے ہی عورت کو خلع کا حق بخشا کیوں کہ اسلام کسی پر ناواجب ظلم روا نہیں رکھتا۔"[۲۷]

و۔ا نے ہندوستانی خواتین کی حالت زار کا قصوروار مذہبی پیشواؤں اور قانون ساز اداروں کو ٹھہرایا۔ جنھوں نے مرد کو تو اس کے حق سے محروم نہ کیا لیکن عورت کی زندگی نام نہاد معاشرتی اصولوں کی پاسداری میں مشکل بنا دی۔ سماجی ڈھانچے کی غیر مساوی ترتیب کو موضوع بناتے ہوئے وہ لکھتی ہیں کہ:

> ججوں کو کوئی اختیار نہیں کہ وہ احادیث نبوی سے تمسک کریں۔ جو پرانے مولوی کہہ گئے ہیں۔ وہ حدیث کے حوالوں سے زیادہ مستند ہے۔ اسی وجہ سے خلع کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ اور طلاق محض اس حالت میں ممکن ہے۔ کہ کوئی شخص خود اپنی بیوی سے بیزار ہو کر اسے دے دے۔ ورنہ کتنی ہی زندہ در گور لڑکیاں ہیں جو طلاق کی دعائیں مانگ رہی ہیں۔۔۔۔ قانون سے انھیں کوئی امداد نہیں ملتی۔ صرف ایک صورت یہ بتائی جاتی ہے کہ اپنا مذہب تبدیل کر کے وہ ظالم شوہر کی قید سے چھوٹیں۔۔۔۔"[۲۸]

ظفر جہاں بیگم نے بھی ہندوستانی معاشرے میں عورت کو درپیش مسائل میں سے ایک مسئلہ خلع کا حق نہ ہونا بیان کیا ہے۔ ان کے مطابق ہندوستانی مرد عورت کو خلع کا حق اس لیے بھی نہیں دینا چاہتے کہ اگر ایسا ہوا تو عورت ان کے پنجہ استبداد سے نکل کر آزاد اور بے باک ہو جائیں گی۔ وہ اپنی خود غرضی میں اس حد درجہ آگے بڑھ چکے ہیں کہ نا صرف عورت کے شرعی حق کی حق تلفی کرتے ہیں بل کہ اس حقیقت سے بھی آنکھیں چراتے ہیں کہ عورت کو خدا نے فطرتاً باوفا اور محبت کرنے والی بنایا ہے۔ اگر وہ اپنی پر آجائے تو جان تک کی بازی لگا دینے کو تیار ہو جاتی ہے لیکن شرط صرف محبت اور اخلاص ہے۔ انھوں نے ہندوستانی مرد کو عورت کی سرشت سے متعارف کرواتے ہوئے یہ باور کروانے کی کوشش کی ہے کہ اگر عورت مرد سے محبت کر بیٹھے تو اس کی خاطر تمام مصائب کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو جاتی ہے۔ وہ کسی بھی مصیبت میں اسے تنہا چھوڑنے کی روادار نہیں ہوتی بل کہ اس میں خدا نے یہ صلاحیت بھی رکھی ہے کہ مرد کی مشکلات کو اپنے اوپر جھیل جانے کی جرات کر جاتی ہے۔ خلع کے متعلق مردوں کے خدشات بیان کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

> ۔۔۔۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر ایسا حکم ہوا اور عورتوں کو یہ حق ملا تو سب کی سب ہمارے قبضے سے باہر ہو گئیں۔۔۔۔ بدنصیبی سے عام رائے یہی ہے کہ خلع کے حقوق پاتے ہی عورتیں ان کے اختیار سے باہر ہو جائیں گی۔ یہ عذر ہمارے سامنے بارہا بیان کیا گیا اور ہمیں قسمیں دلائی گئیں کہ اس مسئلے کو نہ چھیڑو۔۔۔۔ عورتیں پاک دامن اور شوہروں کی وفادار رہتی ہیں۔ تو آپ کو خلع کے مسئلے سے کیا خوف ہو سکتا ہے؟ جو عورت شوہر کی وفادار ہے وہ مر جانے پر بھی ساتھ نہ چھوڑے گی۔ عورت کی فطرت یہ ہے کہ جس کی ہو کے رہے اس کے ساتھ زندگی نباہ دے گی۔ گھر وں کی پال دامنیں تو ہیں ہی۔ ایک بازاری عورت کی بھی یہی خواہش رہتی ہے کہ کوئی نبھانے والا مرد ملے تو اس سے وابستہ ہو کے بیٹھ رہیں۔ پھر آپ کو کس بات کا اندیشہ ہے جو عورتوں کو ان کے خدا کے دیے ہوئے حقوق سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔"[۲۹]

ان مصنفین نے مردوں کو مخاطب کرتے ہوئے اس بات کی یقین دہانی کروائی کہ اگر وہ اس ڈر سے خواتین

کی حق تلفی کر رہے ہیں کہ وہ ان کے قبضے سے باہر ہو جائیں گی تو یہ سراسر غلط ہے۔ عورت کی فطرت میں وفاداری شامل کی گئی ہے۔ وہ کبھی بھی ناجائز مطالبہ نہیں کرتی۔ گھریلو عورت تو ہر حال میں اپنا گھر بچانے کی کوشش کرتی ہی ہے۔ بدنام زمانہ بازاری عورت کی بھی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی آبرو کی حفاظت کرنے والا اور اس کا ساتھ دینے والا کوئی شخص ملے تو وہ بھی اپنی زندگی بہتر بنالے۔ اس لیے مرد کو اپنے خدشات مد نظر رکھتے ہوئے عورت کو اس کے حق سے محروم نہیں کرنا چاہیے۔

ہندوستانی سماج میں طلاق یافتہ عورت کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اور اسی وجہ سے بہت سی خواتین ایسے انسان کے ساتھ گزارا کرنے پر مجبور ہیں جن کے ساتھ ان کی بالکل نہیں بنتی۔ شاہزادہ جہاں بیگم اس معاشرتی خرابی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:

> مرد کو کسی قسم کی ضد نہ کرنا چاہیے۔ عورت کو طلاق دے کر آزاد کر دینا چاہیے۔ رواج کی پابندی شرع کے مقابلے میں نہ کرنا چاہیے۔ یہ خیال کرنا کہ طلاق دینے سے یا دلوانے یا لینے سے خاندان کی بدنامی ہوتی ہے۔ بالکل غلط ہے۔ شرع میں شرم نہ کرنا چاہیے۔ بہت عورتیں بھی طلاق لینے پر محض رواج کی وجہ سے راضی نہیں ہوتی ہیں۔ اور اپنی زندگی محض رواج کی وجہ سے خراب کر لیتی ہیں۔ یہ جہالت ہے۔۔۔۔[۳۰]

شادی کے بعد عورت کو درپیش مسائل میں سے ایک مسئلہ ذہنی ہم آہنگی کا فقدان ہے۔ اس لیے خواتین کو کسی بھی صورت مجبور نہیں کیا جانا چاہیے کہ وہ ایک ایسے انسان کے ساتھ نبھا کریں جس سے اس کی ذہنی ہم آہنگی نا ہو۔ اول تو اس حوالے سے شادی سے پہلے چھان بین کر لینی چاہیے کہ مرد و عورت ایک ساتھ زندگی گزارنے کے قابل ہیں بھی یا نہیں، لیکن پھر بھی کسی مسئلے کی وجہ سے ان دونوں میں نا بن پا رہی ہو تو ان کے لیے اس رشتے سے آزاد ہو جانا ہی بہتر ہے۔[۳۱] ظفر جہاں بیگم نے اپنے مضامین "خلع"[۳۲] اور "خلع کا رواج ہونا چاہیے"[۳۳] میں ہندوستانی مسلمان خواتین کی حالتِ زار کو سمجھتے ہوئے اس کی بہتری کے لیے معلومات فراہم کی ہیں تاکہ وہ شعور حاصل کر کے اپنی حالت درست کرنے پر توجہ دے سکے۔

۲.۴۔ فسخ نکاح:

باہمی ناچاقی کی صورت میں اسلام نے عورت کو خلع کا حق دیا ہے، جس میں مرد اپنی رضامندی سے اسے اس رشتے سے آزاد کر دیتا ہے۔ خلع کی صورت میں مرد کی رضامندی ضروری ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر مرد خلع دینے کے لیے رضامند نہ ہو اور عورت اس سے آزاد ہونا چاہے تو قانون میں عورت کے لیے یہ گنجائش موجود ہے کہ وہ عدالت سے رجوع کر کے فسخ نکاح کر لے۔ فسخ نکاح کی صورت میں عورت قانونی امداد لے کر رشتہ ازدواج سے آزاد ہو جاتی

ہے۔ لیکن ہندوستانی معاشرے میں باقی حقوق کی طرح اسے اس حق سے بھی یکسر محروم رکھا گیا۔ اسے سلسلے میں تہذیب نسواں کی مصنفین نے عورتوں کو فسخ نکاح کے قانون سے متعارف کروایا تاکہ وہ اپنی زندگی کو بہتر طریقے سے بسر کرسکیں۔ اس سلسلے میں سلطانہ آصف فیضی یوں رقمطراز ہیں:

> خلع کے معنی عام طور پر ظاہر ہیں کہ جب مرد اور عورت باہم سمجھوتے سے کسی قاضی کے سامنے جاکے اپنے نکاح کو ختم کردیں تو اسے خلع کہیں گے۔ مگر خلع اسی وقت ہوسکتا ہے جب مرد خوشی سے فسخ نکاح پر راضی ہو۔ اگر وہ خوشی سے راضی نہ ہو اتو پھر خلع یا طلاق ناممکن ہے۔ اور یہاں تو اس جھگڑے کو چکانا ہے کہ اگر مرد طلاق دینے پر راضی نہ ہو اور عورت آزادی چاہتی ہے تو پھر چھٹکارے کی کیا صورت ہے؟ اور اس مشکل کو حل کرنے کے لیے اسلام میں عورت کو بھی "حق طلاق تفویض" حاصل ہے۔ [۳۴]

جمیلہ بیگم نے بھی اپنی تحریروں میں قانون تنسیخ نکاح کی حمایت کی اور اسے ہندوستانی معاشرے میں لاگو کرنے کی سفارش بھی کی۔ انھوں نے اپنے مضمون "مسودہ مسلم قانون فسخ نکاح: تمام اسلامی انجمنوں سے تائید کی درخواست" میں اس کے حوالے سے گزارشات پیش کی ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں ان مسائل کا تذکرہ کیا ہے جن کی بنیاد پر قانونی طور پر عورت کو تنسیخ نکاح حق دیا ہے۔ اس میں وہ حنفی پیروکاروں کی خواتین کے حوالے سے بتاتی ہیں کہ انھیں قانون کی رو سے تنسیخ نکاح کی اجازت ہے۔ ان کے مطابق منکوحہ حنفی عورت مندرجہ ذیل وجوہ میں سے کسی ایک وجہ کی بنا پر اپنے شوہر کے خلاف تنسیخ نکاح کا دعویٰ کرسکتی ہے:

۱۔ یہ کہ اس کا شوہر غائب اور مفقود الخبر ہے۔
۲۔ یہ کہ اس کا شوہر عنین ہے۔
۳۔ یہ کہ اس کا شوہر خطرناک جنون میں مبتلا ہے۔
۴۔ یہ کہ اس کا شوہر اس کا نفقہ ادا کرنے میں غفلت کرتا ہے۔
۵۔ یہ کہ اس کا شوہر اس کے ساتھ ہمیشہ بدسلوکی کرتا ہے۔
۶۔ کسی اور وجہ کی بنا پر کو شریعت اسلام کے مذہب حنفی یا مذہب مالکی کی رو سے فسخ نکاح کے لیے کافی ہو۔
۷۔ منکوحہ مسلمان عورت کا دین اسلام کے سوا کسی دین کو قبول کرلینا بجائے خود اس کے نکاح کے فسخ کا اثر نہ رکھے گا۔ [۳۵]

جمیلہ بیگم نے اپنے ایک اور مضمون "تنسیخ نکاح ایکٹ" [۳۶] میں مسلمان وکلا کو طلاق فنڈ کے نام سے ایک فنڈ قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔ انھوں نے ایک ایسی کمیٹی بنانے کی اہمیت پر بھی زور دیا جو ہندوستان کی پریشان حال

اور مصیبت زدہ عورتوں کی تکلیف کو سن کر اسے دور کرنے کی کوشش کرے۔ انھوں نے ایسے اجلاد منعقد کرنے کی تجویز بھی دی جن میں عورتوں کو تنسیخ نکاح کے قوانین سے متعارف کروایا جا سکے۔

تنسیخ نکاح کے قانون کی حمایت کی ایک اور مثال یوں ملتی ہے "۔۔۔۔ تفویض طلاق بوقت نکاح کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ یعنی یہ کہ نکاح کے وقت لڑکی کو یہ اختیار دے دیا جائے کہ فلاں حالات کے پیش آنے پر وہ اپنے نکاح کو تنسیخ کر سکتی ہے۔ یہ طریق اختیار کرنا ہو تو ایک دستاویز جس کا نام ""کابین نامہ" ہے۔ نکاح کے وقت تحریری کر دیا جائے۔ جس میں عورت کو یہ اختیار دیا جائے کہ فلاں صورتوں میں وہ قاضی کو درمیان میں ڈالے بغیر نکاح تنسیخ کر سکتی ہے۔"[۳۷]

ب۔ج نے اپنے مضمون "ہماری مفلسی کی وجہ"[۳۸] میں ہندوستانی معاشرے کی عدم مساوات کو موضوع بنایا اور طلاق اور فسخ نکاح کے حوالے سے عورتوں کے حقوق کی حمایت کی۔ ان کے مطابق شریعت اسلامی عورت کو ان حقوق سے محروم نہیں رکھتی تو معاشرے یا سماجی اجارہ داروں کو اس کا استحقاق کیسے حاصل ہو گیا کہ وہ اسلامی احکامات کی حکم عدولی کریں۔

زبیدہ زریں نے "تعدد ازدواج اور فسخ نکاح" میں ہندوؤں کے قانون ساز اداروں کی جرات کو سراہا ہے اور ڈاکٹر دیسمکھ کے مسودہ فسخ نکاح کی چند شکوں کو بطور مثال پیش کیا ہے جن میں ہندو عورتوں کو یہ آزادی دی گئی ہے کہ اگر انھیں ان کے شوہر ان کے حقوق کو پورا نہیں کر رہے تو وہ ان سے علیحدگی اختیار کر سکتی ہیں۔ اس مسودے میں جن وجوہات کی بنا پر عورت طلاق لینے کی مجاز قرار پائی ان میں درج ذیل شامل ہیں:

۱۔ اگر اس کا خاوند بعد شادی کسی خبیث اور لاعلاج مرض میں مبتلا ہو جائے۔

۲۔ اگر اس کا خاوند اپنا مذہب تبدیل کر لے۔

۳۔ اگر اس کا خاوند پہلی شادی کے قائم ہوتے ہوئے بھی دوسری شادی کر لے۔[۳۹]

اس مضمون میں زبیدہ زریں نے مسلم علمائے کرام اور قانون ساز اداروں سے اپیل کی ہے کہ مسلمان خواتین کی فلاح وبقا اور بہتر زندگی کے لیے ایسے قوانین کا نفاذ کیا جائے تا کہ وہ بھی زبردستی کے بندھن سے چھٹکارا پا سکیں۔ اسلام نے تو عورت کو خلع کا حق دیا ہے لیکن سماجی اجارہ داروں کی زور آوری اور قانون ساز اداروں کی نااہلی کی بنیاد پر مسلم خواتین مشکل میں ہیں۔ انھوں نے ان اداروں کو یہ باور کروانے کی سعی کی ہے کہ وہ مسلم خواتین کے شرعی حقوق کا تحفظ کریں اور اپنی ذمہ داری پوری کریں۔

تہذیب نسواں میں لکھنے والی خواتین نے ہندوستانی نظام میں موجودہ مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔ جس میں طلاق اور تنسیخ نکاح کی ضمن میں یہ باور کروایا گیا ہے کہ ہندوستانی معاشرے میں شرع محمدی لاگو نہیں ہے۔ یہاں

عورت کو شریعت کے اعتبار سے طلاق کا حق نہیں دیا گیا اور وہ باجود بے شمار مسائل کے ایسے شخص کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور ہے جس کے ساتھ پل کا گزارنا مشکل ہو۔ انھوں نے اس حوالے سے سماجی اجارہ داروں کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے جن کی وجہ سے انسانی زندگی اس قدر کٹھن ہوتی چلی جا رہی ہے۔

۵۔ تعدد ازدواج:

ہندوستانی معاشرے میں مرد کی ایک سے زائد شادی ایک عام تصور تھا۔ مرد نے ایک سے زیادہ شادیوں کو اپنا حق سمجھتے ہوئے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور چوں کہ اسلام میں بھی مرد کو چار شادیاں کرنے کی اجازت دی گئی ہے اس لیے مسلمانوں کے ہاں بھی یہ تصور عام تھا کہ سنت کی ادائیگی کے لیے ایک سے زائد شادی ضروری ہے اور بعض مرد شادی کے بعد اپنے فرائض سے روگردانی کیا کرتے تھے۔ اسلام نے جہاں مرد کو چار شادیاں کرنے کی اجازت دی ہے وہاں اس کے لیے کچھ قوانین و ضوابط بھی ترتیب دیے ہیں تا کہ رشتہ ازدواج بخوبی نبھایا جا سکے اور زوجین ایک دوسرے کے حقوق اچھے طریقے سے ادا کر سکیں۔ لیکن اس حکم کے دوسرے رخ یعنی ذمہ کی طرف مرد حضرات کی توجہ برقرار نہ رہ سکی اور وہ محض سنت پر عمل کرنے کی خاطر عقد پر عقد کرتے چلے جا رہے تھے۔ جس سے نجی زندگی بھی متاثر ہوئی پہلے سے موجود اولادوں اور بیویوں کے حقوق کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دی گئی۔ جبکہ قرآن میں اس بارے میں واضح تاکید کی گئی ہے کہ:

> ۔۔۔اور اگر تم کو اس بات کا خوف ہو کہ یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو ان کے سوا جو عورتیں تم کو پسند ہوں دو دو یا تین تین یا چار چار ان سے نکاح کر لو اور اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ (سب عورتوں سے) یکساں سلوک نہ کر سکو گے تو ایک عورت (کافی ہے) ۔۔۔(۴:۳)[۳۰]

لیکن قرآنی احکامات پر مکمل طور پر عمل درآمد کی بجائے اپنی پسند کے احکامات کو ضروری سمجھتے ہوئے ان پر عمل کیا گیا اور اپنے فرائض کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا۔ اس مسئلے کے مناسب حل کے لیے تہذیب نسواں کی مصنفین نے مرد کے فرائض اور ذمہ داریوں کو بھی جتلایا اور مردوں کو اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کی تاکید بھی کی۔

جمیلہ بیگم نے اپنی تحریروں میں تعدد ازدواج کے بڑھتے ہوئے رجحان اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کے حوالے سے اپنے افکار کا اظہار کیا۔ ان کے مطابق ہندوستانی معاشرے میں مرد نے اسلام کے اس پہلو پر تو غور کیا کہ اسے چار شادیاں کرنے کا حق ہے لیکن مساوات کا عنصر حذف کر دیا جس سے گوناگوں مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس سے معاشرے پر ایک برا اثر پڑتا ہے۔ وہ اسلامی تعلیمات پر عدم توجہی کے نتائج بیان کرتی ہیں اور تعدد ازدواج کی مذمت کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> جہاں ایک سے زیادہ بیوی اور پھر متفرق اولادیں ہوئیں وہاں حسد اور خانہ جنگیاں معاشرت کو تباہ کرنے میں معاون ہوں گی۔ ایک دوسرے کی برائی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جائے گی۔ عموماً شوہر کا رجحان ایک طرف ہی ہوتا ہے۔ دوسری بیوی اور اس کے بے گناہ بچوں کی تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کی کوئی تدبیر نہیں کی جاتی۔ اور یہ عام طور پر بے یار و مددگار چھوڑ دیے جاتے ہیں۔[۴۱]

ان مصنفین نے تعدد ازدواج کے زمرے میں ان بچوں کا تذکرہ بھی کیا جو والدین کی عدم توجہ سے معاشرے کا بہتر فرد نہیں بن سکتے اور ایک بوجھ کی مانند لدے رہتے ہیں۔ شادی کا مقصد محض افزائش نسل نہیں ہے بل کہ اولاد کی مناسب تعلیم و تربیت بھی ہے۔ اگر اولاد کی بہتر تربیت نہ کی جائے تو وہ بعد ازاں معاشرتی بگاڑ کی ایک بڑی وجہ بن جاتی ہے۔

تہذیب نسواں کی مصنفین نے ان مردوں کو تنقید کا نشانہ بنایا جو محض کثرت ازدواج کے شوق میں مبتلا تھے۔ اور اپنے بیوی بچوں کو دوسروں کے سپرد کر کے اپنی زندگی گزارنے میں مگن تھے۔ ان خواتین نے کثرت ازدواج کی مذمت نہیں کی بل کہ مساوات اور اعتدال قائم رکھنے کی تلقین کی ہے۔ آذری بیگم اس حوالے سے اپنے مضمون "کثرت ازدواج" میں لکھتی ہیں:

> معمولی حیثیت کے آدمیوں کے ہاں جن کی ماہوار آمدنی صرف تیس یا پچیس روپے ہوتی ہے۔ دو دو تین تین بیویاں ہیں۔۔۔۔ پھر یہ نہیں کہ ان سے عدل کیا جائے۔ یا نان نفقہ کا کوئی خاص انتظام ہو۔ کوئی میکے میں بیٹھی ہے۔ تو کوئی سلائی وغیرہ سے اپنا گزر اوقات کرتی ہے۔ پہلی بیوی تو عام طور پر ساس سسر کے پاس چھوڑ دی جاتی ہے۔۔۔۔[۴۲]

مشرقی معاشرے کا ایک مسئلہ یہ بھی رہا ہے کہ ہمیشہ ہر قربانی اور ہر فرض عورت کی ذات سے منسوب کیا گیا ہے جس وجہ سے ان کے حقوق کی بابت کبھی کسی کی آواز بلند نہ ہوئی اور یہ سمجھ لیا گیا کہ یہ طبقہ شاید پیدا ہی مرد کے حکم کی بجا آوری اور تابعداری کے لیے کیا گیا ہے۔ تہذیب نسواں کی خواتین مصنفین نے بھی اس حوالے سے اپنے افکار کا اظہار کیا۔ جس میں صغرا ہمایوں مرزا کی آواز ایک توانا آواز کے طور پر ابھری۔ انھوں نے ہندوستانی مردوں کو ان کے فرائض سے متعارف کروایا اور یہ باور کروایا کہ ان کی بیویوں کے حوالے سے بھی کچھ فرائض ہیں۔ صغرا ہمایوں نے اسلام کے مطابق زندگی کے بسر ان کی اہمیت کو ابھارا۔ ان کے مطابق "اکثر مرد ایک سے زائد شادیاں کر لیتے ہیں۔ پھر اسلام کی بتائی ہوئی راہ یعنی عدل پر قائم نہیں رہتے۔۔۔۔ اکثر ایسے فرائض ہیں جو بظاہر نہایت معمولی نظر آتے ہیں لیکن دراصل ازدواجی مسرت کا دارومدار انہی پر ہے۔"[۴۳]

"جہاں معاشرتی زندگی میں اسلام نے عورت کو کئی اور حقوق دیے ہیں۔ وہاں تعدد ازدواج کی بھی تحدید کر دی۔ یعنی جو مرد سیکڑوں عورتوں سے شادی کیا کرتے تھے۔ وہاں انھیں صرف چار شادیاں کرنے پر مجبور کیا۔ اور اس طرح کہ "تم دو، تین اور چار عورتوں سے شادی کر سکتے ہو۔ بشر طیکہ تم ان سے مساوی سلوک قائم کر سکو اور اگر انصاف نہ کر سکو تو صرف ایک پر اکتفا کرو" مگر مسلمانوں نے اسلامی قوانین کو پس پشت ڈال دیا۔ اور ملاؤں نے جلب منفعت کی خاطر اسلام میں وہ رخنہ اندازیاں کیں کہ اسلام بظاہر ایک مضحکہ خیز مذہب بن گیا۔ ملاؤں کے من گھڑت مسئلوں سے مسلمانوں کی وہ تذلیل ہوئی کہ اس کا احاطہ تحریر میں لانا ناممکن ہے۔"[۴۴]

شاہزادجہاں بیگم نے بھی اسی مسئلے کے حوالے سے اپنے نظریات کا اظہار اپنے مضمون "ہماری مفلسی کی وجہ"[۴۵] میں کیا۔ انھوں نے نکاح پر نکاح کو ایک مرض قرار دیا۔ جس کا شکار اس دور کے مرد تھے۔ انھوں نے ان لوگوں کو ہدف تنقید بنایا جنھیں اولاد کی پرورش اور تربیت سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ ان کے نزدیک مردوں نے نکاح کو اسلامی حکم کے طور پر ایسا مانا کہ بس اسی حکم کی تعمیل میں سرگرداں ہو گئے جب کہ اس سے متعلق دیگر فرائض سے سراسر سبکدوش ہو گئے۔ یہ حضرات نا صرف اس حکم کی تعمیل میں کوشاں رہے بل کہ انھوں نے اسے شریعت کا لازمی جزو گردانا اور عورتوں کو اس کی بدولت مزید محکوم و مسدور کر دیا۔

ہندوستان میں تعدد ازدواج کی بڑھتی ہوئی شرح اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کے حل کے لیے زبیدہ زریں نے اپنے مضمون "تعدد ازدواج اور فسخ نکاح"[۴۶] میں مسلم مفکرین اور علمادین سے اپیل کی ہے کہ خواتین کی ازدواجی زندگی میں بہتری لانے کے لیے کوئی ایسا بل پاس کروائیں جن سے ان کے شوہر انھیں دوسری شادی کے نام پر ڈرانے دھمکانے کی بجائے ان کی ضروریات کو بہتر طور پر پورا کرنے کے پابند ہوں۔ ان کے مطابق ہندوستانی مرد کئی کئی شادیاں کر کے پہلے سے موجود بیوی اور بچوں کے فرائض سے یکسر آزاد ہو جاتے ہیں۔ ایسے مرد شریعت کی مشروط آزادی کا غلط فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنی بیویوں کے حقوق کو غصب کرتے ہیں جس سے وہ بے کسی کے عالم میں زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ انھوں نے قانون ساز اداروں کو تجویز دی کہ ایسے قوانین کا نفاذ کیا جائے کہ مرد انھیں مان لیں اور عورتوں کے حقوق کا تحفظ ہو سکے۔ انھی خیالات کی مزید وضاحت زبیدہ زریں کے مضمون "تعدد ازدواج"[۴۷]، ام کلثوم کے مضمون قصوروار کون "[۴۸] اور ثریا پروین کے مضمون "قصوروار کون"[۴۹] میں کی گئی ہے۔

۷۔ تربیت اطفال:

ازدواجی زندگی میں بچے کی پیدائش اور اس کی تربیت اہم مراحل ہیں۔ سماجی ترقی میں جہاں جسمانی طور پر

مضبوط اور قوی افراد کی اہمیت مسلم ہے۔ وہیں ذہنی طور پر مضبوط افراد بھی معاشرے کو ترقی کی راہ پر لے جانے میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس لیے والدین پر یہ بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کو معاشرے کے لیے با عمل بنائیں بچوں کی پرورش اور تربیت ایسے خطوط پر کریں کہ ان میں احساس ذمہ داری اور قومی و ملی جذبہ موجود ہو۔ وہ کائنات کو تسخیر کرنے کا ولولہ، ہمت اور استقامت رکھتے ہوں۔ ایسا تب ہی ممکن ہے جب ان کی تربیت اچھے انداز میں کی جائے وہ ذہنی طور پر توانا ہوں۔ اگر تربیت میں کوئی جھول رہ جائے تو اس کا خمیازہ محض ایک فرد یا ایک خاندان کو نہیں بھگتنا پڑتا بل کہ قوم و ملت اس سے نقصان اٹھاتے ہیں۔

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے تربیت اطفال کے حوالے سے بھی اپنے افکار کی ترسیل کی۔ انھوں نے والدین کو ان کی ذمہ داری کا احساس دلانے کی کوشش کی کہ چھوٹے چھوٹی باتوں اور چھوٹے معاملات میں الجھے نہ رہیں بل کہ اپنی بڑی ذمہ داری کو سمجھتے ہوئے اسے بطریق احسن نبھانے کی کوشش کریں۔ شاہزاد جہاں بیگم نے خواتین کو خاص طور پر تلقین کی کہ وہ اپنے بچوں کی اچھی تربیت کے لیے خود کو جدید دور کی تمام تبدیلیوں سے متعارف کروائیں وہ خود بھی سیکھیں۔ معاشرے اور سماج کی تمام سرگرمیوں میں حصہ لیں تاکہ ماحول کے ساتھ ہم آہنگی اور واقفیت رکھتے ہوئے اپنی اولاد کی اچھی اور بہتر تربیت کر سکیں۔ اگر وہ کسی بھی مسئلے سے ناواقف ہوں گی تو اپنی اولاد کو کیسے اس سے دور رکھ پائیں گی۔ اپنے مضمون میں وہ مشرق و مغرب کے تربیتی نظام کا موازنہ کرتے ہوئے مشرقی ماؤں کو ان کی ناواقفیت کی بنیاد پر کم درجہ قرار دیتی ہیں کیوں کہ یہاں کی عورتیں جدید تقاضوں سے خود ہی آشنا نہیں ہیں اس لیے ان کے بچے بھی اس سے محروم رہتے ہیں۔ ان کے مطابق:

> ہماری بہنیں اعلیٰ سوسائٹی میں شریک نہیں ہو سکتی اور کم علم ہونے کے سبب سے تربیت اطفال میں مغربی قوم سے بہت پیچھے ہیں۔ اسی لیے ہماری قوم عقلی، اخلاقی اور جسمانی تربیت میں نہایت کمزور ہے۔ کمزور قوم ملکی خدمت کرنے میں بھی کمزور ہوتی ہے۔ یہ قصور اس کا نہیں۔ بل کہ اس کے بزرگوں کا ہے۔ بزرگ بچوں کو بہت طرح سے خود ہی بگاڑتے ہیں۔ اگرچہ ان کا مقصد بگاڑنے کا نہیں ہوتا۔۔۔[۵۰]

ان مصنفین نے بچے کی تربیت کے حوالے کی جانے والی عام غلطیوں کو بھی موضوع بنایا۔ ان کے مطابق بچپن میں اگر بچوں کی حوصلہ افزائی کی جائے تو وہ آئندہ زندگی میں اپنے معاملات بہتر طور پر نبھا سکتے ہیں اور انھیں زندگی کے مختلف مقامات پر اپنے لیے فیصلہ لینے میں کسی قسم کی دقعت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ لیکن بعض والدین اپنی ذاتی وجوہات کی بنا پر بچپن ہی میں بچوں سے ان کی خود اعتمادی چھین کر ان کی صلاحیتوں کو دبا دیتے ہیں جس سے وہ احساس کمتری کا شکار ہونے کے ساتھ ساتھ کسی قسم کا فیصلہ لینے سے بھی عاری ہو جاتے ہیں۔ اس لیے والدین کو چاہیے

کہ وہ اپنے آج کی فکر کیے بنا بچوں کے کل کی فکر کریں تا کہ وہ ایک خوددار اور خود اعتماد انسان بن سکیں۔ اے۔ کے مس سید علی حسن نے انہی افکار کی ترسیل اپنے مضمون "بعض والدین کی غلطی "[51] اور مسز علی بھائی نے اپنے مضمون "پرورش اطفال"[52] میں کی ہے۔

شاہزاد جہاں بیگم نے اپنے مضمون "سوال"[53] میں اس امر کی طرف توجہ دلوائی ہے کہ والدین کے رویے بچے کی ذہنی نشوونما میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس لیے والدین پر یہ فرض عائد ہے کہ وہ اپنے رویوں سے ان میں مثبت افکار کو پیدا کرنے کی کوشش کریں اور انھیں دنیاوی معاملات و مسائل پر غور کرنے کے لیے سازگار فضا مہیا کریں۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو بچے کی بہت سی صلاحیتیں دب جائیں گی اور وہ اپنی عملی زندگی میں بھی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر پائیں گے۔ والدین پر یہ فرض عائد ہے کہ وہ بچوں کے سوالات کا درست جواب دے کر ان کے جاننے کے شوق کی آبیاری کریں۔ نہ یہ کہ انھیں ٹوک کر چپ کروادیں۔ اس سے ان کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے اور ان کا واقفیت بڑھانے کا شوق کبھی ترقی نہیں کرتا۔ کوئی ایسی صورت ہو جس میں والدین بھی لاجواب ہو جائیں تو انھیں بچے کو ڈانٹنے ڈپٹنے کی بجائے اپنی معلومات میں اضافہ کرنی کی ضرورت ہے۔ اگر خود یہ نہیں کر پائیں تو کسی اتالیق کا بندوبست کرنا زیادہ مناسب ہے کیوں کہ سوال سے ہی بچے اپنی فکر کا سفر جاری رکھ سکتے ہیں اگر اس مقام پر تشنہ رہ جائیں تو یہ خلا تادمِ آخر برقرار رہتا ہے۔

تہذیبِ نسواں کی مضمون نگار خواتین نے تربیتِ اطفال میں برتی جانے والی عام غلطیوں کی نشان دہی بھی کی ہے جس سے بچے کی شخصیت دباؤ کا شکار ہو جاتی ہے اور وہ عدم تحفظ، ذہنی دباؤ اور احساسِ محرومی جیسے مسائل کا شکار ہو جاتے ہیں اور یہ مسائل تا عمر ان کے ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں کسی نا کسی صورت میں بیٹھے رہتے ہیں بعض بچے بہتر ماحول میسر ہونے پر ان سے نبرد آزما بھی ہو جاتے ہیں لیکن بیشتر انہی مسائل کے ساتھ زندگی بسر کر دیتے ہیں۔ بیگم ایوب احمد خاں نے اپنے مضمون "بچوں کو ڈرانا"[54] میں ایسے ہی ایک مسئلے کا تذکرہ کرتے ہوئے ماؤں کو تنبیہ کی ہے کہ وہ وقتی صورت حال سے نبٹنے کے لیے ایسے ہتھکنڈے نہ اپنائیں کہ ان کا بچہ پوری زندگی اس کے دباؤ میں بسر کر دے۔ اپنے مضمون میں انھوں نے ایسی ماؤں کا تذکرہ کیا ہے جو بچوں کو سمجھانے کی بجائے ڈرا دھمکا کر خاموش یا شرارت سے باز رکھنے کا حربہ اختیار کرتی ہیں۔ اس سے بچہ وقتی طور پر تو ڈر سہم کر بیٹھ جاتا ہے لیکن بعد ازاں تمام عمر اسی کے حصار میں رہتے ہوئے خوفزدہ رہتا ہے اور اپنی بات کہنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس طریقے سے بچپن ہی سے ان کا حق رائے دہی ضبط کر لیا جاتا ہے جو ان کی شخصیت کی تخریب کی ایک بڑی وجہ ہے۔ اس مضمون میں بیگم ایوب احمد خاں نے ماؤں کی تربیت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ اپنے بچوں کا مستقبل کا ایک بہتر فرد بنائیں نہ یہ کہ ان کی خداداد صلاحیتوں کو بھی ختم کرنے کا موجب بنیں۔ اسی ضمن میں اسی عنوان سے

جمیلہ بیگم نے اپنے افکار کا اظہار کیا۔

تربیتِ اطفال کے سلسلے میں بیگم یار محمد خاں نے اپنے نظریات "تربیتِ اطفال"[55] میں پیش کیے۔ ان کے مطابق بچے اپنے گرد و پیش کے ماحول سے بہت سی ایسی چیزیں بھی سیکھ لیتے ہیں جو انھیں باقاعدہ طور پر سمجھائی اور سکھائی نہیں جاتی۔ اس لیے ضروری ہے کہ انھیں ایسا ماحول فراہم کیا جائے جو ان کی شخصیت کی تعمیر کے لیے موزوں ہو۔ جو والدین اپنے بچوں کے سامنے ایک دوسرے سے خوش اسلوبی سے پیش آتے ہیں ان کے بچے بچپن سے ہی باہمی التفات اور محبت سیکھ لیتے ہیں اور اپنی روزمرہ زندگی میں انہی کو برتتے ہیں لیکن دوسری طرف جو والدین باہمی رنجش کا شکار ہوں اور ہر وقت لڑائی جھگڑے میں مصروف رہتے ہیں ان کے بچے ان سے یہی سیکھتے اور اسی کو برتتے ہیں۔ ان کے مطابق بچے پیدائشی نقال ہوتے ہیں اور وہ اپنے ماحول اور گرد و نواح ہونے والی تمام چیزوں کی نقالی اپنی حقیقی زندگی میں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے والدین کو چاہیے کہ بچوں کے سامنے ایسی عمدہ مثال پیش کریں جو ان کی عملی زندگی میں مفید ثابت ہو سکے۔ اس ضمن میں لکھے گئے دیگر مضامین میں درج ذیل شامل ہیں:

مضمون نگار	مضمون کا عنوان
شاہزادہ جہاں بیگم	بچوں کے اتالیق اور نگران[56]
ایضاً	کچھ بچوں کی بابت[57]
ایضاً	بچوں کے متعلق کچھ اور[58]
جمیلہ بیگم	بچوں کو ڈرانا[59]
ایضاً	بچوں کو ساتھ سلانا[60]
ایضاً	بچوں کی نگرانی[61]
گلیڈس سلمہ	بچے کی تربیت[62]
ایضاً	بچے کی تربیت[63]
مسز ایم ایف	بچوں کی تعلیم و تربیت[64]
حسن بلقیس محمد بیگم	بچوں کی تربیت[65]
رونق جہاں بیگم	بچہ[66]
شیلا	بچے کی ضد[67]

ایضاً	بچے کی حفاظت [68]
حجاب امتیاز علی	عورت بحیثیت ماں کے [69]
ب۔ن	والدین کا اثر بچوں پر" [70]

۱.۶۔ بچے کی پیدائش سے متعلق سماجی مسائل:

اسلام میں مرد کو نان و نفقہ اور عورت کو تربیت اولاد کے فرائض سونپے گئے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہر گز نہیں تھا کہ مرد اکیلی عورت پر بچے کی پرورش اور تربیت کی تمام تر ذمہ داری ڈال کر اس فرض سے سبکدوش ہو جائے۔ گھریلو نظام مرد اور عورت کی باہمی مشاورت اور مفاہمت سے ہی بہتر ہوتا ہے۔ اگر مرد اس حوالے سے رو گردانی برتے گا تو گھریلو ماحول کی خرابی کے ساتھ ساتھ بچوں پر بھی اس کا اثر پڑے گا۔

ہندوستانی معاشرے میں ایسے مرد بکثرت موجود تھے جو بچوں کی پرورش اور تربیت کو محض عورت کی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ اور اس بات سے بالکل بے خبر رہتے ہیں کہ بچہ پیدا کرنا اور اس کی نشو و نما کرنا ایک مشکل امر ہے اس لیے اس کام کو اگر دونوں مل جل کر سر انجام دیں تو ماں بھی صحت مند رہے گی۔ اور اولاد کی تربیت بھی بہتر نقوش پر ہو پائے گی۔ ماں جہاں بچے کو بنیادی اخلاقیات سکھانے کی مجاز ہے وہیں باپ انھیں سماجی زندگی کو بہتر بنانے کی تربیت دے سکتا ہے اور اس کے اتار چڑھاؤ سے متعارف کروا سکتا ہے تاکہ وہ بطور ایک شہری بھی اپنی ذمہ داریاں اچھے طریقے سے نبھا سکیں۔

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے کثرت اولاد کے سلسلے میں بھی اپنے افکار پیش کیے۔ وہ خواتین میں یہ شعور پیدا کرنا چاہتی تھیں کہ اولاد کی تعداد سے زیادہ اس کی تربیت ضروری ہے۔ اگر بہت سے بچے ہوں تو ماں باپ دونوں مل کر بھی ان کی بہتر پرورش نہ کر سکیں گے۔ اسی لیے ضروری ہے کہ اس مسئلے پر غور کیا جائے۔ مسز رضا اس حوالے سے اپنے مضمون "قلت اور کثرت اولاد" میں یوں رقمطراز ہیں:

> ۔۔۔۔ اگرچہ بقائے نسل انسان کے لیے ضروری ہے۔ کہ اولاد ہو۔ مگر قلت اولاد بہتر ہے۔ تاکہ جتنے آدمی ہوں۔ وہ تندرست خوش۔ ہوشیار اور پڑھے لکھے ہوں۔ جو دوسروں کی ہمدردی و امداد کر سکیں۔ نہ کہ ایسے جو کہ خود دوسروں پر بار ہوں۔ [71]

تہذیبِ نسواں کی مضمون نگار خواتین نے ہندوستانی مستورات کو اس حوالے سے تربیت دی کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر زیادہ توجہ دیں اور ان کے بہتر مستقبل کی خاطر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کی بجائے اپنے عمل سے ثابت کریں کہ وہ ایک بہترین ماں ہیں۔

۶.۲۔بچے کی پیدائش کے وقت نوکری پیشہ خواتین کے مسائل:

عورتیں جہاں اور بہت سے مسائل سے دوچار تھیں وہاں ایک مسئلہ بچے کی پیدائش کے وقت اس کی نوکری کا تحفظ بھی تھا۔ کیوں کہ ایسی خواتین بڑی تعداد میں موجود تھیں جنھیں بچے کی پیدائش کے وقت نوکریوں سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ یہ مسئلہ مشرق و مغرب دونوں تہذیبوں میں پایا جاتا تھا۔ مغرب میں عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے حوالے سے عورتوں کی نوکری کے تحفظ کی تحریک چلائی گئی تا کہ انھیں اس سے محروم نہ کیا جائے۔ نا صرف نوکریوں کے تحفظ بل کہ کام کرنے کی جگہ کے معاملات اور مناسب اجرت کے معاملے پر بھی غور کیا گیا۔ اور عورت کو یہ حق دلوایا گیا کہ بچے کی پیدائش کے وقت اس کی نوکری کو مستقل ختم کر دینے کی بجائے اسے مہلت دی جائے۔

تہذیب نسواں کی مصنفین بھی اس بات کا ادراک رکھتی تھیں۔ انھوں ہندوستانی عورتوں میں بھی یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ا۔ج بیگم اس حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

> ۔۔۔نئے ضوابط میں سٹالن نے کام کرنے والی عورتوں کے ساتھ یہ رعایت کی ہے کہ بچوں کی پیدائش کے ایک ماہ قبل اور ایک ماہ بعد تک ان سے کسی قسم کی محنت نہ لی جائے۔ اس دو ماہ کی مدت تک ان کو وہی اجرت ملتی ہے۔ جو کام کرنے کے زمانے میں دی جاتی ہے۔۔۔"[۴۲]

نو آبادیاتی ہندوستان میں خواتین گھر گرہستی، تربیتِ اولاد اور خانہ داری میں ایسی الجھی ہوئی تھی کہ انھوں نے اپنی اقتصادی زندگی کی طرف بالکل توجہ نہ دی۔ اس دور میں ایسا ہونا بھی ممکن نہیں تھا کیوں کہ اس وقت انھیں اپنے نجی اور خانگی معاملات کو درست کرنے میں کافی دقعت کا سامنا تھا۔ وہ شعور و آگہی نہ ہونے کی وجہ سے بھی متعدد مسائل کا شکار تھی۔ اس لیے ضروری تھا کہ پہلے انھیں اپنی ذات سے متعلق مسائل کے حل اور ان کے بنیادی انسانی حقوق سے متعارف کروایا جائے تا کہ وہ ان سے نبرد آزما ہو کر زندگی کو بہتر طریقے سے بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔ دوسرا ہندوستان میں پردے کی اس قدر سختی تھی کہ انھیں اپنی ہم جنس خواتین سے بھی آزادانہ میل جول بڑھانے کی اجازت نہ تھی۔ اس صورت میں اقتصادی اور معاشی بحالی اس کے بعد کا عمل تھا اس دور میں ایسی خواتین تعداد میں بہت کم تھیں بل کہ نہ ہونے کے برابر تھیں جو نوکری یا کسی پیشے سے منسلک تھیں۔ اس لیے تہذیبِ نسواں میں اس حوالے سے زیادہ معلومات نہیں ملتی۔

۷۔بیوہ کے لیے بنائے گئے اصول:

اسلام ایک مکمل طرز حیات ہے۔ جس میں انسان کے حقوق کو خاص طور پر اہمیت دی گئی ہے۔ تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اسلام میں عورت کے لیے حقوق متعین نہ کیے گئے ہوں۔ لیکن ہندوستان کے سماجی ڈھانچے میں اس کی

گنجائش کم رکھی گئی۔ عورتوں کے معاملے میں ہندوستانی معاشرے میں کچھ زیادہ اچھی صورت حال دکھائی نہیں دیتی۔ یہاں کہیں مذہب کے نام پر تو کہیں عزت کے نام پر عورت کا استحصال جاری رہا۔ اسے اس کے بنیادی حقوق سے ہمیشہ محروم رکھا گیا۔

اسی طرح کا ایک معاملہ بیوہ کا عقد ثانی ہے۔ اسلام میں عورت کو شوہر کے انتقال پر خاص مدت کے بعد دوسری شادی کرنے کا حق حاصل ہے لیکن ہندوستانی نظام پر نظر دوڑائی جائے تو ہمیں بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں جنھیں جبراً دوسری شادی نہ کرنے کا فیصلہ سنایا گیا۔ اس سے کہیں باپ بھائیوں کی عزت پے حرف آتا ہے تو کہیں عورت کے کردار سے متعلق تشویش کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مسلمان ایک عرصے تک ہندوؤں کے ساتھ ایک مشترکہ تہذیب کی صورت رہے اور ہندوؤں کے مذہب میں اس بات کی اجازت نہیں تھی کہ عورت کے شوہر کی وفات کے بعد اس کی دوسری شادی کروادی جائے بل وہاں تو ستی کی شکل میں عورت کو زندہ جلادینے کا دستور نافذ تھا۔ اور اس کی سختی سے پابندی بھی کی جاتی تھی۔

مندرجہ بالا مسائل کے پیش نظر تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے اپنی تحریروں کے ذریعے یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ عورت کو اس کی مرضی کے بنا ایسے کسی کھونٹے سے باندھے رکھنا کسی طور بھی درست نہیں ہے۔ جب خدا باری تعالیٰ نے عورت کو تمام تر حقوق دے رکھے ہیں تو معاشرہ کیوں اس سے منحرف ہو؟؟۔ اس حوالے سے احمدیہ بیگم نے اپنے مضمون "عقد بیوگاں" [۳۲] میں اپنے نظریات کی پیش کش کی۔ اپنے مضمون میں مصنفہ نے یہ مسئلہ بھی اٹھایا ہے کہ پدر سری نظام کی وجہ سے عورت استحصال کا نشانہ بن رہی ہے، جس میں ایک بیوہ سے کوئی کمسن لڑکا یا کنوارہ آدمی شادی نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن ایک ادھیڑ عمر بوڑھا بھی بچوں کے ہونے کے باوجود ایک کمسن کنواری لڑکی سے شادی کا خواہاں ہے۔ جب کہ ایک ایسی عورت جو اپنے بچوں کے لیے کسی ایسے بر کی متلاشی ہے جو اس کی اور اس کے بچوں کی ذمہ داری اٹھالے۔ اسے ایسا کوئی شخص نہیں ملتا۔

۱.۷۔ بیوہ کا عقد ثانی:

بیوہ کو اس کے شوہر کی وفات کے بعد اس کے سوگ میں رکھنا کسی طور جائز نہیں ہے۔ اسلامی قوانین میں بھی کسی عورت کے انتقال کے بعد ایک خاص مدت (عدت) گزارنے کے بعد اپنی زندگی معمول کے مطابق گزارنے کی حمایت کرتے ہیں۔ لیکن ہندوستانی نظام میں بیوہ کے لیے سخت حدود و قیود متعین کی گئی تھیں جن میں ایک حد یہ تھی کہ اسے اپنے مرحوم شوہر کی محبت اور فرمانبرداری ثابت کرنے کے لیے تمام عمر تنہا گزارنی پڑتی تھی۔ مسز جی۔ ایم قریشی بیوہ کی حالت زار بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> امیر گھرانوں میں بے اولاد بیوہ کو کچھ بھی حصہ نہیں ملتا۔ حالانکہ شریعت نے مہر کے علاوہ

آٹھواں حصہ بھی عورت کو شوہر کی جائیداد میں دیا۔اس کی زندگی دو روٹیوں کے لیے
سرپرستوں کے ہاتھوں بکی ہوئی ہے۔نکاح تو بڑی بات ہے وہ شریعت کے مطابق کوئی بڑا خرچ
بھی نہیں کر سکتی۔۔۔"

اسلامی شریعت کی رو سے عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے شوہر کی وفات کے بعد عدت مکمل کر کے اپنی مرضی سے نکاح ثانی کر سکتی ہے۔ لیکن ہندوستانی معاشرے میں عورت کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ دوسری شادی کے بارے میں سوچ بھی سکے۔ہندوستانی نظام میں سے شوہر کی یاد میں دن رات گھلنے اور اپنی حالتِ زار پر کڑھنے کے لیے مجبور کیا جاتا تھا۔اسی مسئلے کے پیش نظر تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے عام خواتین میں یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش کی کہ اگر وہ میاں کی وفات کے بعد اپنی زندگی کو بہتر طریقے سے گزارنے کی خواہاں ہیں تو انھیں اسلامی شریعت میں اس کی پوری پوری آزادی دی گئی ہے۔معاشرتی اور سماجی دباؤ میں آکر وہ اپنے اس حق کو نہ چھوڑیں۔آمنہ خاتون نے اپنے مضمون "احکام شریعت سے انحراف" میں اسی مسئلے کو موضوع بنایا۔اس مضمون میں انھوں نے بیوہ کے عقد ثانی اور اس حوالے سے معاشرتی رکاوٹوں پر تنقید بھی کی۔انھوں نے ایسی رسومات جن کی کوئی شرعی حیثیت نہ ہو سراسر ایک مشرکانہ عمل ہیں۔ہندوستانی معاشرہ انہی رسومات کا اتنا عادی ہو گیا ہے کہ ان کے خلاف قدم اٹھانے والے کو طعن و ملامت کی جاتی ہے،حالاں کہ حقیقتاً وہ درست راہ پر ہوتے ہیں۔ہندوستانی معاشرے میں اگر کوئی شخص کسی بیوہ سے نکاح کر لے تو اس کا جینا دو بھر کر دیا جاتا ہے اور اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔اس ضمن میں وہ یہ بھی باور کرواتی ہیں کہ نیچی ذات کے لوگوں میں یہ رجحان شرفا کی نسبت کم ہے۔شرفا اور اونچی ذات کے لوگوں میں بیوہ کے عقد ثانی کے حوالے سے سختی زیادہ ہے وہ اسے شرع اسلامی کے خلاف سمجھتے ہیں۔آمنہ خاتون نے بیوہ کے عقد ثانی کو شرعاً درست قرار دیا ہے اور اس کے حق میں دلائل بھی دیے ہیں۔انھوں نے اس ضمن میں ان رشتوں کا ذکر بھی کیا ہے جن سے اسلام میں نکاح جائز قرار دیا گیا ہے۔آمنہ خاتون نے شریعت اسلامی میں جن رشتوں سے نکاح جائز قرار دیا ہے ان کے مطابق ہندوستانی معاشرے میں بعض رشتہ داروں سے نکاح کرنا ناجائز ہے حالاں کہ شریعت کی رو سے ان سے نکاح کرنا بالکل جائز ہے۔ہندوستان کی سماجی صورت حال کو مد نظر رکھتے ہوئے انھوں نے ایک قصہ بیان کیا کہ "عورتیں عام طور سے اپنے خاوند کے بڑے بھائی سے نکاح کرنا قطعی حرام سمجھتی ہیں۔ایک جوان لڑکی اپنے خاوند کے انتقال کے بعد اپنے خاوند کے بڑے بھائی سے نکاح کرنا چاہتی تھی۔جب یہ خبر اس کی ماں کے کان میں پہنچی تو آگ بگولہ ہو گئی اور اپنے بھائیوں کو بھی اس کی خبر کر دی۔وہ لوگ بھی چراغ پا ہو کر لڑکی کو سسرال سے اپنے گھر لے آئے۔اور یہاں اس خیال سے باز رہنے پر طرح طرح کی دھمکیاں دی گئیں۔یہ خبر اس کی سسرال اور میکے میں پھیل گئی اور دیر تک

کہرام مچا رہا۔ اور گھر گھر اس کا چرچا کیا گیا افسوس ہے کہ ان پڑھ خواتین کے ساتھ پڑھی لکھی بہنیں بھی اس لڑکی پر ملامت و نفریں کی بوچھار کر رہی ہیں۔ لڑکی کی ماں مجھ سے مسئلہ پوچھنے آئی۔ میں صاف صاف کہہ دیا کہ بالکل جائز ہے۔ یہ تمھاری بیوقوفی ہے کہ اس کی مخالفت کر رہی ہو۔ میرا اتنا کہنا تھا کہ وہ میرے پیچھے پڑ گئی اور کہنے لگی ہو نہ ہو نئی نئی کتابیں پڑھ کر تم نئے نئے مسئلے چھاننے لگی ہو۔ ایسی بات تو نہ ہمارے باپ دادا نے کبھی دیکھی سنی۔ نہ ہماری آنکھوں سے گزری۔ آخر ہم نے کوئی سر دھوپ میں تو سپید نہیں کیا۔۔۔[۷۵]

وہ مزید بتاتی ہیں کہ ہندوستانی معاشرے میں چچی کا بھتیجے اور ممانی کا بھانجے سے نکاح کرنا بھی ناجائز سمجھا جاتا ہے اور لے پالک کی بیوی سے نکاح کرنے کے متعلق بھی یہی خیال رائج ہے۔ انھوں نے ہندوستانی خواتین کو یہ تنبیہ کی کہ رسوم و رواج کی اندھادھند تقلید کی بجائے شریعت کے مطابق زندگی گزارنے کو ترجیح دیں تاکہ معاملاتِ زندگی میں آسانی کے ساتھ ساتھ خوشنودیِ خداوندی بھی حاصل ہو سکے۔

بیوہ کے عقد ثانی میں دیگر مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ اس کے بچوں کی کفالت کی ذمہ داری کوئی نہیں اٹھاتا تھا۔ بیوہ عورت اپنے بچوں کی خاطر تمام عمر ایسی زندگی گزارنے پر مجبور تھی جہاں کوئی اس کا پرسان حال نہیں تھا۔ ادریس بیگم اس ضمن میں لکھتی ہیں:

> ۔۔۔ وہ خود رسوم و رواج کی وجہ سے بہ مشکل نکاح ثانی پر رضامند ہوں گی۔ اگر انھیں رضامند بھی کر لیا جائے تو کوئی شخص بچوں کے باعث ان سے عقد نہیں کرے گا۔ اسی طرح بیوہ عورتیں یہ خیال کرنے لگی ہیں کہ بیوہ ہونے پر زندہ رہنا بیکار اور مر جانا بہتر ہے۔[۷۶]

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے ہندوستانی عورت کو اس کے حقوق سے متعارف کروایا اور بیوہ کو بھی یہ آگہی دی کہ شوہر کے مر جانے کے بعد وہ شرعی اور قانونی طور پر دوسری شادی کی حق دار ہے۔ اسے رسوم و رواج اور سماجی دباؤ میں آ کر خود کو ایسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہیے کہ دوسروں کے سہارے زندگی گزار دے۔ جیتے جاتے انسان کی زندگی کی سو ضروریات اور کئی مسائل ہوتے ہیں اسے ان مسائل پر قابو پانے کے لیے ایک ایسے مضبوط سہارے کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے جو اسے مشکل میں سہارا دے کر اس کی رفاقت کرے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ تمام رکاوٹوں اور سماجی دباؤ سے قطع نظر اپنی ذات کے متعلق فیصلہ کرے اور اپنی حالت بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ ن۔ م بیگم کے مضمون "نکاح ثانی"[۷۷] میں بھی اس سے متعلق معلومات ملتی ہیں۔

۲.۷۔ عدت کے مسائل:

ہندوستانی تہذیب ہندو مسلم مخلوط تہذیب ہے۔ جہاں ہندوؤں کے ساتھ رہتے ہوئے مسلمانوں نے ان کی بہت سی رسوم کو داخل کر لیا۔ اور اسلام سے دور ہو گئے ہندوؤں میں چوں کہ عورت کے شوہر کی وفات کے بعد کی

زندگی سخت مشکل ہو جاتی ہے۔ اس وقت اسے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اسے تسکین دینے کی بجائے اسے سماجی روایات کی پاسداری کے شکنجے میں الجھا دیا جاتا ہے۔ ہندوستانی معاشرے میں عدت کے حوالے سے پائے جانے والے خیالات پر فیروزہ بیگم لکھتی ہیں:

> شوہر کی وفات پر عورت کو چار مہینے دس دن سوگ میں رہنا پڑتا ہے۔ اسے شرع کے محاورے میں عدت کہتے ہیں۔ ان ایام میں شرع کی رو سے عورت کو زیب و زینت سے باز رہنا پڑتا ہے۔ اور اسے مکان سے باہر جانے کی بھی اجازت نہیں۔ مگر یہ ممانعت بہت سخت نہیں۔ اگر کسی ضرورت کی وجہ سے وہ جانا چاہے تو جا سکتی ہے۔ مگر ہاں یہ ضرور ہے کہ رات کو اپنے مکان میں آجائے۔[۴۸]

ایام عدت میں عورت پر ہر طرح کی آسائش اور سہولت ختم کر دی جاتی ہے اور اسے سختی گزارنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے پائے جانے والے تعصبات میں ایام عدت میں عورت کو زمین پر سونا، کسی سے ملاقات نہ کرنا، اچھی غذا نہ کھانا، کسی شادی بیاہ میں شریک نہ ہونا، ہر وقت رونے کو خوشنودی خدا خیال کرنا، اگر کسی ضروری کام کے لیے دن کو کہیں باہر جانا پڑے تو عدت کی مدت کو پھر سے شروع کرنا وغیرہ شامل تھے۔[۴۹]

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے عورت کو اسلام کے مطابق اس کے حقوق سے متعارف کروایا تاکہ وہ باقی کی زندگی اپنی سہولت سے گزار سکے۔ کیوں کہ "اسلام میں بیوہ کے لیے سوگ کے ایام ۴ ماہ اور دس روز قرار دیے ہیں۔ اس کے بعد سوگواری کے مظاہرے کا کہیں بھی حکم نہیں۔"[۸۰]

۸۔ ذہنی ہم آہنگی کا فقدان:

ہندوستانی معاشرے میں لڑکیوں کو پیدا ہوتے ساتھ ہی پرائی تصور کر لیا جاتا تھا۔ اس پرائے پن سے محض یہ مراد نہیں تھی کہ لڑکی کی شادی کے بعد اسے دوسرے گھر بھیج دیا جاتا۔ بل کہ اسے اپنی ذات، شخصیت اور عزت نفس تک کو پرائے ہاتھوں سونپنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ اسے یہ حق کبھی نہیں دیا گیا کہ وہ اپنی ذات، اپنی شخصیت، اپنی پسند ناپسند کے بارے میں کوئی بات کہہ سکے بل کہ اس کی تربیت میں یہ لازمی شامل تھا کہ اسے اپنے باپ، بھائی اور شادی کے بعد شوہر کی عزت کی حفاظت کرنا ہے، اس کا دل لبھانا ہے، کوئی ایسا کام نہیں کرنا جس سے اس کی دل آزاری ہو چاہے شوہر التفات برتے نا برتے بیوی کو چاہے کہ وہ سراپا وفا بنی اس کی ہر ایک غلطی ہر ایک دباؤ کو سہہ لے اور حرف شکایت لبوں پر نہ لائے۔ اس کا مقصد ہی مرد کو خوش کرنا ہے۔ شوہر چاہے کوئی بد فعلی ہی کیوں نا کر رہا ہو عورت کو کوئی حق نہیں ہے کہ وہ اس کے معاملے میں مداخلت کرے اور یہ تمام رسوم زمانے کے نام نہاد مذہبی اجارہ داروں کے بنائے ہوئے ہیں جنھوں نے عورت کے شرعی حقوق کو بھی اس قدر آلودہ کر کے پیش کیا کہ عورت کے

حقوق کی بجائے ان کی اپنی ذات کے لیے راہ ہموار ہوئی۔ اس کی مثال م۔ ظ۔ ا کے ایک مضمون میں یوں ملتی ہے:

> ۔۔۔اطاعت و وفاداری شریف ہندوستانی عورتوں کا جوہر ہے۔۔۔اس طرز عمل سے کبھی کبھار نیک فطرت مرد تو بیوی کی خدمت اور اطاعت سے متاثر ہو کر ان کے قدر دان بن جاتے ہیں۔۔۔لیکن بعض یہ سمجھتے ہیں کہ ان کو احساس ہی نہیں اور ان یہ اسی حالت میں رہنے کے قابل ہیں۔۔۔میرے خیال میں یہ خود کشی سے کم نہیں۔ بیوی کا حق ہے کہ وہ خاوند کے برے فعلوں پر اظہار نفرت کرے اور اس کی ناجائز سختیوں پر تنبیہ کرے، اسے راہِ راست پر لانے کی کوشش کرے تاکہ اسے محسوس ہو کہ یہ ہستیاں بھی پہلو میں دل رکھتی ہیں۔[81]

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین میں وہ خواتین بھی شامل تھیں جو روایات سے جڑی ہوئی تھیں اور جن پر جدیدیت کا کوئی بھی پہلو اثر انداز نہیں ہوا۔ ان خواتین نے مشرقی خواتین کو اپنی روایات کے ساتھ جڑا رہنے کی تلقین کرتے ہوئے یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ گرچہ وقتی معاملات ان کے لیے پریشانی اور تکلیف کا باعث ہیں لیکن مذہبی حوالے سے دیکھا جائے تو یہی تکلیف اور پریشانی آخرت میں ان کے باعث راحت اور آسودگی بن جائے گی اور انھیں ان کے اعمال نیک کا دوگنا صلہ ملے گا۔ یہاں وہ خواتین کو یہ سبق سکھاتے ہوئے بھی نظر آتی ہیں کہ وقتی معاملات میں گھبرانے اور پریشان ہونے سے بہتر ہے کہ خدا بلند و بزرگ کی رحمت سے امید رکھی جائے اور مایوسی سے اپنا پہلو بچائے رکھیں وہ خدا ضرور ان کی مراد بر لانے والا ہے عباسی بیگم اس ضمن میں یوں لکھتی ہیں:

> ۔۔۔میاں بیوی سے بے رخی کرے تو اس وقت بیوی کو اپنی قسمت کا نوشتہ سمجھ جانا چاہیے اور صبر و شکر کے ساتھ خدمت شوہر و حقوق شوہر پر کاربند رہنا چاہیے اور خدا سے دعا کرے کہ وہ شوہر کو توفیق نیک دے۔ خدائے بزرگ بہت بڑا منصف ہے۔ جب روز قیامت انصاف ہوگا جو حق پر تھا اور جو ناحق سب کچھ کھل جائے گا۔ کیا عجب تمھاری خاموشی ہی تمھارے شوہر پر جادو کا اثر کر دے۔ اور وہ تمھیں چاہنے لگے اور تمھاری قدر کرے۔[82]

مبارک دلھن نے ازدواجی زندگی کے مسائل میں ایک بڑا مسئلہ ذہنی ہم آہنگی اور باہمی التفات کی کمی بیان کیا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے عورت کو بھی اپنی ذمہ داری کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے کہ وہ گھر کی ملکہ ہونے کے ناطے یہ اختیار رکھتی ہے کہ اپنی سلطنت میں خوش اسلوبی، مثبت سوچ اور جی داری کے ساتھ امن و امان رکھنے میں کامیاب ہو۔ ان کے مطابق گھریلو مسائل کی اصل وجہ بدگمانیاں اور بلاوجہ کے شکوے شکایات ہیں جو ایک دوسرے کو اچھے طریقے سے نا سمجھ پانے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے عورت کا فرض ہے کہ وہ اپنے فہم و فراست کے درست استعمال سے اپنے گھریلو ماحول کو بہتر بنائے۔ انھوں نے مرد اور عورت کو گاڑی کے ان پہیوں سے تشبیہ دی ہے جن میں سے ایک کے ذمے اپنی ذمہ داری کا بار ہے اگر دونوں پہیے ایک سمت میں سفر نہیں کریں

گے تو کبھی زندگی کا سفر بہتر صورت میں پروان نہیں چڑھے گا۔[۸۳] اس حوالے سے لکھے گئے دیگر مضامین میں آر۔کے کا مضمون "اتفاقِ زوجین"[۸۴]، رضویہ خاتون کا مضمون "میاں بیوی کی رنجش"[۸۵] اور اہلیہ خواجہ حسین علی کا مضمون "میاں بیوی کی باہمی رنجشیں"[۸۶] شامل ہیں۔

۹۔ شادی کے بعد سسرال اور میکے کے معاملات:

ہندوستان میں عورت کو اس کے تمام جائز حقوق سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ لیکن دوسری طرف اس سے یہ امید کی جاتی تھی کہ وہ اپنی ذات کو پس پشت ڈال کر مرد کی تمام تر ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے نبھائے۔ جس میں اولاد اور مرد کے والدین کی ذمہ داریاں شامل ہیں۔ جہاں عورت مرد کے خاندان کی دیکھ بھال اور ان سے حسن سلوک کی ذمہ داری عائد کی جاتی ہے وہیں اسے اس کے والدین کے حقوق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

اسلام میں حسن سلوک کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ اور اسی طرح اگر وہ مرد کے والدین کا خیال رکھتی ہے تو یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔ بل کہ اس کے بدلے میں عورت کو خدا کی طرف سے اجر عظیم کی وعید سنائی گئی ہے۔ لیکن اس تمام صورت حال میں یہ امر خصوصی توجہ کا متقاضی ہے کہ ان فرائض کی انجام دہی میں اس کی اپنی ذات اور بچوں کی حق تلفی نہ ہو۔ ذیل میں شادی کے بعد عورت کی ذمہ داریوں اور ہندوستانی معاشرے میں اس کی صورت حال کا جائزہ لیا جائے گا۔

۹.۱۔ شادی کے بعد مرد کے والدین سے متعلقہ معاملات:

ہندوستانی معاشرے میں شادی کے بعد عورت کا اپنا گھر بار چھوڑ کر شوہر کے گھر جانا ایک روایت ہے۔ جس کے نتیجے میں اسے اپنے والدین کی دوری برداشت کرنا پڑتی ہے۔ لیکن یہ مشکل اس صورت میں سہل ہو جاتی ہے جب اسے سسرال میں شوہر کے والدین کی صورت میں ایسے لوگ مل جائیں جو اسے والدین کی سی شفقت دیں۔ ہر عورت یہی ارمان لے کر دوسرے گھر کو اپنا سمجھ لیتی ہے لیکن اس کی زندگی مشکل تب بنتی ہے جب نتائج اس کی سوچ سے الٹ آتے ہیں۔ ہندوستانی معاشرے میں بہو کو ہمیشہ پرایا سمجھا جاتا تھا اور اسے کبھی وہ رتبہ نہیں دیا گیا جو اپنوں کو دیا جاتا تھا۔ اس لیے اس کی ذات سے طرح طرح کی امیدوں کے علاوہ اس کے کندھوں پر ایسی بھاری ذمہ داریاں بھی لادی جاتی ہیں جو اس کے لیے اکیلے سہنا آسان نہیں ہوتا۔

سسرال قدم رکھتے ہی عورت کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا جاتا اور اسے گھر گرہستی کے امور اور سسرال والوں کی ناز برداری میں مصروف کر دیا جاتا ہے۔ لیکن صلے کے طور پر اسے وہ جائز حقوق اور محبت بھی نہیں دی جاتی جن کی وہ حقدار ہے۔ اور یوں وہ ذہنی دباؤ اور انتشار کا شکار ہو جاتی ہے۔ ظفر جہاں بیگم نے اس حوالے سے اپنے

نظریات ایک مضمون "ایک اہم سوشل اصلاح" میں پیش کیے ہیں:

۔۔۔اگر بیوی کے لیے ماں اور چھوٹے بہن بھائیوں کا تنہا چھوڑ دینا سنگدلی اور ظلم ہے، تو بیوی بھی تو آخر ماں اور بہن بھائی رکھتی ہے۔ اس کا بھی شوہر کی خاطر ان کو چھوڑ دینا سنگدلی اور ظلم ہے۔ لیکن دنیا اس کو روا رکھتی ہے۔ اور نہ صرف یہی کہ لڑکی کو شوہر کی خاطر اپنے عزیزوں سے جدا ہونا پڑتا ہے۔ بل کہ یہ اس پر سے اور طرہ ہے کہ والدین کی آغوش شفقت کی جگہ اس کو سسرال والوں کی بے جا ناز برداری کرنی پڑتی ہے۔ جہاں ہر وقت اس کے اعمال و افعال کی ایسی سخت نگرانی رکھی جاتی ہے جو شاید منکر نکیر کی نگرانی سے بھی سبقت لے جاتی ہے۔۔۔[۸۷]

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے ان مسائل کو مد نظر رکھتے ہوئے مستورات میں یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ اپنی ذات کو ایسے لوگوں کے پیچھے مسخ نہ کریں جنھیں ان کی قطعاً کوئی پروا نہیں ہے۔ مرد کے والدین کی ذمہ داری اور ان کے حقوق کا تحفظ مرد کے اپنے ذمے ہے نہ کہ بیوی کے ذمے۔ اس لیے جہاں تک ممکن ہو خوش اسلوبی سے معاملات کو نبھائیں لیکن اپنے حقوق کو سلب نہ ہونے دیں۔

اہلیہ سید احمد سبزواری نے اپنے مضمون "ساس بہو کے جھگڑے"[۸۸] میں ہندوستانی معاشرے کے ہر گھر کے مسائل کا احاطہ کیا جس میں ساس بہو کے جھگڑے کو بالخصوص موضوع بنایا ہے انھوں نے ذہنی ہم آہنگی نا ہونے اور عدم برداشت کو تمام مسائل کی وجہ بتایا ہے۔ ان کے مطابق عموماً ہندوستانی عورتیں شادی کے وقت بہو اس خیال سے لاتی ہیں کہ وہ ان کے گھر بار اور خاندان کے دیگر افراد کا خیال رکھے گی اور روز مرہ معمولات میں بھی اپنی مرضی تھوپنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ایسی خواتین یہ چاہتی ہیں کہ آنے والی لڑکی ان کی ہاں میں ہاں ملاتی خاموشی سے تمام معاملات سر انجام دیتی رہے اور اپنی مرضی کا اظہار نہ کرے۔ وہ اپنے نظریات کی اس قدر اسیر ہوتی ہیں کہ یہ یکسر نظر انداز کر دیتی ہیں کہ آنے والی لڑکی ایک خاص نقطہ نظر اور اپنی بھی کوئی فکر رکھتی ہے اور یوں ذہنی ہم آہنگی نہ بن پانے کی وجہ سے اکثر گھروں مین نوک جھونک شروع ہو جاتی ہے اور بات طول پکڑتے پکڑتے لڑائی جھگڑوں تک جا پہنچتی ہے۔ ان تمام مسائل سے بچنے کے لیے مصنفہ نے یہ تجویز دی ہے کہ شادی کے بعد عورت کو یہ حق دینا چاہیے کہ اس کے معمولات میں کوئی دوسرا مخل نہ ہو اور وہ اپنی زندگی اپنے اصولوں اور مرضی کے مطابق سہولت کے ساتھ گزار سکے۔ یہاں وہ مردوں کو تلقین کرتی ہیں کہ شادی کے بعد عورت کا اپنا الگ گھر ہونا اس کا بنیادی حق ہے اور اسے اس حق سے محروم نہیں رکھنا چاہیے۔ اگر مردوں کو اپنے والدین کی نسبت ذمہ داری نبھانے میں کوئی مشکل پیش آئے تو انھیں والدین کے ساتھ رہنا چاہیے نہ یہ کہ اپنی عورتوں کو مجبور کریں۔

۹.۲۔شادی کے بعد میکے کے معاملات:

ہندوستانی معاشرے میں عورت ہمیشہ ایک بوجھ سمجھی گئی ہے۔ کسی کے ہاں بیٹی کی پیدائش ایک دکھ، تکلیف اور اذیت کا باعث سمجھی جاتی ہے۔ پیدا ہوتے ساتھ ہی ایک بوجھ کا احساس اس پر لاد دیا جاتا ہے جو تمام عمر اس کے ساتھ رہتا ہے۔ تہذیب نسواں کی خواتین نے اپنے مضامین میں ایسے ہی مسائل اور خواتین کے ساتھ کیے جانے والے ناروا سلوک کو موضوع بناتے ہوئے متعدد مضامین لکھے اور سماج کے اجارہ داروں کو یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ عورت کو خدا نے کسی پر بوجھ بنا کر پیدا نہیں کیا۔ دین اسلام بھی خواتین کے حقوق کا مکمل تحفظ فراہم کرتا ہے اور عورت کو بحیثیت انسان عام مرد کی طرح زندگی گزارنے کا حق دیتا ہے۔ لیکن ہندوستانی معاشرے میں دیگر مذاہب اور اقوام کے اختلاط سے یہ تصور عام ہو گیا ہے کہ عورت شاید کوئی کم درجہ کم تر مخلوق ہے جس کی پیدائش اور وجود گھر والوں کو کھٹکتا ہے۔ و۔ا نے اپنے مضمون "سہاگن بیٹی میکے میں"[۸۹] میں اسی صورت حال کی ایک جھلک دکھانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اس بات کی سخت مخالفت کی ہے کہ شادی کے بعد اپنے سگے ماں باپ ہی بیٹی کے وجود سے نالاں ہو جاتے ہیں۔ اور بیٹی کا میکے آنا بھی ناپسند کیا جاتا ہے۔ اگر اپنے والدین ہی ان کے حقوق کا تحفظ نہیں کریں گے تو سماج میں ان کی کیا وقعت رہے گی۔

ان مصنفین نے خواتین کے حقوق کے ساتھ ساتھ مردوں کے حقوق کی بات بھی کی۔ انھوں نے مستورات میں یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش کی کہ خوشگوار ازدواجی زندگی کے لیے ضروری ہے کہ دونوں فریق باہمی ہم آہنگی اور عقل و انصاف کے ساتھ معاملات طے کریں۔ اس ضمن میں شاہزاد جہاں بیگم نے "بیوی کی فرمانبرداری"[۹۰] میں خواتین کو یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ شرع میں مرد کے ذمے عورت کا نان و نفقہ لازمی قرار دیا گیا ہے نا یہ کہ عورت اپنے تمام کنبے کی ذمہ داری شوہر کے کندھوں پر لاد کر اس کے لیے مشکل کا باعث بنے۔ عزیز رشتہ داروں کی محبت اپنی جگہ لیکن یہ اس قدر حد سے تجاوز نہیں کرنی چاہیے کہ اپنی نجی زندگی متاثر ہو۔

فرخندہ ایوب خاں اور ظفر جہاں بیگم نے اسی ضمن میں اپنے نظریات کی پیشکش "سسرال کا برتاؤ"[۹۱] اور "لڑکیوں کے حقوق والدین پر"[۹۲] میں کی۔

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے سماجی مسائل کو مد نظر رکھتے ہوئے ہندوستانی مستورات کی تربیت کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے معاملات کو سمجھتے ہوئے عورتوں کو اپنے جائز حقوق کی خاطر تگ و دو کرنے کی تحریک دی تا کہ وہ اپنے ان جائز حقوق سے محروم نہ رہ جائیں جن کا استحقاق انھیں مذہب نے دیا ہے۔ اس حوالے سے تہذیب نسواں کی مصنفین نے جن مسائل پر بات کی ان میں سر فہرست صغر سنی کی منگنی اور نکاح کا مسئلہ تھا۔

ہندوستان میں عام رواج تھا کہ بچوں کے پیدا ہوتے ہی ان کی نسبت طے کر دی جاتی تھی۔ اس صورت میں بچوں کی رائے لینا کہاں ممکن تھا۔ عہد طفلی میں کیے گئے ایسے رشتے بعد ازاں طبیعتوں کے نا ملنے پر مسائل سے دوچار ہوتے تھے اور باہمی مسائل جنم لیتے تھے۔ اس پر بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ان مسائل کے حل کے لیے کوئی لائحہ عمل ترتیب نہیں دیا گیا تھا کہ مسائل سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکے یا ان کا مناسب حل تجویز کیا جائے۔ کیوں کہ عورت کے لیے ہر حال میں اپنے رشتے کو قائم رکھنا ضروری قرار دیا گیا تھا چاہے اس میں اس کی ذات کو کتنی ہی مشکلات کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔

ہندوستانی معاشرے میں خاندانی مضبوطی کی خاطر ایسی بے جوڑ شادیاں کرنے کا رواج عام تھا۔ خاندان کے معزز افراد محض خاندان کو جوڑے رکھنے کے لیے اور وراثت کی منتقلی کے خوف سے ایسے رشتے کر دیا کرتے تھے جن میں کسی طرح مفاہمت پیدا نہیں ہو سکتی تھی اور نتیجہ گھریلو مسائل اور باہمی ناچاقی کی صورت ابھرتا تھا۔ لیکن رشتے کی بقا کی خاطر اور نام نہاد عزت و وقار کی خاطر عورت کو یہاں بھی مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ رشتے کو نبھائے۔

اول تو عورت کو اپنی زندگی سے متعلق کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں تھا لیکن اگر عورت اپنے شرعی حقوق یعنی خلع یا فسخ نکاح کا قصد بھی کر لیتی تھی تو اسے طرح طرح کی ملامت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ بات ملامت تک ہی محدود نہ تھی بل کہ اس کے کردار پر بھی طرح طرح کے سوالات اٹھائے جاتے تھے۔تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے ان تمام مسائل کا واحد حل مذہبی احکامات اور قوانین پر عمل درآمد بتایا۔ اور خلع اور فسخ نکاح کے اسلامی اصولوں سے متعارف کروایا تاکہ سماجی مسائل کا خاتمہ کیا جا سکے اور عورتوں کو بھی سہولت کے ساتھ زندگی گزارنے کی آزادی دی جا سکے۔

عورت کو معاشی طور پر مضبوط کرنے کے لیے اسلام نے حق مہر اور وراثت کے قوانین وضع کیے ہیں لیکن بد قسمتی سے ہندوستانی مستورات کے لیے ان کا حصول بھی ایک مشکل تھی۔تہذیب نسواں کی مصنفین نے اپنے فہم اور فراست سے ان کے لیے معلومات بہم پہنچائیں تاکہ وہ اس حوالے سے اپنے حق حاصل کرنے کی جدوجہد کر سکیں۔ نا صرف خواتین کو شعور دیا بل کہ مرد کو بھی تنبیہ کی کہ وہ اپنے فرائض سے روگردانی نہ کریں۔

ان مصنفین نے کثرت ازدواج سے ہونے والے مسائل، گھریلو معاملات بالخصوص بچے کی تربیت میں مرد کا عدم تعاون، بیوہ کے لیے سماجی رکاوٹوں، بیوہ کے عقد ثانی، تربیت اطفال، کثرت اولاد، اور میکے اور سسرال سے متعلق معاملات کو موضوع بنایا۔ اور گھریلو زندگی کی بہتری کے ساتھ ساتھ خواتین کی بہتری کی کوششیں کیں۔تہذیب نسواں کی مصنفین کا مقصد معاشرتی ڈھانچے کی توڑ پھوڑ ہرگز نہیں تھا۔ انھوں نے اپنی تمام تر مثبت کوششیں خواتین کی سماجی حالت کو بہتر بنانے کے لیے کیں۔ اور انھیں ان کے ان حقوق سے روشناس کروایا جن کا

استحقاق وہ بحیثیت انسان اور ایک عام شہری رکھتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ حجاب اسماعیل، "عورت کی سوانح عمری"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۴(۹ مارچ ۱۹۳۳ء): ص ۲۰۰۔

۲۔ ایس۔ آر۔ کے، "ازدواج"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۳۹(۳۰ ستمبر ۱۹۳۳ء) : ص ۹۳۷ تا ۹۳۹۔

۳۔ بنت معین الدین، "شوہر پرستی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۴۰(۷ اکتوبر ۱۹۳۳ء): ص ۹۷۸ تا ۹۸۳۔

۴۔ ام کلثوم، "قصوروار کون"، مشمولہ تہذیب نسواں جلد ۴۶(۱۰ اپریل ۱۹۴۳ء): ص ۲۳۲ تا ۲۳۴۔

۵۔ ایم۔ جے بیگم، "پیدائشی منگنی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۴۵(۱۰ نومبر ۱۹۲۸ء): ص ۱۰۹۵۔

۶۔ ع، "شادی کی قانونی عمر"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۳۲، شمارہ ۲۲(یکم جون ۱۹۲۹ء): ص ۵۱۱۔۵۱۰۔

۷۔ م ب، "بے زبان لڑکیاں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۵،(۲۶ مئی ۱۹۲۳ء): ص ۲۸۲۔

۸۔ آنسہ اختر، "ایجاب و قبول"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۴۰(۱۳ اکتوبر ۱۹۳۱ء): ص ۹۸۷۔

۹۔ ایک خریدار، "یک جدیوں میں شادی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۱۸، نمبر ۳۳(۱۴ اگست ۱۹۱۵ء): ص ۳۹۴۔

۱۰۔ نجمہ عباسی، "لڑکیوں کے لیے بر"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۶(یکم ستمبر ۱۹۲۳ء): ص ۵۵۵ تا ۵۵۷۔

۱۱۔ شاہزاد جہاں بیگم، "پسند کی شادی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۱۶(۱۸ اپریل ۱۹۳۱ء): ص ۳۷۰ تا ۳۷۱۔

۱۲۔ س۔ الف، "یک جدیوں میں شادی نمبر ۲"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۸، نمبر ۲۸(۱۳ مارچ ۱۹۲۵ء): ص ۱۹۶۔

۱۳۔ شاہزاد جہاں بیگم، "پسند کی شادی "، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۱۶(۱۸ اپریل ۱۹۳۱ء): ص ۳۷۰ تا ۳۷۱۔

۱۴۔ جمیلہ بیگم، "بے جوڑ شادیاں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۵۱(۲۲ دسمبر ۱۹۳۴ء) : ص

۱۲۱۱تا۱۱۲۴۔

۱۵۔ محمد کلیم آرائیں، عورت اور ازدواجی زندگی :قرآن مجید کی نظر میں (دہلی:مکتبہ الحسنات ۱۹۹۸ء)، ص۱۷۱۔

۱۶۔ قرآن، سورۃالنساء، ۴:۴۔

۱۷۔ شاہزاد جہاں بیگم ،"طلاق نہ دینا"، مشمولہ تہذیب نسواں ، جلد۳۶، نمبر۱۷(۲۴جون ۱۹۳۳ء): ص ۵۶۴۔

۱۸۔ محمد کلیم آرائیں، ص۱۷۴۔

۱۹۔ امت الوحی، "طلاق اور مہر"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۴۵(۱۱نومبر ۱۹۳۳ء): ص۱۰۹۱۔

۲۰۔ بلقیس بانو، "شرعی حقوق اور ہم"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۴۳(۱۹اگست ۱۹۳۹ء): ص۸۰۳۔

۲۱۔ صالحہ خاتون، "مہر"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۵، نمبر۴(۲۳جنوری ۱۹۳۲ء): ص۷۷تا۷۹۔

۲۲۔ جمیلہ ہاشمی، "کچھ مہر کے متعلق"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۵، نمبر۵(۳۰جنوری ۱۹۳۲ء): ص۱۱ تا۱۲۔

۲۳۔ ا۔س، "مہر"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۵، نمبر۶(۶فروری ۱۹۳۲ء): ص۱۱۹تا۱۲۰۔

۲۴۔ امت الوحی، "طلاق اور مہر"، تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۴۵(۱۱نومبر ۱۹۳۳ء): ص۱۰۸۹تا۱۰۹۱۔

۲۵۔ ب۔ن ،"شادی اور مہر" ،مشمولہ تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر۵۳(۳۰دسمبر ۱۹۴۴ء): ص۷۸۵تا۷۸۷۔

۲۶۔ جہاں آرا بیگم، "مہر"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۵۱، نمبر۲۷(۳جولائی ۱۹۴۸ء): ص۴۰۴تا۴۰۹۔

۲۷۔ مسز نذیر حسین، "حق خلع اور مسلمانوں کی ذہنیت"، مشمولہ تہذیب نسواں ، جلد۴۱، نمبر ۳۱ (۳۰جولائی ۱۹۳۸ء): ص۸۱۳۔

۲۸۔ و۔ا، "تفویض"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۱۱(۱۰مارچ ۱۹۳۳ء): ص۲۲۹تا۲۳۰۔

۲۹۔ ظفر جہاں بیگم، "خلع کا رواج ہونا چاہیے"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۲، نمبر۴۹(۷دسمبر ۱۹۲۹ء): ص۱۱۸۲۔

۳۰۔ شاہزاد جہاں بیگم ،"طلاق نہ دینا"، مشمولہ تہذیب نسواں ، جلد۳۶، نمبر۱۷(۲۴جون ۱۹۳۳ء): ص ۵۶۴۔

۳۱۔ م۔ظ۔ا، "مظلوم فرقہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۱، نمبر۳(۲۱جنوری ۱۹۲۸ء): ص۶۴تا۶۵۔

۳۲۔ ظفر جہاں بیگم، "خلع"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۳۱، شمارہ ۳۴ (۲۵ اگست ۱۹۲۸ء): ص ۸۱۷ تا ۸۲۰۔

۳۳۔ ایضاً، "خلع کا رواج ہونا چاہیے"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۳۲، شمارہ ۴۹ (۷ دسمبر ۱۹۲۹ء): ص ۱۱۸۱۔۱۱۸۳۔

۳۴۔ سلطانہ آصف فیضی، "مسلمان ورت کے حقوق فسخ نکاح"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۲۸ (۹ جولائی ۱۹۳۸ء) : ص ۶۸۲۔

۳۵۔ جمیلہ بیگم، "مسودہ مسلم قانون فسخ نکاح: تمام اسلامی انجمنوں سے تائید کی درخواست"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۴۷ (۲۳ نومبر ۱۹۳۵ء): ص ۲۰۲۷۔

۳۶۔ جمیلہ بیگم، "تنسیخ نکاح ایکٹ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۳۸ (۲۱ ستمبر ۱۹۴۰ء): ص ۹۳۰ تا ۹۳۲۔

۳۷۔ محمد یعقوب، "خلع بل: کونسل آف سٹیٹ میں"، تہذیب نسواں، جلد ۴۲، نمبر ۱۶ (۲۲ اپریل ۱۹۳۹ء): ص ۳۶۳۔

۳۸۔ ب۔ج، "ہماری مفلسی کی وجہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۳۲ (۸ اگست ۱۹۳۱ء): ص ۸۱۸ تا ۸۱۹۔

۳۹۔ زبیدہ زریں، "تعدد ازدواج اور فسخ نکاح"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۳۴ (۲۰ اگست ۱۹۳۸ء): ص ۸۹۱۔

۴۰۔ القرآن۔ فہرس موضوعی القرآن۔ ص ۵۲۰۔

۴۱۔ جمیلہ بیگم، "قصوروار کون؟"، مشمولہ تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۳۵ (۲۲ اگست ۱۹۴۴ء): ص ۴۹۷۔

۴۲۔ آذری بیگم، "کثرت ازدواج"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۸ (۲۷ جولائی ۱۹۳۳ء): ص ۶۷۴۔

۴۳۔ صغرا ہمایوں مرزا، "مرد کے فرائض"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۴۱ (۱۱ اکتوبر ۱۹۳۰ء): ص ۱۰۱۷۔

۴۴۔ کے۔اے حمید، "دوسری شادی"، مشمولہ تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۳۱ (۹ اگست ۱۹۴۱ء): ص ۷۲۰ تا ۷۲۱۔

۴۵۔ شاہزاد جہاں بیگم، "ہماری مفلسی کی وجہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۲۸ (۱۱ جولائی ۱۹۳۱ء): ص ۷۱۵ تا ۷۱۶۔

۴۶۔ زبیدہ زریں، "تعدد ازدواج اور فسخ نکاح"، مشمولہ تہذیب نسواں ، جلد ۴۱، نمبر ۳۴ (۲۰ اگست ۱۹۳۸ء): ص ۸۹۱ تا ۸۹۴۔

۴۷۔ زبیدہ زریں، "تعدد ازدواج"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۵۱، نمبر ۲۷ (۳ جولائی ۱۹۴۸ء): ص ۳۸۶ تا ۳۹۰۔

۴۸۔ ام کلثوم، "قصوروار کون"، مشمولہ تہذیب نسواں جلد ۴۶ (۱۰ اپریل ۱۹۴۳ء): ص ۲۳۲ تا ۲۳۴۔

۴۹۔ ثریا پروین، "قصوروار کون"، مشمولہ تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۵۱، ۵۰ (۱۸ دسمبر ۱۹۴۳ء): ص ۷۹۷ تا ۸۰۰۔

۵۰۔ شاہزادجہاں بیگم، "تربیت اطفال"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۴۱ (۱۱ اکتوبر ۱۹۳۰ء): ص ۱۰۰۶۔

۵۱۔ اے۔ کے مس سید علی حسن ، " بعض والدین کی غلطی "، مشمولہ تہذیب نسواں ، جلد ۳۴، نمبر ۲۵ (۲۰ جون ۱۹۳۱ء): ص ۵۹۰۔

۵۲۔ مسز علی بھائی، "پرورش اطفال"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۲۹ (۱۱ جولائی ۱۹۳۱ء): ص ۳۶۷ تا ۳۸۷۔

۵۳۔ شاہزادجہاں بیگم، "سوال"، مشمولہ تہذیب نسواں جلد ۳۴، شمارہ ۴۲ (۱۷ اکتوبر ۱۹۳۱): ص ۱۰۴۰ تا ۱۰۴۱۔

۵۴۔ بیگم ایوب احمد خاں، "بچوں کو ڈرانا"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۳۵ (۲ ستمبر ۱۹۳۳ء): ص ۳۸۸ تا ۳۹۰۔

۵۵۔ بیگم یار محمد خاں، "تربیت اطفال"، مشمولہ تہذیب نسواں ، جلد ۴۰، نمبر ۳۶ (۴ ستمبر ۱۹۳۷ء): ص ۸۵۱ تا ۸۴۱۔

۵۶۔ شاہزاد جہاں بیگم، "بچوں کے اتالیق اور نگران"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۴۶ (۱۸ نومبر ۱۹۳۳ء): ص ۲۰۱۱ تا ۲۰۱۳۔

۵۷۔ ایضاً، "کچھ بچوں کی بابت"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۳۴ (۲۵ اگست ۱۹۳۴ء): ص ۸۰۵ تا ۸۰۹۔

۵۸۔ ایضاً، "بچوں کے متعلق کچھ اور"، تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۱۰ (۹ مارچ ۱۹۳۵ء): ص ۲۲۶ تا ۲۳۰۔

۵۹۔ جمیلہ بیگم، "بچوں کو ڈرانا"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۳۹ (۲۹ ستمبر ۱۹۳۴ء): ص ۹۲۵ تا

۹۲۷۔

۶۰۔ ایضاً، "بچوں کو ساتھ سلانا"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۷۳، نمبر ۴۴(۳نومبر ۱۹۳۴ء): ص۱۰۴۹ تا۱۰۵۱۔

۶۱۔ ایضاً، "بچوں کی نگرانی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۷۳، نمبر ۳۶(۸ ستمبر ۱۹۳۴ء): ص۸۶۲ تا۸۶۴۔

۶۲۔ گلیڈس سلمہ، "بچے کی تربیت"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد۱۸، شمارہ۳۶(۴ ستمبر ۱۹۱۵ء): ص۴۲۶ تا ۴۲۸۔

۶۳۔ ایضاً، "بچے کی تربیت"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد۱۸، شمارہ۳۷(۱۱ ستمبر ۱۹۱۵ء): ص۴۳۸ تا۴۴۰۔

۶۴۔ مسز ایم ایف، "بچوں کی تعلیم و تربیت"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد۱۰، شمارہ ۳۱(۳ اگست ۱۹۰۷ء): ص۳۷۲ تا۳۷۳۔

۶۵۔ حسن بلقیس محمد بیگم، "بچوں کی تربیت"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۲۳، نمبر۴۶(۱۲نومبر ۱۹۲۰ء): ص۷۳۲ تا۷۳۵۔

۶۶۔ رونق جہاں بیگم، "بچہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۷۳، نمبر۱۷(۲۸اپریل ۱۹۳۴ء): ص۸۵۳ تا ۸۵۶۔

۶۷۔ شیلا، "بچے کی ضد"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۳۵(۲ ستمبر ۱۹۳۳ء): ص۸۵۱ تا۸۵۳۔

۶۸۔ ایضاً، "بچے کی حفاظت"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۳۶(۹ ستمبر ۱۹۳۳ء): ص۸۸۰ تا۸۸۲۔

۶۹۔ حجاب امتیاز علی، "عورت بحیثیت ماں کے"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۸، نمبر۳۸(۲۱ ستمبر ۱۹۳۵ء): ص۹۱۵ تا۹۱۷۔

۷۰۔ ب۔ن، "والدین کا اثر بچوں پر"، مشمولہ تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر۵۲(۲۳دسمبر ۱۹۴۴ء): ص۱۴۹ تا۱۵۱۔

۷۱۔ مسز رضا، "قلت و کثرتِ اولاد"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۲۶(۳مارچ ۱۹۲۳ء)۔

۷۲۔ ا۔ج بیگم، تہذیب نسواں ، جلد۴۴، نمبر۱۶(۱۷اپریل ۱۹۴۱ء): ص۳۲۳۔

۷۳۔ احمدیہ بیگم، "عقد بیوگاں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۲۶(۱۰نومبر ۱۹۲۳ء): ص۷۱۶ تا۷۱۸۔

۷۴۔ مسز جی ایم قریشی، "بیوہ کی زندگی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد۳۴، نمبر۴۷(۲۱نومبر ۱۹۳۱ء): ص۱۱۹۷۔

۷۵۔ آمنہ خاتون، "احکام شرعی سے انحراف"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۲۰ (۱۹ مئی ۱۹۳۴ء): ص ۴۶۱ تا ۴۶۲۔
۷۶۔ ادریس بیگم، "غم نصیب بیوہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۵، نمبر ۴ (۲۳ جنوری ۱۹۳۲ء): ص ۸۲۔
۷۷۔ ن۔م بیگم، "نکاح ثانی"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۲۱، شمارہ ۱۷ (۲۷ اپریل ۱۹۱۸ء): ص ۲۶۸ تا ۲۷۰۔
۷۸۔ فیروزہ بیگم، "شریعت اسلامی میں ہندوانی اضافہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۱۶ (۱۹ اپریل ۱۹۳۰ء): ص ۳۹۸۔
۷۹۔ ایضاً، ص ۳۹۸۔
۸۰۔ جمیلہ بیگم، "بیوہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۴۳ (۲۸ اکتوبر ۱۹۳۳ء): ص ۱۰۳۳۔
۸۱۔ م۔ظ۔ا، "مظلوم فرقہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۳ (۲۱ جنوری ۱۹۲۸ء): ص ۶۴ تا ۶۵۔
۸۲۔ عباسی بیگم، "مردوں کی معاشرت"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۱۷، نمبر ۴۲ (۱۷ اکتوبر ۱۹۱۴ء): ص ۴۹۹۔
۸۳۔ مبارک دلھن، "گھر کی ملکہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۹، نمبر ۴۱ (۱۰ اکتوبر ۱۹۳۶ء): ص ۹۹۰ تا ۹۹۲۔
۸۴۔ آر۔کے، "اتفاقِ زوجین"، مشمولہ تہذیب النسواں، جلد ۳۰، شمارہ ۴۵ (۵ نومبر ۱۹۲۷ء): ص ۹۱۳-۹۰۸۔
۸۵۔ رضویہ خاتون، "میاں بیوی کی رنجش"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۵، نمبر ۲۷ (۸ جولائی ۱۹۲۲ء): ص ۴۲۷ تا ۴۲۹۔
۸۶۔ اہلیہ خواجہ حسین علی، "میاں بیوی کی باہمی رنجشیں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۵، نمبر ۳۱ (۲۹ جولائی ۱۹۲۲ء): ص ۴۷۵ تا ۴۷۷۔
۸۷۔ ظفر جہاں بیگم، "ایک سوشل اصلاح"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۳۴ (۲۴ اگست ۱۹۲۹ء): ص ۸۲۹۔ا۔
۸۸۔ اہلیہ سید احمد سبزواری، "ساس بہو کے جھگڑے"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۱۰ (۹ مارچ ۱۹۳۵ء): ص ۲۳۰ تا ۲۳۲۔
۸۹۔ و۔ا، "سہاگن بیٹی میکے میں"، مشمولہ تہذیب نسواں جلد ۳۳، شمارہ ۳۵ (۳۰ اگست ۱۹۳۰ء): ص

۸۶۱ تا ۸۶۳۔

۹۰۔ شاہزادجہاں بیگم، "بیوی کی فرمانبرداری"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۴۵ (۷ نومبر ۱۹۳۱ء): ص ۱۱۵۶ تا ۱۱۵۷۔

۹۱۔ فرخندہ ایوب خاں، "سسرال کا برتاؤ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۳۳ (۱۸ اگست ۱۹۳۴ء): ص ۷۸۵ تا ۷۸۸۔

۹۲۔ ظفر جہاں بیگم، "لڑکیوں کے حقوق والدین پر"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۳۱، شمارہ ۳۲ (۱۱ اگست ۱۹۲۸ء): ص ۷۷۷ تا ۷۷۸۔

باب پنجم:

آداب معاشرت اور تہذیب نسواں کی مصنفین کی سماجی آگاہی

باب پنجم:

آداب معاشرت اور تہذیب نسواں کی مصنفین کی سماجی آگہی

سماج سے مراد افراد کا ایک گروہ ہے جو کسی جگہ پر مل جل کر رہتے ہوں۔ یعنی جہاں مختلف افراد ایک جگہ اکٹھا رہنا شروع کر دیں وہ سماج کہلائے گا۔ انسان ایک سماجی جانور قرار دیا گیا ہے جو کبھی بھی تنہا نہیں رہ سکتا۔ اسے اپنی زندگی گزارنے کے لیے افرادی قوت اور خاص ماحول کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر انسان کو خدا نے ایک دوسرے سے مختلف پیدا کیا ہے اور ہر انسان اپنی مختلف صفت لے کر پیدا ہوا ہے۔ ان صفات میں اس کے اخلاق و عادات اور افکار خاص طور پر اہمیت کے حامل ہیں، جو ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ مختلف انسانوں کی انہی عادات و اطوار اور خصائل سے ایک معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ جس میں اس کے مذہب و عبادات، اخلاقیات و عقائد، روایات افکار و نظریات، طرز بود و باش، فنون لطیفہ اور ماحول کو خصوصی دخل ہوتا ہے۔ جسے دوسرے لفظوں میں اس کی ثقافت کہا جاتا ہے۔ انسانی کلچر یا ثقافت کی تکمیل میں وہاں کے ماحول اور آب و ہوا کا بڑا دخل ہے۔ انسان اپنے ماحول کے مطابق ہی اپنا طرز بود و باش تبدیل کرتا اور نشو و ارتقا پاتا ہے۔ جس خطے میں انسان زندگی گزار رہا ہوتا ہے اس کی آب و ہوا کے مطابق اپنے لیے لباس کا انتخاب اور غذا کا بندوبست کرتا ہے۔ ہر خطے کے انسان کا جدا طرزِ زندگی اور الگ افکار ہوتے ہیں۔

> ثقافت دراصل نام ہے کسی قوم یا انسانی گروہ کے ان مخصوص نظریات و عقائد، افکار و اخلاق، تہذیبی رواج و روایات، طرز بود و باش، طرز معاشرت اور فکری اور تخلیقی سرگرمیوں کا جو اسے دوسری اقوام و ملل سے ممیز و ممتاز کرتی ہے۔ ہر قوم کی ثقافت ایک مخصوص و منفرد مزاج کی حامل ہوتی ہے اور اس قوم کے بنیادی نظریات و عقائد پر منحصر ہوتی ہے۔ بنیادی نظریات اور ثقافت دو علیحدہ علیحدہ دائرہ ہائے کار نہیں بل کہ باہم دگر مربوط اور آپس میں جڑے ہوتے ہیں۔[1]

عمومی طور پر معاشرہ جس طریقے سے اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کے رہن سہن میں جو چیزیں داخل ہیں وہ بھی کلچر ہے۔ یعنی معاشرے کا کلچر یہ ہے کہ وہاں کے لوگ اس قسم کا لباس پہنتے ہیں۔ اس قسم کی غذا کھاتے ہیں۔ اس قسم کے ان کے رسم و رواج ہیں۔ کلچر کی دو صورتیں ہیں ایک ظاہری صورت اور دوسری اس کی باطنی صورت۔ باطنی صورت وہ ہے جسے ہم ذہنی کہہ سکتے ہیں، ظاہری صورت سے آگے بھی دو پہلو یا اس کے جز ہیں ایک اس کا شعوری جزو ہے اور دوسرا اس کا غیر شعوری جزو ہے۔[2]

فیض احمد فیض کلچر کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ہر قوم کی تہذیب یا کلچر کے تین پہلو ہوتے ہیں۔ایک اس قوم کے اقدار و احساسات اور عقائد۔جن میں وہ یقین رکھتی ہے۔دوسرے اس کے رہن سہن کے طریقے۔اس کے آداب اور اس کے اخلاق ظاہری اور تیسرے اس کے فنون۔یہ تینوں ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں۔جنھیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔[۳]

کلچر کی ترتیب میں محض ایک گروہ یا کچھ اشخاص کے خصائص اور خصائل کار فرما نہیں ہوتے۔اس پر بیرونی طاقتیں بھی مسلسل اثر انداز ہو رہی ہوتی ہے۔ان بیرونی قوتوں کی بود و باش، طرز رہن سہن اور دیگر ثقافتی عوامل کے رد و قبول سے معاشرہ ارتقاپذیر ہوتا ہے۔جو دونوں سماجوں کے باہمی میل جول، روابط اور مشترکہ مسائل و سائل کے مرہون منت ہے۔

کسی بھی ثقافت کے انسان کا تشخص اس کی روایات اور مذہبی عقائد سے جڑا ہوتا ہے۔نو آبادیاتی ہندوستان میں رہنے والے افراد بھی اپنی جدا تہذیب، روایات اور مذہبی عقائد رکھتے تھے۔یہاں مسلمان، ہندو اور انگریز قومیں آباد تھیں جنھوں نے ایک دوسرے سے بہت سی عادات و اطوار مستعار لیں جن میں سے بعض ان کی ثقافت کا مستقل حصہ بھی بنیں اور کچھ کو رد کر دیا گیا۔رد و قبول کے اس سلسلے میں ایک نکتہ خصوصی توجہ کا متقاضی ہے۔وہ یہ کہ ہمیشہ سے حاکم طبقے کی روایات، عادات اور طرز حیات کو زیادہ اہمیت ملی ہے۔ہندوستانی تہذیب میں بھی ایسا ہی ہوا پہلے پہل جب مسلمان ہندوستان میں آئے تو یہاں کی دیگر تہذیبوں کے اختلاط سے نئی ثقافت ابھر کر سامنے آئی لیکن نو آبادیاتی دور میں یہ تبدیلیاں بڑے پیمانے پر واقع ہوئیں اور مغربی تہذیب کے اچھے برے تمام اطوار و روایات کو اپنانے کی سعی کی گئی۔یہ اس لیے بھی ہوا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریز ہندوستان پر حاکم بن کر آئے تھے۔انھوں نے ہندوستانی تہذیب کو مسمار کرنے کے لیے ہر شعبہ زندگی میں اپنے گہرے نقش ثبت کیے اور ہندوستانی اقوام کے لیے انھیں قبول کرنا لازمی قرار دیا۔اگر ہندوستانی قوم ایسا نہ کرتی تو دنیاوی دوڑ میں پیچھے رہ جانے کے ساتھ ساتھ اپنا وجود بھی کھو بیٹھتی۔ہندوستانی تہذیب کو مسمار کرنے کے لیے انگریزوں کی پالیسی کی وضاحت ذیل میں سطور میں ہوتی ہے:

> انگریزوں نے ہم پر دو سو سال حکومت کی اور اس طویل مدت میں ان کی کوششوں کا محور یہ تھا کہ مسلمان اپنی قومی حیثیت کو گم کر کے ان کے رنگ میں رنگے جائیں، ان کے رہن سہن، رسوم و رواج یہاں تک کہ سوچنے کے انداز بدل جائیں اور جب وہ جائیں تو کہنے کو تو ایک آزاد ملک چھوڑ جائیں لیکن اس کی آزادی بے معنی اور غلامی کے مصداق ہو۔اس مقصد کے لیے انھوں نے پورے نظام حکومت کو اس طرز پر ڈالا کہ مسلمان مجبور ہو کر ان کے رنگ میں رنگ جائیں۔۔۔[۴]

دنیاوی ترقی کی دوڑ میں ہندوستانی مسلمان اور ہندو دونوں اقوام نے انگریزوں کی تجاویز پر عمل درآمد شروع کر دی۔ ابتدا میں ایسا کرنے والوں کو مزاحمت اور کڑی تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن مزاحمت کرنے والوں کی آواز زیادہ دیر تک سنائی نہ دی اور جلد ہی اسے جدیدیت اور معاشرتی ترقی کے شور میں دبا دیا گیا۔

ہندوستانی اقوام کو جدید رویوں کو پروان چڑھانے اور بحیثیت قوم دنیا کے نقشے پر قائم رکھنے کے لیے سرسید احمد خان اور ان کے رفقائے کار نے خصوصی خدمات سرانجام دیں اور انھیں ہی سب سے زیادہ تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ سرسید احمد خان کی تعلیمات پر کچھ رجعت پسند اور کٹر روایت پرست مسلمانوں نے کفر کے فتوے بھی دیے۔ لیکن وہ اپنے مقصد سے پیچھے نہ ہٹے بل کہ مخصوص دائرہ کار میں رہتے ہوئے اپنے مقصد پر کاربند رہے۔ سرسید اور ان کے رفقائے کار کی کوششوں سے ہی ہندوستانی قوم جدید رجحانات سے متعارف ہوئی اور قومی و ملکی فلاح کے لیے کوشاں ہوئی۔ ہر تہذیب میں اتنی گنجائش ضرور موجود ہوتی ہے کہ جدید فکر اور جدید رجحانات کو اپنے اندر سمو سکے۔ ہندوستانی تہذیب میں بھی یہ گنجائش موجود تھی اور اسی لیے یہاں کے لوگوں میں مغربی تہذیب جلدی رچ بس گئی۔ لیکن اس کا نقصان یہ ہوا کہ ان کی اپنی تہذیب اور اقدار کے رنگ ماند پڑنا شروع ہو گئے۔

سرسید نے جہاں ہندوستانی مردوں کی فلاح و بہبود اور تعلیم و ترقی کی کوششیں کیں وہیں ان کے ہمعصر مولوی ممتاز علی، شیخ عبد اللہ اور راشد الخیری ہندوستانی مستورات کی تعلیم و ترقی کی فکر میں لگ گئے۔ مولوی ممتاز علی نے خواتین کے لیے تہذیب نسواں کا اجرا کیا تو ان کی رفیق حیات محمدی بیگم نے اس کار خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنی تمام تر محنت اور لگن سے مستورات میں شعور و آگہی پیدا کرنے میں لگ گئیں۔ نا صرف محمدی بیگم بل کہ اس دور کی باشعور خواتین نے بھی خواتین کو جدید رجحانات سے متعارف کروانے کے لیے قلم اٹھایا۔ تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین کی فکر اور خواتین میں شعور و بیداری پیدا کرنے کی مختلف جہتوں پر پہلے کے ابواب میں تفصیلاً ذکر ہو چکا ہے۔ ان خواتین نے جدید رویوں کے قبول کرنے کی اہمیت کے ساتھ ساتھ اپنی تہذیب سے پیوستہ رہنا بھی ضروری خیال کیا۔ اور ان خواتین کی رہنمائی کی جو مغربی تہذیب کی اندھا دھند تقلید میں اسلامی اقدار و روایات خیر باد کہہ چکی تھیں۔ اس حوالے سے تفصیل ذیل کی سطور میں پیش کی گئی ہے:

آدابِ معاشرت اور تہذیب نسواں کی مصنفین کی سماجی آگہی:

تہذیب نسواں میں لکھنے والی خواتین اپنے عہد کے سماجی حالات اور وقتی تقاضوں سے بخوبی واقف تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ جدید رجحانات سے واقفیت نہ ہونے پر یہاں کی خواتین دیگر اقوام کی خواتین سے پیچھے رہ جائیں گی۔ اور ان خواتین کی لاعلمی اور بے شعوری سے ان کی قومی و ملکی ترقی کے کمزور پڑ جانے کا احتمال بھی تھا۔

انھوں نے ہندوستانی مستورات کی تربیت بھی انہی نقوش پر کی کہ انھیں سماج کا ایک باشعور فرد بنایا جائے جو وقتی تقاضوں سے نبرد آزماہوں اور اپنی اولادوں کی تربیت بھی بہتر طریقے سے کر سکیں۔

ان مصنفین نے مستورات کو ان کے مذہبی حقوق و فرائض سے متعارف کروایا۔ اور بحیثیت فرد سماج میں ان کے اہم کردار کی اہمیت بھی بتائی۔ جدیدیت کی رو سے جہاں باقی کا طبقہ متاثر ہوا تھا ہندوستانی خواتین پر بھی ان کا گہرا اثر ہوا اور انھوں نے مذہبی تعلیمات اور اسلامی روایات کو پس پشت ڈال کر نئے رجحانات کو اپنایا۔ تہذیب نسواں کی مصنفین نے ان خواتین کے لیے اسلامی طرز زندگی کے مطابق زندگی گزارنے کی اہمیت پر زور دیا۔

تہذیب نسواں کی مصنفین نے اسلامی ثقافت کی بقا، ہندوستانی طرز معاشرت اور سماجی معاملات و مسائل کے حوالے سے خصوصی مضامین تحریر کیے۔ انھوں نے اس ضمن میں جن موضوعات پر قلم اٹھایا، ان میں لباس کے انتخاب، مغرب کی بے جا تقلید سے گریز، اخلاقیات، عادات اور اطوار کے سلسلے میں اسلامی روایات پاسداری، اقدار و روایات کا تحفظ و بقا، گفت و شنید کے آداب، سماجی میل ملاپ کے فوائد، اسراف اور نمود و نمائش سے گریز، قدامت پرستی کے نقصانات، توہم پرستی اور پردے کے مسائل پر اپنے نظریات کا بھرپور اظہار کیا۔ ان نظریات پر تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین کے افکار کا جائزہ ذیل کی سطور میں لیا گیا ہے:

ا۔ لباس:

لباس انسان کے ستر کو ڈھانپنے کے ساتھ ساتھ اس کی تہذیب و ثقافت اور اس کے تشخص کی نمائندگی بھی کرتا ہے۔ کرہ ارض میں پائی جانے والی تمام تہذیبوں میں ان کی روایات اور رواج کے مطابق لباس کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ لباس کے انتخاب میں کسی خاص خطے کے مذہبی عقائد، ثقافتی روایات، رسوم و رواج اور جغرافیائی عوامل کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔ ہندوستانی نظام میں بھی یہ انہی تمام اجزا کی نمائندگی کرتا ہے۔

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے ہندوستان خواتین کو جہاں دیگر معاملات پر آگاہ کیا وہاں لباس کے انتخاب، موقع محل کے مطابق لباس کے چناؤ، اور قومی تشخص کو برقرار رکھنے کے حوالے سے بھی معلومات بہم پہنچائیں۔ اس ضمن میں تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین کی سماجی آگہی کے حوالے سے ذیل کی سطور میں تفصیل بیان کی گئی ہیں۔

ا۔ا۔ موقع کی مناسبت سے لباس کا انتخاب:

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین بہتر سماجی شعور رکھتی تھیں۔ اور وقتی تقاضوں، حالات و واقعات کے مطابق رسوم و رواج کی ضرورت اور اہمیت کے حوالے سے اپنے عہد کی دیگر خواتین سے زیادہ سمجھ بوجھ رکھتی

تھیں۔ اسی لیے انھوں نے اپنی ہم عصر خواتین کی تربیت بھی کی اور اپنے مضامین کے ذریعے ایسے معاملات پر قلم اٹھایا جو تربیت نسواں کے زمرے میں از حد ضروری تھے۔ ان مضامین کے ذریعے مستورات میں سماجی تقاضوں کے مطابق رکھ رکھاؤ اور اخلاق و عادات کو سمجھنے میں معاونت ہوئی۔ ان مضامین میں جہاں خواتین کو سماجی اور معاشرتی حوالے سے شعور دیا گیا وہیں رہن سہن اور موقع کی مناسبت سے لباس کے انتخاب پر بھی توجہ دی گئی۔ مبارک دلھن نے موقع محل کی مناسبت سے برتاؤ اور لباس کے چناؤ کے حوالے سے اپنے افکار کا اظہار اپنے مضمون "پرسا" میں کیا۔ اس مضمون میں وہ سماجی برتاؤ کے حوالے سے خواتین کو خصوصی کرتی نظر آتی ہیں۔ انھوں نے ان خواتین کو ہدف تنقید بنایا جو غمی کے موقع پر بھی محض آرائش وزیبائش کے لیے آتی ہیں اور ایسے لباس کا انتخاب کرتی ہیں جو محض آرائش اور دکھاوے کے لیے ہو۔ ایسا لباس اس موقع کی مناسبت سے بالکل درست نہیں ہوتا۔ اس سے لواحقین کی دل آزاری تو ہوتی ہی ہے ساتھ میں ان کی اپنی شخصیت کا وقار ماند پڑ جاتا ہے۔ اس ضمن میں وہ یوں لکھتی ہیں:

> ۔۔۔سب کو معلوم ہے۔ شادی میں کس طرح خوشی منائی جاتی ہے اور کیسے کپڑے زیب تن کیے جاتے ہیں۔ اور ماتم کدہ میں کس طرح سوگ کیا جاتا ہے۔ مجھے ایسی تمام بیبیوں پر عموماً اور تعلیم یافتہ خواتین پر خصوصاً بہت افسوس آتا ہے۔ جو پرسے کے لیے دوسرے کے یہاں پان کھائے۔ سرمہ لگائے۔ بال بنائے ہرے پیلے دوپٹے اوڑھے جاتی ہیں۔ جن کے یہاں پرسے کو جاتے ہیں۔ وہ لوگ اس قدر بد حواس نہیں ہوتے کہ کسی کے زیب و زینت اور بناؤ سنگھار کو بھی نہ دیکھ سکیں۔ لہٰذا میری بہنوں کو چاہیے کہ جس تقریب میں بھی جائیں اس کے مطابق لباس پہن کر جائیں۔۔۔[۵]

ایس۔ آر کرمانیہ نے بھی موقع محل کی مناسبت سے لباس کے انتخاب کی اہمیت پر زور دیا۔ اس کی تفہیم ان کے مضمون "ماتم پرسی کا لباس"[۶] میں موثر انداز میں کی گئی ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے مختلف موقع کی مناسبت سے مختلف تہذیبوں میں پائے جانے والے رواج کے حوالے سے بھی اپنے خیالات کا مربوط اظہار کیا۔

سیدہ تنعلی نے اپنے مضمون "ہمارا لباس اور زیور"[۷] میں لباس اور زیور کی اہمیت کے حوالے سے آگاہ کرتے ہوئے موقع کی مناسبت سے لباس اور زیور کے چناؤ پر بات کی ہے۔ انھوں نے موقع محل کی مناسبت سے لباس کے انتخاب کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے اور اس کا شخصیت اور ماحول پر اثر واضح کیا ہے۔

۲.۱۔ قومی تشخص اور لباس کی اہمیت:

نو آبادیاتی ہندوستان میں ایک مخلوط تہذیب نے جنم لیا۔ ہندو مسلمان کئی صدیوں تک ساتھ رہے تو ان کی

عادات و اطوار، رکھ رکھاؤ، رسوم و رواج اور لباس پر بھی ایک دوسرے کے اثرات مرتب ہوئے۔ لاشعوری طور پر دونوں قوموں ایک دوسرے کے اطوار کو اپنایا اور برتنا شروع کر دیا۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ ہندو مسلم چاہے کتنا ہی عرصہ ایک ساتھ کیوں نہ رہے ہوں اور ایک دوسرے کے کتنے اثرات ہی قبول نہ کیے ہوں بہر حال مذہب ایک ایسا معاملہ ہے۔ جہاں دونوں اقوام ایک دوسرے کے مد مقابل آکھڑی ہوتی ہیں اور یہیں سے ان کے اختلافات جنم لیتے ہیں کیوں کہ ایک مذہب کے لیے جو چیزیں جائز اور حلال ہیں وہاں دوسرے مذہب میں اس کے الٹ معاملات ہیں۔ مخلوط تہذیب کے یہ اثرات ایک حد تک تو درست تھے لیکن بعض افراد نے حد سے تجاوز کیا اور مذہبی حوالے سے چیزوں کا رد و قبول شروع ہوا تو اس کے خلاف آواز اٹھائی گئی۔ اسی حوالے سے ایک مسئلہ لباس کا تھا۔ مسلم اور ہندو خواتین نے ایک دوسرے سے متاثر ہو کر لباس میں بھی تبدیلیاں شروع کر دی۔ جس سے دونوں اقوام کا ذاتی تشخص مسخ ہونا شروع ہو گیا۔ لباس چوں کہ کسی بھی قوم کے تشخص کی علامت ہے اس لیے بہت سے لوگوں نے اس تبدیلی کو ناپسند کیا اور یہ باور کروایا کہ ایک دوسرے کے امتزاج سے اپنی انفرادیت کو مسخ نہ ہونے دیں نا صرف ہندو مسلم خواتین نے ایک دوسرے کے لباس کو اپنایا بل کہ ہندوستانی خواتین میں کچھ آزاد خیال خواتین نے انگریزوں کے لباس کو بھی اپنایا اور ایسی وضع اختیار کی کہ برطانوی خواتین کے رنگ میں ڈھلنے لگیں۔ تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے اس ضمن میں خواتین ہند کو یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ اپنا تشخص مسخ نہ ہونے دیں اور اپنی انفرادیت کو قائم رکھیں کیوں کہ جو اقوام اپنی انفرادیت کو قائم نہیں رکھ سکتیں وہ بہت جلد معدوم ہو جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں امتہ الرؤف بیگم کے نظریات کی عکاسی ذیل کی سطور میں ہوتی ہے:

> مسلمان ہندوستان میں ایک الگ تمدن لے کر آئے تھے۔ ان کا لباس اور رہنے سہنے کا طریقہ ہمیشہ دوسری قوموں سے جدا رہا ہے لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ہماری مسلمان بہنیں اس امتیاز کو مٹانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ جس زمانے میں دوسری اقوام میں یہ جذبہ موجزن ہے کہ وہ اپنی قومیت کو زندہ کریں۔ اور اپنے زمانہ عروج کے تمدن کو از سر نو قائم کریں۔ مسلمان اپنی قومیت کو فنا کرنے اور اپنے تمدن کا جنازہ اٹھانے کے واسطے تیار ہیں۔۔۔۔ آج کل دنیا کی تمام قومیں ترقی کے دور سے گزر رہی ہیں۔ ہر قوم اپنے تمدن کو زندہ کرنے کی فکر میں ہے۔ مسلمان خواتین کا فرض ہے کہ اپنے تمدن کو جو مسلمہ طور پر ممتاز درجہ رکھتا ہے زندہ کریں۔ اور قومیت کو سیلاب حوادث سے بچائیں۔ [۸]

فاطمہ بنتِ کے محمد حسین نے بھی لباس کو مذہبی تشخص کے لیے اہم قرار دیا۔ نو آبادیاتی ہندوستان میں ہندو، مسلمان اور عیسائی تین طرح کے مذہب اور اقوام اکٹھے بسر ان کر رہے تھے اور باہمی میل جول اور مفارقت کی

وجہ سے کچھ مسائل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ ہر قوم کے افراد اپنا لباس اپنے مذہبی تقاضوں کے عین مطابق زیب تن کرے تا کہ تشخیص مشکل نہ ہو۔ یہ مسئلہ اس وقت پیش آتا جب کسی ایسی محفل میں جانا پڑتا جہاں آشنائی نہ ہو اور مختلف مذاہب کے لوگ ہوں ایسی صورت میں لباس ہی انسان کی تشخیص کرواتا ہے۔ فاطمہ بنت کے محمد اس بات کی اہمیت پر زور دیتی ہیں کہ ہمیں دیگر قوام کی ہر چیز کو جوں کا توں اپنانے کی بجائے اس امر کا خیال رکھنا چاہیے کہ اپنا تشخص گم نہ ہو۔ بل کہ اس امر کا خیال رکھنا چاہیے کہ ہماری اپنی انفرادیت قائم رہ سکے۔ ان نظریات کی عکاسی ان کے مضامین "ہمارا لباس"[۹] اور "قومی لباس کی ضرورت"[۱۰] میں کی گئی ہے۔ مسز قاضی سید سناء الدین بھی اپنے مضمون "مسلم خواتین کا لباس"[۱۱] میں قومی تشخص اور اسلامی روایات کی بقا کے لیے ایسے لباس کے انتخاب پر زور دیتی ہیں جس سے قومی و مذہبی تشخص مجروح نہ ہو اور مسلمانوں کی انفرادیت قائم رہے۔ ان کے مطابق مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی تمدنی خصوصیات کو مسخ نہ ہونے دیں۔ جمیلہ سید حسن نے اس ضمن میں اپنے نظریات "[۱۲]سنگھار کے لوازمات" میں پیش کیے۔

۴.۱۔ لباس کے انتخاب میں احتیاط:

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے جہاں خواتین میں سماجی شعور و بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی وہیں انھیں معاشرے کے اطوار سے متعارف کروانے کی کاوش بھی کی۔ اور نا صرف یہ بل کہ انھوں نے ان خواتین کو ایسے امور سے منع کیا اور باز رہنے کا کہا جن سے ان کی شخصیت کا وقار کمزور پڑتا ہو۔

آصف جہاں بیگم نے خواتین کی ظاہری آرائش و زیبائش کے ساتھ ساتھ شخصیت کے وقار کی اہمیت کو باور کروایا۔ ہندوستانی خواتین کو یہ تلقین کی کہ محض مہنگا لباس شخصیت کو زینت نہیں بخشتا بل کہ انسان کی شخصیت سے مطابقت رکھنے والا لباس ہی شخصیت کے نکھار اور وقار میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ شاید قیمتی لباس زیب تن کیا جانا ہی اچھا دکھتا ہے لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے یہ محض یہ خام خیالی ہے۔ اس حوالے سے خواتین کو تلقین کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں کہ:

> لباس کا انتخاب کرتے وقت بہنوں کو احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ اور ایسا لباس خریدنا چاہیے جو ان پر اچھا معلوم ہو کیوں کہ بعض وقت بہنیں اتنے بے جوڑ کپڑے پہن لیتی ہیں کہ لباس چاہے کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو بھدا معلوم ہوتا ہے۔ لباس کی خوبصورتی کے لیے زیادہ روپے کی ضرورت نہیں بل کہ صرف احتیاط درکار ہے یہ کوئی ضروری نہیں۔ کہ اگر لباس قیمتی ہو گا تو خوبصورت بھی ہو گا۔ ورنہ نہیں۔۔۔"[۱۳]

غ۔ ج بیگم نے اپنے مضمون "لباس" میں لباس کی اہمیت پر بات کی ہے۔ ان کے مطابق لباس کا انتخاب

کرتے ہوئے جہاں اور بہت سی احتیاط سے کام لینا چاہیے وہاں اس امر کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ وہ کسی دوسرے کی نقل میں ایسا لباس نا پہن لیں جو ان کی ذات اور قوم کے تشخص کے خلاف جاتا ہو۔ انھوں نے اپنے مضمون میں سلطانہ بیگم کے مضمون کی عبارت یوں درج کی ہے:

> ۔۔۔اگر کسی قوم کی وضع اختیار کرے تو جوان میں شریف بڑے لوگوں کی وضع ہو وہ اپنے لیے پسند کرے۔ یہ نہیں کہ پسندیدہ اقوام کے ادنیٰ درجے کا لباس اختیار کر لیں۔ جس سے اپنی وضع اور بھی خراب ہو جاتی ہے اور وہ لوگ بھی حقیر جانے جاتے ہیں۔[۱۴]

لباس کے انتخاب سے متعلق احتیاط کے حوالے سے فاطمہ بنت کے محمد حسین نے اپنے خیالات کا اظہار "ہمارا لباس"[۱۵] میں مفصل انداز میں کیا ہے۔ اسی طرح سلطانہ فیضی نے اپنے مضمون "مشنری بیبیاں" میں اپنے تجربات کی روشنی میں لباس کے انتخاب میں کی جانے والی احتیاط کا تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے اس ضمن میں یہ باور کروانے کی سعی کی ہے کہ مخلوط تہذیب میں رہتے ہوئے مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنا تشخص بر قرار رکھیں، اور اس امتیاز کو بر قرار رکھنے میں لباس اہم کردار ادا کرتا ہے۔ انسان کے افکار و نظریات تو اس سے تکلم کے بعد عیاں ہوتے ہیں لیکن لباس اور ظاہری وضع قطع انسان کے ابتدائی تعارف اور تشخص کو واضح کرنے میں لباس کا ایک اہم کردار ہے۔ اسی لیے ضروری ہے کہ اپنی انفرادیت کی بقا کے لیے لباس کے انتخاب میں احتیاط برتیں تا کہ بطور مسلمان ہماری انفرادی پہچان قائم رہے۔[۱۶] اس ضمن میں لکھے گئے دیگر مضامین میں درج ذیل شامل ہیں:

مضمون نگار	مضمون کا عنوان
مسز نیاز صابر	لڑکیوں کا لباس[۱۷]
ثریا پروین	لباس[۱۸]
مسز عبد الغنی	مسلم خواتین کا لباس[۱۹]
صالحہ خاتون دسنوی	لباس کی تخصیص[۲۰]
سیدہ فضیلت	ہمارا لباس[۲۱]
خورشید بیگم	لباس[۲۲]

۲۔ اقدار و روایات کا تحفظ اور بقا:

نو آبادیاتی عہد میں چوں کہ انگریز خواتین بھی بیشتر ہندوستانی خواتین کی توجہ کا مرکز رہیں اور ان سے انھوں نے بہت کچھ اچھا سیکھا بھی لیکن ان خواتین نے مغرب کی اندھا دھن تقلید سے اجتناب کا درس دیا اور یہ باور کروانے

کی کوشش کی کہ ہم ہندوستانی خواتین اپنے رسوم و رواج اور مذہب و عقیدہ کی وجہ سے مغرب کی اندھا دھن تقلید کریں گے تو محض رسوا ہوں گے۔ ان کے تہذیب کی تمام تر چیزیں ہمارے لیے موزوں نہیں ہیں اس لیے اپنی حدود و قیود میں رہتے ہوئے کسی حد تک کی پیروی تو کی جا سکتی ہے لیکن جوں کا توں اس تہذیب و معاشرت اور انداز کو اپنا لینا کسی طور مناسب نہیں ہے۔ "کسی قوم کی مخصوص ثقافت کا کسی دوسری قوم کی ثقافت میں گم ہو جانا، اس قوم کی موت کا اعلان ہے اس قوم کو خواہ دوسرے اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں، لیکن وہ نہ ہی کوئی حرکت کر سکتی ہے اور نہ ہی اسے اپنے وجود کا احساس ہوتا ہے۔" [۲۳]

۱۔۲۔ اقدار و روایات کا تحفظ:

اسلامی معاشرے کی بنیاد باہمی محبت، اخوت، مساوات، عزت و تکریم اور اخلاقیات پر استوار ہے۔ جس میں پیغمبران اور انبیا کرام کے ذریعے معاشرے کو بہتر بنانے کی تعلیمات بہم پہنچائی گئیں تا کہ معاشرہ بگاڑ کا شکار نہ ہو جائے۔ لیکن ہندوستان کی مخلوط تہذیب کے نتیجے میں اسلامی تعلیمات اور عقائد کی بنیادیں ہل کر رہ گئیں اور معاشرہ عدم توازن کا شکار ہو گیا۔ جب بیداری نسواں کی تحریک کا عروج ہوا تو خواتین کو ان کے بنیادی حقوق ملنا شروع ہو گئے لیکن کچھ ہی عرصے میں خواتین اس میں توازن برقرار نہ رکھ سکیں تو ان کی بہتری کے لیے ایسے مضامین لکھے گئے جن سے ان میں شعور پیدا ہو اور وہ معاشرے کا ایک پر وقار فرد بن کر اپنی صلاحیتوں کا اظہار کر سکیں۔ بعض کم علم خواتین نے آزادی کو منفی سمت میں لیا اور ہر قسم کی آزادی اپنے لیے بہتر سمجھی جس میں لباس، رہن سہن اور رکھ رکھاؤ سبھی شامل ہیں۔ انہی خواتین کے لیے ایسے متعدد مضامین شائع کیے گئے تا کہ ان کی اصلاح کی جا سکے۔ اسی سلسلے میں خدیجۃ الکبریٰ کا مضمون "اصلاح معاشرت" خاص اہمیت کا حامل ہے۔ جس میں خواتین کو نقصان سے بچانے کی سعی کی گئی ہے۔

> معاشرتی انقلاب میں سب سے زیادہ نقصان مسلمان خواتین کو پر تکلف لباس اور جدید زیورات سے پہنچ رہا ہے۔ نقصان سے میری مراد صرف مالی نقصان نہیں بل کہ اخلاقی تنزل مراد ہے۔ جس نے ہماری زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔۔۔۔" [۲۴]

ان مصنفین نے خواتین میں یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ محض لباس اور زیورات انسان کی توقیر میں اضافہ نہیں کرتے بل کہ اعلیٰ اقدار اور مثبت انداز نظر ہی انسان کی اصل میراث ہیں۔ انسان کی شخصیت کا اصل وقار اس کی بات چیت اور افکار سے ہوتا ہے۔ افکار کا رخ جس قدر مثبت ہو گا اس کی شخصیت اسی قدر نمایاں ہو گی۔

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے مستورات میں شعور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ دوسری تہذیب کی وہ چیزیں جن کی چمک نے ان کی آنکھوں کو خیرا کر دیا ہے محض ایک سراب ہیں۔ اور ان کے قبول کرنے

سے محض اسلامی اور سماجی اقدار کمزور پڑتی ہیں اس لیے چاہیے کہ کسی بھی عادت کو اپنانے سے پہلے اس کے اچھے برے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا جائے اور اگر اس میں کوئی بھلائی محسوس ہو تو ضرور اپنائیں ورنہ اپنی تہذیب کو مسخ کرنے اور اسلامی احکامات سے روگردانی کی مرتکب نہ ہوں۔ جمیلہ بیگم نے اس سلسلے میں مغربی خواتین کی پیروکار ان خواتین کو تنبیہ کی ہے جو محض تقلید اور فیشن کے شوق میں تمباکو نوشی شروع کر دیتی ہیں، جس کی اجازت ان کے اپنے مذہب میں نہیں ہے کیوں کہ نشہ یا کسی بھی ایسی بری عادت کی مذہب سراسر ممانعت کرتا ہے۔ جمیلہ بیگم کے مطابق:

> وہ خواتین جو محض فیشن یا صرف شوق کی وجہ سے تمباکو نوشی اختیار کر چکی ہیں۔ اپنی قوت ارادی سے کام لے کر اس بری عادت کو ترک کرنے کا تہیہ کر لیں۔ کیوں کہ یہ ان کی اپنی تندرستی اور ان کے بچوں کی صحت کے لیے سخت ضرر رساں ہے۔[۲۵]

رضیہ دلشاد بیگم نے اپنے مضمون "آج کل کی فیشن پرستی"[۲۶] میں ہندوستانی افراد کی انگریزی معاشرت کی تقلید کی مذمت کی ہے۔ ان کے مطابق ہندوستان کے زیادہ تر افراد انگریزی زبان، لباس اور مغرب طرز معاشرت کے اسیر اور دلدادہ ہیں اور اور اس کی تقلید بھی کر رہے ہیں۔ ان کے مطابق اس درجہ تقلید اپنی روایات کی بقا کے لیے ایک خطرہ ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا ضروری قرار دیا لیکن اس کی اندھا دھند تقلید پر اعتراض کیا کیوں کہ اس سے اپنی روایات دم توڑتی ہیں اور اپنا تشخص پائمال ہو جاتا ہے۔ ضرورت کے تحت کسی قوم کی ضروری چیزوں کو اپنانا غلط نہیں ہے لیکن اس حد تک اپنانا کہ اپنی انفرادیت قائم نہ رہے یہ غلط ہے۔

تہذیب نسواں میں ایسے مضامین بھی لکھے گئے جن کے ذریعے خواتین میں روایات کی بقا اور رسوم ورواج کی ضرورت کو سراہا گیا۔ جدید رویوں کی اسیری سے بہت سے ہندوستانی گھرانوں میں جدت پسندی کا شوق پیدا ہوا تو ایسی رسوم سے احتراز کیا گیا جو ان کی روایات اور تہذیب کی نمائندہ تھیں۔ ان مصنفین نے ان رسومات کو ترک کرنے کی ممانعت کی جو ان کی روایات کی بقا کی ضامن ہیں۔ زرینہ خاتون نے اسی ضمن میں اپنے افکار کی ترسیل "ترک رسوم"[۲۷] میں کی۔ انھوں نے فرسودہ رسومات کو ترک کرنے کی تاکید ضرور کی لیکن اپنی روایات سے یکسر لاتعلق ہونے پر افسرگی کا اظہار بھی کیا۔ انھوں نے فرسودہ رسومات کی جگہ ایسی رسومات کے جاری کرنے کو ضروری قرار دیا جس سے دنیاوی نفع کے ساتھ ساتھ دینوی فائدہ بھی حاصل ہو۔

۴.۲۔ مغرب کی بے جا تقلید سے گریز:

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے روایات کی پاسداری کے ساتھ ساتھ غیر تہذیب کی اندھا دھند تقلید سے اجتناب کرنے کی تلقین کی۔ ان کے مطابق دوسری تہذیب کو جوں کا توں قبول نہیں کرنا چاہیے بل

کہ ضروری چیزوں کو اپنانا اور غیر ضروری اور نقصان دہ کو رد کر دینا چاہیے۔ الفش بے فیلسی نے اپنے مضمون "تہذیب اور تنہائی"[۲۶] میں مغربی تہذیب اور رہن سہن کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ ان کے مطابق ہمیں مغربی اطوار کو جوں کا توں نہیں قبول کرنا چاہیے بل کہ ضروری ہے کہ ہم اپنے سماج سے ہم آہنگ ہونے والی اشیا اور اطوار کو ہی قبول کریں۔ انھوں نے اپنے مضمون میں قدیم ہندوستانی معاشرتی رویوں اور رکھ رکھاؤ سے جدید نو آبادیاتی طرز معاشرت کا تقابل کیا ہے اور ہندوستانی تہذیب کے اہم پہلوؤں کو اپنانے پر زور دیا ہے۔

ان مصنفین نے ان ہندوستانی خواتین کو ہدف تنقید بنایا جو مغربی خواتین کے زیر اثر آکر اپنی روایات اور کلچر کو حقیر جاننے لگتی ہیں۔ م۔خ بدایونی نے اپنے مضمون "پردہ کی عزت" میں ہندوستانی خواتین پر یہ حقیقت آشکار کرنا چاہی ہے کہ جن خواتین کی تقلید میں وہ اپنی روایات سے منحرف ہوتی ہیں وہ خواتین از خود ان کے فیشن اور کلچر کو پسند کرتی ہیں۔ یہاں انھوں نے ہندوستانی ذہنیت پر بھی تنقید کی ہے کہ یہاں کے لوگ باہر کی چکا چوند سے اس قدر متاثر ہو جاتے ہیں کہ انھیں اپنی تہذیب کی تمام تر خوبصورتی اور دلکشی اس کے مقابلے میں کم دکھنے لگتی ہے۔ اس کی مثال درج ذیل اقتباس سے ملتی ہے:

> نہایت افسوس ہے کہ بعض بہنیں یورپین لیڈیوں کی تقلید کے شوق میں اپنے پردے کو حقارت سے دیکھتی ہیں۔ میں یورپین لیڈیز سے ملتی رہتی ہوں۔ اور مجھے اکثر ان سے پردے کے متعلق گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ جہاں تک میں نے دیکھا ہے سمجھ دار یورپین بہنیں ہمارے پردے کو بہت عزت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔[۲۸]

مغرب کی بے جا تقلید سے ہندوستانی معاشرہ عدم توازن کا شکار ہو گیا۔ ان کی پیروی میں ہندوستانی فرد اپنی روایات اور اخلاقیات سے منحرف ہو گیا اور وہاں کے کلچر کو اپنانے میں بڑائی سمجھی۔ جس سے اخلاقی اقدار زوال پذیر ہوئی اور فرد انتشار کا شکار ہو گیا۔ ان مصنفین نے ایسی معاشرتی برائیوں کو ختم کرنے کی کوشش کی جو فرد کو منتشر کر رہی تھیں۔ بیگم یار محمد خاں نے اپنے مضمون "بیجا انگریزی تقلید" میں ایسی ہی معاشرتی برائیوں کا تذکرہ کیا ہے جو مغرب کی تقلید سے ہمارے معاشرے میں در آئی ہیں اور ہماری سماجی ڈھانچے کو کمزور کر رہی ہیں۔[۲۹]

سردار محمدی بیگم نے اپنے مضمون "معصوم بچوں کے حق پر ڈاکہ"[۳۰] میں مغرب کے بے جا تقلید کی مخالفت کی۔ اس مضمون میں انھوں نے ان خواتین کی سوچ کو ہدفِ تنقید بنایا جو انگریزی خواتین کی پیروی میں اپنے بچوں کی نشو و نما اور تربیت کا خیال نہیں کرتیں اور اس ذمہ داری کو ایک بوجھ کی مانند دوسرے پر لادنے کی فکر میں ہیں۔ انھوں نے ان خواتین کو یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ کوئی بھی خدمت گزار ان کے بچے کی ویسی تربیت نہیں کر سکتا جیسے ایک ماں کرتی ہے۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ بچوں کی پرورش ایسے نقوش پر کی جائے کہ وہ سماج میں ایک

بہتر فرد کے طور پر ابھریں اور آئندہ زندگی میں خود اعتمادی کے ساتھ اپنے معاملات و مسائل سے نبرد آزما ہو سکیں۔

زہرا بیگم نے بھی اسی ضمن میں ہندوستان کے لوگوں کی عادات و خصائل کو موضوع بنایا ہے۔جو جدید تہذیب کے اثر کو اس حد تک قبول کر چکے ہیں کہ روایات سے کوسوں دور آن پہنچے ہیں۔ان کے مطابق ہندوستان کی عوام نے نئی تہذیب کی اچھی باتیں نظر انداز کرتے ہوئے بری باتیں اختیار کر لی ہیں۔ تقلید کے دوران ان لوگوں کو یہ خیال بھی نہیں رہا کہ کن چیزوں کو اختیار کرنا درست ہے اور کن کو نہیں۔اس کا اظہار ان کے مضمون "ہندوستانیوں کی بعض عادتیں"[۳۱] میں کیا گیا ہے۔

امۃ الرؤف نے بھی اسی نظریے کے تحت اپنے افکار کی ترسیل کی۔انھوں نے اس حوالے سے آگاہ کرنے کی کوشش کی کہ مسلمان اپنا ایک الگ تشخص اور منفرد تمدن لے کر آئے تھے۔ان کا طرزِ معاشرت ہمیشہ دوسری اقوام سے منفرد رہا ہے لیکن جدیدیت کی لہر میں لپیٹ میں کچھ خواتین نے یہ فرق مٹانے کی کوشش کی۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنی قومیت کو زندہ رکھیں وہ اس سے گریزاں ہیں۔ کسی قوم کی بد قسمتی کے لیے یہ کافی ہوتا ہے کہ وہ غیر تہذیب کو اپنا سمجھے اور اپنی اپنی تہذیب سے بیگانہ ہو جائے۔ بعض افراد کی وجہ سے یہی حال اسلامی تہذیب کا ہوتا جا رہا ہے۔ جس سے اندیشہ ہے کہ ہماری صدیوں کی روایات برائے نام رہ جائیں گی اور ہم اپنا تشخص کھو بیٹھیں گے۔ اگر کسی دوسری تہذیب کی تقلید کرنی ہی ہے تو وہ تعمیری ہونی چاہیے نہ کہ اس سے اپنی روایات و اقدار کی تخریب کر دی جائے۔ان کے مطابق یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم بنا سوچے سمجھے نمود و نمائش اور ظاہری چکاچوند سے متاثر ہو کر ان کی تقلید شروع کر دیں اور اس کے اصل فکری رویوں کو بالائے طاق رکھ دیں۔ان نظریات کی ترسیل ان کے مضمون "مسلم خواتین کا لباس"[۳۲] میں کی گئی ہے۔ بلقیس صمد بیگم نے "مسلم خواتین کا لباس"[۳۳] اور شاہزادجہاں بیگم نے غیر مذہب کے لوگوں سے مراسم "[۳۴] میں انہی نظریات کی پیشکش کی ہے۔

۳۔ اخلاقیات، عادات و اطوار کے سلسلے میں اسلامی روایات کی پاسداری:

اسلام ایک مکمل نظام زندگی واضح کرتا ہے جس میں تمام افراد کے حقوق و فرائض متعین کیے گئے ہیں تا کہ کسی ایک فرد کی بھی دل شکنی و دل آزاری نہ ہو۔اسلام میں رشتے کے تقدس اور احترام کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ہندوستانی مستورات میں جب وقتی تقاضوں کے مطابق ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ اپنی روایات اور اخلاقیات سے بے بہرہ ہو گئی۔جو اسلامی معاشرت کا خاصا ہیں۔اسلام میں خاندانی نظام کو خاص اہمیت حاصل ہے اور اس نظام کو بہتر طریقے سے چلانے کے لیے اخوت، مساوات، محبت اور بھائی چارہ مسلم حقیقتیں ہیں۔دوسری طرف مغربی تہذیب کی ظاہری چکاچوند میں اس نظام کی کوئی حیثیت نہیں ہے بل کہ فرد ایک دوسرے سے بیگانہ اور اپنے

دھن میں مگن ہے۔ مغرب کے یہ اثرات ہندوستانی تہذیب پر بھی پڑے اور یہاں کے لوگوں میں بھی خاندانی نظام کے خلاف بغاوت پیدا ہوگئی۔ اسی مسئلے کے پیش نظر تہذیب نسواں کی مصنفین نے انھیں اپنی اقدار واخلاقیات یاد دلائی اور اسلام کے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کی تلقین کی اس حوالے سے فاطمہ صغرا بیگم لکھتی ہیں کہ:

> مردوں اور عورتوں کی معاشرت جدا جدا نہیں ہے بل کہ ایک ہے۔اور دونوں سے وابستہ ہے۔ آج کل جس قدر کمزوریاں پائی جاتی ہیں، ان سے نہ ایک بری نہ دوسرا مورد الزام۔ ہر ایک خاندان عجیب تنازعات کا شکار نظر آتا ہے۔۔۔۔ہماری خود غرضی اور غفلت نے ہمیں برباد کر دیا۔خود غرضی نہیں بل کہ یہ خود فراموشی ہے۔ہم اپنے آپ کو بھی بھول گئے۔دوسروں کے حقوق کا خیال رکھنا تو کیا معنی۔اخلاقی حالت اس قدر کمزور ہے کہ حسن سلوک کا نام نہیں رہا۔غیر تو غیر اپنوں میں نہیں بنتی۔والدین سے اولاد بدگمان ہیں۔اولاد والدین سے کشیدہ ہے۔بیوی کے دل میں شوہر کی عظمت نہیں۔شوہر کے نزدیک بیوی کی خاک وقعت نہیں۔ساس کو بہو پر اعتراض ہے۔بہو ساس کی شاکی ہے۔نند کو بھاوج پر اعتماد نہیں۔بھاوج کو نند سے سروکار نہیں۔بھائی کو بہن سے تعلق نہیں۔بہن کو بھائی سے محبت نہیں۔غرض آج کل کی دنیا کا تو کچھ باوا آدم ہی نرالا ہے۔[۳۵]

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے ہندوستانی مستورات کی اخلاقی کمزوریوں کو مد نظر رکھتے ہوئے انھیں تلقین کی کہ وہ خود پرستی اور خود پسندی جیسی بیماریوں میں مبتلا نہ ہوں۔ بل کہ اپنے اچھے اخلاق سے معاملات زندگی کو بہتر بنائیں۔ان مصنفین نے خواتین کو اسلامی شعار کے مطابق اپنی زندگی گزارنے اور نیک عمل کرنے کی ترغیب دی۔ انھوں نے خاص طور پر ان خواتین کو مخاطب کیا جو دوسری تہذیب کی خواتین سے میل جول کے بعد ان کی روایات اور طرز زندگی سے مرعوب ہو کر اسی سانچے میں ڈھلنا شروع ہوگئی تھی۔ بلقیس بانو نے اسی ضمن میں خواتین کو مخاطب کرتے ہوئے یہ تلقین کی کہ افراط و تفریط سے بچیں اور اسلامی تعلیمات اور خاندانی روایات کو ترک نہ کریں۔ دوسری تہذیب سے کوئی اچھی چیز سیکھیں بھی تو خذ من زمانک ما صفا ودع الذی فیہ الکدر[۳۶] کا خاص خیال رکھیں۔یعنی زمانے کی اچھی چیزیں اپنالیں اور خراب چیزیں چھوڑ دیں اور تمام معاملات کو تقدیر کے حوالے کر دیں۔ انھوں نے غیر تہذیب کی چیزیوں کو من وعن قبول کرنے کی بجائے اپنی اسلامی روایات کو ترجیح دینے کی تلقین کی۔

و۔ا نے بھی اپنے مضامین کے ذریعے خواتین کی اخلاقی تربیت کی کوشش کی۔ انھوں نے خواتین کو تاکید کی کہ وہ کسی دوسرے شخص کے ظاہری خدوخال، وضع قطع کے بارے میں قیاس آرائیاں نہ کریں بل کہ اسے بحیثیت

انسان اپنی کسوٹی پر پرکھیں اور یہ دیکھیں کہ وہ انسانیت کے کس درجے پر فائز ہے۔ ظاہر تو ایک سراب کی مانند ہے جو بعد ازاں غلط ثابت ہوتا ہے۔ ان خیالات کی عکاسی ان کے مضمون "ہنسیے نہیں"[۳۷] میں موثر انداز میں کی گئی ہے۔

آنسہ سروری مصطفیٰ نے خواتین کی شخصیت کے وقار کی اہمیت کے حوالے سے اپنے نظریات "تیز مزاج لڑکیاں"[۳۸] میں کی ان کے مطابق لڑکیوں کو چاہیے کہ وہ اپنی عادات، اطوار اور برتاؤ سے اپنی ذات کی بہتری کی کوشش کریں۔ اس ضمن میں انھوں نے عام انسان اور پڑھے لکھے باشعور انسان کے موازنے سے یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ انسان کے افعال و افکار اس کی شخصیت کا پر تو ہوتے ہیں۔ اس لیے اپنے عمل و فعل سے کوشش کرنی چاہیے کہ ان کی شخصیت کا وقار قائم رہے نہ یہ کہ عام ان پڑھ انسان کی طرح ہر معاملے میں ایسا برتاؤ کریں کہ ان کی قابلیت مشکوک ہو جائے۔

شاہزادہ جہاں بیگم نے اپنے مضمون "چھچھورپن"[۳۹] میں انسانی اخلاقیات، عادات و اطوار کے حوالے سے اپنے افکار پیش کیے۔ ان کے مطابق انسان کو اپنی عمر کے مطابق برتاؤ کرنا چاہیے۔ اگر اپنے مرتبے کے مطابق انسان میں صبر و استقلال، بردباری، ایمان داری، دیانتداری، سنجیدگی اور شائستگی جیسے اوصاف نہیں ہوں گے تو اسے کبھی وہ عزت و توقیر نہیں مل سکتی جو ضروری ہے۔ اس لیے اپنی شخصیت کو پر وقار بنانے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی عمر کی مناسبت سے افعال کرے تاکہ اسے مہذب فرد کی حیثیت سے مناسب توقیر حاصل ہو سکے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو چھچھورپن کو اس کی ذات سے منسوب کر کے بے وقعت کر دیا جائے گا۔ اس حوالے سے لکھے گئے دیگر مضامین میں درج ذیل شامل ہیں:

مضمون نگار	مضمون کا عنوان
آر۔ کے	حسنِ اخلاق[۴۰]
م۔ن بیگم	اسلامی زندگی[۴۱]
میمونہ بیگم	عجز و انکساری[۴۲]
گیتی آرا بیگم	اسلام میں رواداری[۴۳]
اہلیہ خواجہ حسین علی	تحمل[۴۴]

۱۔۳۔ گفت و شنید کے آداب:

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے ہندوستانی مستورات کو وقتی تقاضوں کے مطابق باشعور بنانے کی کوشش کی۔ جس میں بات چیت اور گفتگو کے طریقے پر بطور خاص توجہ دی گئی۔ انسان کی بول چال اس کی شخصیت

کی عکاسی کرتی ہے اس لیے بات کرتے ہوئے خاص طور پر اس امر کا خیال رکھنا چاہیے کہ ان کی شخصیت کا مثبت رخ سامنے آئے۔ اگر کوئی ایسی صورت حال در پیش آجائے جہاں کسی سے مخاطب ہونا اپنی ذات کے لیے کسی شرمندگی یا شرمساری کا باعث بن رہا ہو تو کوشش کرنی چاہیے وہاں گفتگو کا سلسلہ جاری نہ رکھا جائے۔ اس ضمن میں بنت شیخ فضل الٰہی یوں رقمطراز ہیں:

> ۔۔۔ ہمیں سچ بات کے ظاہر کرنے میں ذرا بھی تامل نہ کرنا چاہیے۔ بل کہ ہر ایک امر پر خوب غور کر کے جب اس کا حسن اور قبیح معلوم ہو جائے تو پھر نہ ان جاہل عورتوں کی طرح اناپ شناپ بکنا چاہیے۔ بل کہ جہاں جہاں ان کے دلائل غلط ہوں ان کو پکڑ کر نہایت نرمی سے ان کا جواب دینا چاہیے۔ اگر نہ سنیں اور ہنسی اڑائیں تو ان کے واہیات خیالات کا اظہار سننا ہی نہ چاہیے۔ اور فوراً ان سے علیحدہ ہو جانا بہتر ہے۔[۴۵]

و۔ابات چیت کے دوران محتاط رویہ رکھنے کے حق میں ہیں۔ ان کے مطابق سوچ سمجھ کر ناپ تول کر بولنے میں ہی انسان کی بھلائی پوشیدہ ہے۔ جو شخص جس قدر محتاط انداز میں بات چیت کرے گا وہ اسی قدر کامیاب رہے گا۔ بعض اوقات نا چاہتے ہوئے بھی انسان کسی کی دل آزاری کا سبب بن جاتا ہے لیکن اگر بات کو ناپ تول کر کیا جائے تو اس کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ آداب گفتگو کے حوالے سے انھوں نے اپنے خیالات یوں رقم کیے ہیں:

> جو بہنیں بات چیت میں محتاط ہوتی ہیں وہ اپنی ملنے جلنے والیوں میں بہت مقبول ہوتی ہیں۔ اور اگر کسی نئی جگہ جائیں تو بڑی جلدی ان کی ملاقات کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ صورت شکل اور ظاہری وضع قطع کے بعد دوسرا نمبر زبان ہی کا ہے۔ جس سے انسان کی نسبت کوئی رائے قائم کی جاتی ہے اور اکثر وہ صحیح بھی ہوتی ہے۔۔۔[۴۶]

صالحہ خاتون اپنے مضمون "پل صراط"[۴۷] میں شخصی رویوں کو موضوع بناتے ہوئے سماجی اصلاح کی کوشش کرتی ہیں یہاں اسلامی عقائد زیادہ واضح نظر آتے ہیں ان کے مطابق ہمیں کسی کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر تنقید کر کے اس کی زندگی مشکل نہیں کرنی چاہیے۔ بل کہ اسلامی اصول و ضوابط کے مطابق کسی دوسرے کے لیے حتی المقدور آسانیاں پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اسلام تو مذہب ہی محبت کا ہے اور اگر ہمارے قول سے کسی کی دل آزاری ہو رہی ہے تو ہم اسلامی اصولوں سے انحراف کر رہے ہیں۔

ان مضامین میں خواتین کو نرم لہجہ رکھنے کی بھی تلقین کی گئی۔ اور ایسے الفاظ کے استعمال سے اجتناب کرنے کو کہا گیا جو کسی کی دل آزاری کا باعث بنیں۔ چوں کہ روایتی گھروں میں سماجی زندگی سے متعلقہ تربیت نہیں کی جاتی ،اس لیے تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے اس کمی کو پورا کرنے کی بھرپور کوشش کی اور اس میں وہ

کامیاب ہوئیں۔

> ۔۔۔گرم مزاجی کی وجہ سے ہر گز کوئی کام ویسی خوبی کے ساتھ نہیں نکلتا جیسا خوش اخلاقی اور تحمل کے ساتھ نکلتا ہے۔ بل کہ یوں کہنا چاہیے کہ گرم مزاجی کے سبب سے اکثر بنا ہوا کام بگڑ جاتا ہے۔اور دوسرے نقصان یہ ہوتا ہے کہ گرم مزاجی کے باعث ہمارے چال چلن میں ناشائستگی ،بد تہذیبی اور درشتی پیدا ہو جاتی ہے۔۔۔"[۴۸]

م۔ن بیگم آداب گفتگو سے خواتین کو یوں متعارف کرواتے ہوئے لکھتی ہیں "انسان کو لازم ہے کہ بات سنجیدہ کہے اور جو کہے اس کو پہلے خوب سوچ لے حکیم سے لوگوں نے کہا کہ آپ ہیں تو بڑے حکیم اور دانشمند لیکن آپ میں یہ سخت عیب ہے کہ آپ بہت دیر میں بات کرتے ہیں کہ سننے والا گھبرا جاتا ہے۔انھوں نے جواب دیا کہ غور اور فکر کرنا اس بارے میں کہ کیا کروں اور کیا کہوں۔اس شرمساری سے بہتر ہے کہ افسوس میں نے کیا کیا اور کیا کہا۔"[۴۳] اہلیہ سید احمد سبزواری اپنے مضمون "صاف بیانی" میں انہی افکار کا پرچار کرتی نظر آتی ہیں۔[۴۹]

الف۔ن بیگم نے اپنے مضمون "گفتگو کے آداب" میں آداب گفتگو کے حوالے سے خواتین کی تربیت کی کوشش کی۔انھوں نے آداب محفل کے ضمن میں جن باتوں کا خیال رکھنے کی تعلیم دی ان میں درج ذیل شامل ہیں:

۱۔ جب کوئی دوسرا شخص مخاطب ہو یا خود کسی دوسرے کو مخاطب کریں تو خاموشی کے ساتھ بات سنیں۔اور جب تک بات ختم نہ ہو جائے درمیان میں نہ بولیں۔

۲۔ اگر کئی بہنیں ایک مجلس میں بیٹھی ہوں تو مناسب ہے کہ ہر ایک کو بات کرنے کا موقع دیا جائے نہ یہ کہ ایک ہی بہن بولتی رہے اور باقی سن منہ دیکھا کریں۔

۳۔ گفتگو مختصر ہو اور اس میں شیرینی ہونی چاہیے نہ اس قدر طویل کہ سننے والا اکتا جائے۔اور نہ ایسی مختصر کہ دوسرا بات ہی نہ سمجھ سکے۔

۴۔ باتوں اور انداز میں اکھڑاپن نہیں ہونا چاہیے۔

۵۔ گفتگو میں مختلف قسم کی باتیں ہونی چاہئیں صرف اپنے ہی گھر اور عزیزوں کی تعریف نہ کی جائے۔ضروری ہے کہ باتیں ایسے اشخاص کے متعلق ہوں جن کو سننے والے اچھی طرح جانتے ہوں۔واقعات بھی اس قدر عام نہ ہوں کہ بار بار سننے سے کوفت ہو بل کہ کوئی نئی بات ہونی چاہیے۔

۶۔ اپنی قابلیت جتانے کے لیے عمداً موٹے موٹے الفاظ کا استعمال نہیں کرنا چاہیے،بل کہ آسان اور شستہ زبان میں بات کرنی چاہیے۔بے موقع الفاظ کے استعمال سے بھی گریز کرنا چاہیے۔[۵۰]

سلطانہ نے اپنے مضمون "اخلاقی اصلاح"[۵۱] میں خواتین کی اخلاقی تربیت کی اہمیت پر زور دیا۔جس میں گفت

وشنید کے آداب، آداب نشست و برخاست اور طرز بود و باش کو بطور خاص موضوع بنایا گیا ہے۔ اسی طرح صغرا ہمایوں مرزا نے بھی خواتین کو آداب گفت وشنید کے حوالے سے تربیت دی۔ اس کا اظہار ان کے مضمون "کم سخنی" [۵۲] میں ہوتا ہے۔

بیگم ڈاکٹر ایوب خاں نے اپنے مضمون "نقص نکالنا" [۵۳] میں اسی طرح کے ایک رویے کا ذکر کیا ہے کہ جب چند خواتین کو باہم مل بیٹھنے کا موقع میسر آتا ہے تو وہ کسی نہ کسی کی عیب جوئی میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ نہ صرف عیب جوئی بل کہ ظاہری وضع قطع اور شکل وصورت کے نقائص بھی بیان کرنے لگتی ہیں جو کہ سراسر غلط ہے ایسا کرنا کسی بھی سمجھ بوجھ رکھنے والے انسان کو زیب نہیں دیتا۔ اس سے بات کرنے والی کی اپنی شخصیت چھوٹی لگنے لگتی ہے۔ اس لیے خواتین کو چاہیے کہ وہ دوران گفتگو کا ص احتیاط برتیں اور کسی کی شخصیت کو یا ظاہری وضع قطع کو ہدفِ تنقید نہ بنائیں۔

حجاب امتیاز علی کے مطابق مستورات کو چاہیے کہ کسی بھی محفل میں دوسرے شخص کو بات کرنے کا یکساں موقع فراہم کیا جائے نا صرف یہ بل کہ دورانِ گفتگو مختلف قسم کے موضوعات پر بات کی جانی چاہیے۔ ان کے مطابق ہندوستان کی محفلوں میں عام طور پر گنتی کے چند موضوعات پر ہی بات کی جاتی ہے۔ جن میں بیماری، نوکروں کی شکایت، اپنی عدم فرصتی کا رونا، مہمانوں سے بیزاری کا اظہار جن سب کا مقصد اپنی مظلومیت کا اظہار ہوتا ہے۔ خواتین کو چاہیے کہ جب کبھی باہم مل بیٹھنے کا موقع ملے تو محض گنے چنے موضوعات پر بات نہ کریں بل کہ مختلف موضوعات پر بات کرتے ہوئے ایک دوسرے کے نظریات جاننے اور ان سے استفادہ حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ انھوں نے خواتین کو یہ باور کروانے کی کوشش بھی کی کہ اگر اپنی یا اپنے کاندان کی بیماری یا پریشانی کا تذکرہ ناگزیر ہو تو اس کا تذکرہ مختصراً کر دینا مناسب ہے۔ کیونکہ اختصار کے ساتھ بیان سننے والے پر اکتاہٹ طاری نہیں ہونے دیتا اور سننے والا ہمدردی کے جذبات رکھتا ہے۔ اسی طرح مہمانوں اور گھریلو ذمہ داریوں اور مصروفیت کا تذکرہ بھی موزوں الفاظ میں کیا جانا چاہیے تاکہ سننے والا مرعوب ہو نہ یہ کہ بار بار کے بیان سے اسے الجھن محسوس ہونا شروع ہو جائے۔ اگر گھریلو مسائل کا ذکر کرنا ضروری ہو تو اسے ایسے الفاظ میں بیان کیا جائے کہ سننے والا اسے توجہ سے سن سکے نا یہ کہ وہ بد ظن ہو کر آئندہ ملاقات سے کترانے لگے۔ انھوں نے دورانِ ملاقات مثبت اور تعمیری پہلوؤں پر بات کرنے کو زیادہ بہتر قرار دیا۔ اس سے انسان کی شخصیت کا وقار بڑھتا ہے۔ [۵۴] جمیلہ بیگم کے مضامین "لوگوں سے حسن سلوک" [۵۵] اور "بد مزاجی" [۵۶] بھی انہی عوامل پر مشتمل ہیں۔

۲.۳۔ سماجی میل ملاپ کے آداب اور فوائد:

نو آبادیاتی ہندوستان میں چوں کہ عورت کا چار دیواری میں رہنے کا تصور عام تھا اس لیے خواتین کا خواتین سے بھی باہمی میل جول پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ عورتیں ایک دوسرے سے ملنے سے بھی قاصر تھیں۔ حالاں کہ سماجی میل ملاپ انسان کی سوچ اور طبیعت پر مثبت اثر چھوڑتا ہے۔ نا صرف یہ بل کہ ایک دوسرے سے ملنے کے بعد انسان ایک دوسرے کی اچھی عادات و خصائل کو بھی برتنے کی کوشش کرتا ہے جس سے نا صرف انسان کی ذات بل کہ گھریلو اور معاشرتی زندگی پر بھی مثبت اثر پڑتا ہے۔ اسی لیے تہذیب نسواں کی بہت سی خواتین نے اس مسئلے کی سنجیدگی کو سمجھتے ہوئے ایسے مضامین تحریر کیے جو عورتوں کے لیے مفید ثابت ہو سکیں۔ اور ان کے افکار کو بہتر کر سکیں اسی حوالے سے آصفہ خاتون کا مضمون "ملنا جلنا"[۵۷] خاص اہمیت کا حامل ہے. جس میں خواتین کی سماجی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے تعبیرات پیش کی گئی ہیں۔

اسی طرح ان مصنفین نے ہندوستانی معاشرے کے ماحول کو مد نظر رکھتے ہوئے خواتین کے لیے ایسی مجالس اور محفلوں کے آغاز کی حمایت کی جن سے ان میں شعور اور آگہی پیدا ہو سکے۔ بی جے بیگم نے "آگرہ میں زنانہ پردہ کلب کی ضرورت" کے عنوان سے ایک مضمون رقم کیا جس میں سماجی سرگرمی کی اہمیت اور اس کے مثبت اثرات پر روشنی ڈالی گئی۔"[۵۸]

نو آبادیاتی ہندوستان میں خواتین چوں کہ گھر گرہستی تک محدود تھی۔ باہر کی دنیا اور لوگوں سے میل ملاپ سے ان کا کوئی واسطہ نہ تھا۔ اس لیے جب تہذیب نسواں کا اجرا کیا گیا تو اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا کہ انھیں آداب گفتگو سکھائیں جائیں تا کہ جب وہ کسی سے ملیں تو ناگواری کا کوئی تاثر نہ پیدا ہونے پائے۔ تہذیب نسواں کی خاطر متعدد خواتین نے اس حوالے سے مضامین تحریر کیے۔ بنت فضل الرشید خاں اس حوالے حضرت موسیٰ سے ایک واقعہ یوں منسوب کرتی ہیں "برتن میں جو کچھ ہوتا ہے۔ وہی چھلکتا ہے۔ اس کے پاس سخت کلامی ہے۔ وہ اسی کو نکال رہا ہے۔ میرے پاس نرمی اور بردباری ہے میں وہی دکھا رہا ہوں۔"[۵۹]

اسی ضمن میں شہزاد جہاں نے "زنانہ تفریح گاہیں"[۶۰] کے عنوان سے اپنے خیالات قلم بند کیے۔ انھوں نے ہندوستانی خواتین کے لیے چار دیواری سے نکل کر تسخیر دنیا کرنا ضروری سمجھا۔ ان کے نزدیک ہندوستانی خواتین کی فرسودہ خیالی اور توہم پرستی کی ایک بڑی وجہ سماجی میل ملاپ کا نہ ہونا ہے۔ کیوں کہ کوئی بھی انسان اس وقت تک شعور حاصل نہیں کر سکتا جب تک اسے مناسب مواقع فراہم نہ کیے جائیں۔ شاہزادجہاں بیگم کے نزدیک ہندوستانی عورتوں کو جدید دور کے تقاضوں کے مطابق مہذب بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ایسی تفریح گاہوں کا اہتمام کیا

جائے جہاں انھیں دوسری خواتین سے میل ملاپ کے مواقع فراہم ہوں تا کہ وہ جدید صورت حال سے متعارف ہوں اور ان کی فکر کو ایک نئی سمت عطا ہو۔

شاہزادو جہاں بیگم نے باہمی معاملات کو بہتر بنانے کے موضوع پر بھی قلم اٹھایا۔ ان کے نزدیک بہت سے سماجی مسائل بے جا طرف داری کی وجہ سے جنم لیتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ حق بات کا ساتھ دیا جائے اور کسی تعلق کی بنا پر کسی دوسرے کی حق تلفی نہیں کرنی چاہیے۔ ان افکار کی ترسیل ان کے مضمون "طرف داری"[61] میں کی گئی ہے۔

محترمہ قرۃ العین نے بھی ایک ایسے ہی سماجی مسئلے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے شبہ کی بیماری میں مبتلا ان لوگوں پر تنقید کی ہے جنھیں ہر وقت ایسے وسوسے گھیرے رکھتے ہیں کہ دوسرے تمام افراد ان کے بارے میں کسی وہم میں مبتلا ہیں اور ان کی برائی میں مشغول ہیں۔ شبہ یا وہم انسان کی اپنی ذات کے لیے سخت نقصان دہ ہے۔ اس سے اس کی اپنی زندگی متاثر ہوتی ہے اور اس کی سوچ کبھی بھی مثبت نہیں رہتی۔ اس طرح وہ دوسروں سے بدگمان ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے لیے مشکل گھڑی کیے رکھتا ہے۔ انسانکو خود بھی دوسروں کے بارے میں اچھی رائے رکھنی چاہیے اور دوسروں کو بھی اپنی ذات سے فائدہ دینا چاہیے۔ ان کے افکار کی وضاحت ان کے مضمون "شبہ" مصنفہ نے جہاں خواتین کے حقوق کی بات کی وہیں وہ انھیں ان کے بنیادی انسانی فرائض کی انجام دہی کی تلقین کرتی بھی نظر آتی ہیں۔ انھوں نے معاشرتی مسائل کی ایک وجہ ناجائز طرف داری کو قرار دیا۔ ان کے خیال میں جب کسی مسئلے کے محض ایک پہلو کو دیکھا جارہا ہو تو وہی درست نظر آتا ہے ایسا کرنا درست نہیں ہے۔ بل کہ کسی بھی معاملے کو بہتر طور پر سلجھانے کے لیے ہر پہلو کا جائزہ لے کر معاملہ حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس طرح کسی ایک فریق کی حق تلفی بھی نہیں ہوتی اور معاملہ بھی بہتر طور پر حل ہو جاتا ہے۔ ان افکار کی ترسیل ان کے مضمون "شبہ"[62] میں کی گئی ہے۔ ان ک نزدیک شبہ ایک ایسی بیماری ہے جس کا علاج دنیا کے کسی حکیم کے پاس نہیں ہے۔ اس لیے حتیٰ المقدور اس سے باز رہنا چاہیے۔

ب۔ج۔ نے سماجی میل ملاپ کو شعور و آگہی میں اضافے کے لیے ضروری قرار دیا۔ ان کے مطابق خواتین ہند کے لیے ایسے مراکز کا قیام عمل میں لانا ضروری ہے جہاں یک جا ہو کر وہ ضروری مسائل پر گفت و شنید اور تبادلہ خیال کر سکیں۔ تبادلہ خیال سے نا صرف انسان کے افکار و نظریات میں وسعت پیدا ہوتی ہے بل کہ بہت سی پیچیدہ گتھیاں بھی سلجھ جاتی ہیں۔ باہمی میل جول اور ایک دوسرے کے تجربات کی روشنی میں انسان اپنے حالات و معاملات کو سلجھانے کی قابلیت بھی حاصل کر لیتا ہے۔ اس فکر کا اظہار ان کے مضمون "تبادلہ خیال"[63] میں کیا گیا۔

تہذیب نسواں کی مصنفین نے جہاں عورتوں کے سماجی میل ملاپ کی اہمیت اور افادیت اجاگر کرنے کی

کوشش کی وہیں انھیں آداب معاشرت سکھانے کی سعی بھی کی۔ ان مصنفین نے اپنی تحریروں میں عورتوں کو میل ملاپ کے اطوار اور آداب سکھانے کے لیے ایسے مضامین لکھے جن سے ہندوستانی مستورات میں یہ شعور پیدا ہو سکے کہ میل ملاپ کے دوران کن معاملات کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ جس میں سب سے زیادہ اہمیت اس مسئلے کو دی گئی کہ اپنی ذات کی خوشی کی خاطر کسی دوسرے کے لیے مشکل کا باعث نہ بن جائیں۔ ان خواتین مصنفین نے کسی کسی کے گھر جانے سے پہلے اجازات لینے، قبل از روانگی اطلاع دینے، قیام کے دوران وقت اور دوسرے کی سہولت کا خیال رکھنے اور دوران ملاقات کسی ایسی بات کرنے سے ممانعت کی تلقین، جو دوسرے کی دل آزاری کا باعث بنے جیسے موضوعات پر بھی اپنے افکار کی ترسیل کی۔ اس حوالے سے اکبر بانو کا مختصر مضمون "دو قابل اصلاح باتیں" [۶۴] خاص اہمیت کا حامل ہے۔ جس میں انھوں نے خواتین کو آگاہ کرنے کی کوشش کی کہ کسی کے گھر جانے سے پہلے اسے اپنے آنے کی اطلاع لازمی دیں، تاکہ ان کی اچانک آمد گھر والوں کے لیے پریشانی کا باعث نہ بنے۔ ان کے مطابق میزبان سے چاہے جتنی بے تکلفی کیوں نہ ہو بنا اطلاع دیے اور اجازت طلب کیے کسی کے ہاں جانا مہمان کی توقیر میں کمی کا باعث بن جاتا ہے۔ اسی ضمن میں شاہزادجہاں بیگم نے اپنے خیالات کا اظہار اپنے مضمون "مہمان جانے میں لحاظ" [۶۵] میں کیا۔ درج ذیل مضامین میں بھی اسی فکر کا احاطہ کیا گیا ہے:

مضمون نگار	مضمون کا عنوان
شاہزادجہاں بیگم	میل جول کا زمانہ [۶۶]
ایضاً	اطلاع دے کر جانا [۶۷]
ایضاً	ہمارا آپس میں برتاؤ [۶۸]
جمیلہ بیگم	بے موقع ہنسی [۶۹]
صفیہ مدحت خانم	سیر و تفریح [۷۰]

۴.۳.۳ اسراف:

اسراف کے معنی فضول خرچی اور حد سے تجاوز کرنے کے ہیں۔ اسلامی تعلیمات میں سادہ زندگی گزارنے کی تلقین بار بار کی گئی ہے اور اسراف سے منع فرمایا گیا ہے۔ ہندوستانی معاشرت میں موجود دیگر مسائل کی طرح ایک مسئلہ دوسروں کی دیکھا دیکھی اور رتبہ پانے کی خاطر اشیا کا بے جا اور بے دریغ استعمال تھا۔ جس سے ایک طرف نمود و نمائش مراد تھی تو دوسری طرف اس طبقہ میں احساس محرومی پیدا ہو رہی تھی جو وسائل نہیں رکھتی۔ تہذیب نسواں کی مصنفین نے اس مسئلے کے حل کے لیے بھی اپنے قلم سے معاونت لی اور ایسے مضامین لکھے جو اسلامی طرز

معاشرت کی حمایت کرتے تھے اور اسراف سے باز رہنے کی تلقین کرتے تھے۔ فاطمہ بیگم اس ضمن میں لکھتی ہیں:

> افسوس آج کل کے جنٹلمین اور لیڈیز سادہ زندگی کے نام سے بھی واقف نہیں ہیں۔ جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ بزرگان سلف کے کارناموں سے ہم بالکل ناواقف بن گئے ہیں۔ سادہ زندگی یہ ہے کہ اعتدال سے تجاوز نہ کریں۔ اور کھانے اور لباس میں بناوٹی نمائش اور تکلف کو چھوڑ کر غذا اور لباس کے مقاصد اصلی کو مد نظر رکھیں۔ اگر آپ ایسا کر لیں تو کتنے اسراف اور بے اعتدالیوں سے بچاؤ ہو جائے گا۔[41]

ہمشیرہ احمد مبین نے "خواتین ہند اور تمدن جدید"[42] میں اسی مسئلے کے حوالے سے اپنے خیالات رقم کیے۔ انھوں نے تلقین کی کہ اپنی روایات کو مد نظر رکھتے ہوئے بناوٹ اور نمود و نمائش سے گریز کریں۔ انسان کو اللہ نے خاص مقاصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ انہی مقاصد پر اپنی توجہ مرکوز رکھیں اور دکھاوے آلودگی سے اپنے دامن کو داغ دار نہ کریں۔

رضیہ سلطانہ نے اپنے مضمون "کفایت شعاری"[43] میں خواہش اور ضروریات میں افتراق کو واضح کیا ہے۔ ان کے مطابق کفایت شعاری ایک ایسا وصف ہے، جس سے انسان اپنی طبیعت پر قابو پالیتا ہے۔ اس سے اس میں خودداری جیسے خصوصیات جنم لیتی ہیں اور خدا کی دی ہوئی نعمتوں پر قانع ہو جاتا ہے۔ اس سے وہ دوسروں کے اثر اور دباؤ سے بھی محفوظ رہتا ہے۔ ان کے مطابق کفایت شعاری سے انسان راحت اور اطمینان حاصل کرتا ہے اور آئندہ آنے والی مشکلات پر قابو پانے کے قابل بھی ہو جاتا ہے۔

بیگم شارق نے بھی اپنے مضمون[44] میں ہندوستانی مستورات کو اسراف بیجا سے بچنے اور اپنی خواہشات کو محدود رکھنے کی تلقین کی۔ اس ضمن میں انھوں نے وسائل کے مطابق اخراجات کی اہمیت کو اجاگر کیا اور ہندوستانی خواتین کو یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ وہ اگر اپنی خواہشات کو ضرورت پر ترجیح دیں گی تو اول تو کسی مشکل کا شکار ہی نہیں ہوں گی اور اگر خدانخواستہ کسی مشکل وقت اور مرحلے سے دوچار ہو بھی جائیں گی تو ان میں اتنی قابلیت ضرور ہو گی کہ اپنے زورِ بازو سے اس سے با آسانی نکل آئیں۔ انھوں نے وسائل کے مطابق اخراجات کی اہمیت کو واضح کیا اور ہندوستان کی عام عورت کے اس سماجی رویے کی مذمت کی جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے اور اپنے سے اوپر کے طبقے کی نقالی میں اسراف کر کے روپے کا زیاں کرتی ہیں۔ انھوں نے متوسط طبقے کی خواتین کو آمدنی اور خرچ میں توازن قائم رکھنے کی تلقین بھی کی۔ ان کے مطابق اسراف ان عیبوں میں سے ایک عیب ہے جن سے انسانی زندگی بے کیف اور معاشرت بے مزہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ انھوں نے اسراف کو "ام العیوب" قرار دیا اور اسے ہندوستان کی قومی و معاشرتی کمزوری کہتے ہوئے مستورات کو اس سے پہلو بچانے کی تلقین کی۔

صغرا ہمایوں مرزا نے بھی ہندوستانی مستورات کو بے دریغ خرچ سے باز رہنے کی تلقین کی انھوں نے خواتین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اپنے نفس کو مار کر ضروریات کو پورا کرنے پر دھیان دینا چاہیے اور اپنے معاملات کو جادہ اعتدال سے باہر نہیں جانے دینا چاہیے۔ انسان کو محض اپنے آج کی فکر نہیں کرنی چاہیے بل کہ کل کے لیے تیاری بھی رکھنی چاہیے تا کہ اگر زندگی کے کسی بھی مرحلے پر کوئی ایسا معاملہ پیش آ جائے جہاں اسے کوئی مشکل وقت آن پڑے تو کسی کے آگے دستِ سوال دراز کرنے سے بہتر یہی ہے کہ وہ خود اپنی فراست اور سلیقہ شعاری سے معاملہ نبٹا لے۔

مضمون نگار	مضمون کا عنوان
صغرا ہمایوں مرزا	کفایت شعاری [۷۵]
ہمشیرہ صدیقی	کفایت شعاری [۷۶]
ظفر جہاں	ازدواجی زندگی اور اسراف [۷۷]
فرحت	فضول خرچی [۷۸]

۴.۳۔ نمود و نمائش سے گریز:

متذکرہ بالا مسائل کی طرح ہندوستانی معاشرے کا ایک مسئلہ نمود و نمائش بھی تھا۔ جس میں لوگ محض اپنی جھوٹی عزت و توقیر کی خاطر اسلام کے احکامات سے منحرف تھے۔ اس مسئلے کا سب سے کمزور پہلو یہ تھا کہ معاشرے میں اپنی جھوٹی دھاک بٹھا سکیں۔ بعض لوگ تو اس چکر میں اس قدر حد سے تجاوز کر جاتے تھے کہ ان کی وجہ سے باقیوں کے لیے بھی مسئلہ کھڑا ہو جاتا تھا۔ زینب ربانی کے مطابق:

> فی زمانہ ہماری زندگی محض نمائش اور ظاہر داری بن کر رہ گئی ہے۔ اور ہم نمود و نمائش میں ہی اپنی عزت و توقیر خیال کرتے ہیں۔ فیشن پرستی میں بالکل ڈوب گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ارکان اسلام کے بھی پابند نہیں رہے ہیں اور جو ہم میں سے فیشن پرستی سے دور بھی ہیں وہ بھی ظاہری وضع کے نبھانے اور اس کی داد لینے کے خیال میں اس قدر محو ہو گئے ہیں کہ اصلیت سے دور جا پڑے ہیں۔[۷۹]

ظاہری وضع داری کے دکھاوے کے ساتھ ایک اور مسئلہ جہیز کی نمائش کا بھی تھا۔ لوگ اپنی بیٹیوں کو جہیز اس لیے دیتے ہیں کہ شادی کے بعد اگر انھیں کسی چیز کی ضرورت محسوس ہو تو وہ کسی کے سامنے دست ضرورت دراز نہ کریں۔ اور یہ ہر طبقے کے افراد اپنی گنجائش کے مطابق فرض سمجھ کر ادا کیا کرتے تھے۔ لیکن وقت کی کروٹ کے بعد بیٹی کو محبت سے دیا جانے والا جہیز کا تحفہ بھی نمائش کے طور پر رائج ہو گیا اور لوگ بیٹی کی ضرورت کو مد نظر رکھنے کی بجائے معاشرے میں ناک اونچی رہنے کی وجہ سے جہیز دینے لگ گئے۔ نا صرف یہ کہ جہیز دیتے تھے بل کہ اس کی

باقاعدہ نمائش بھی کی جاتی تھی۔ و۔ا نے اس حوالے سے اپنے نظریات ایک مضمون "جہیز اور بری کی نمائش"[۷۹] میں پیش کیے۔ مسز عزیز الدین اپنے مضمون "جہیز" میں یوں رقمطراز ہیں:

> ہمارے ہاں جہاں اور رسمیں قابل اصلاح ہیں وہاں لمبا چوڑا جہیز دینے کی رسم بھی بری ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ہمارے ہاں ظاہر داری بہت برتی جاتی ہے۔ ورنہ لڑکی والے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے پاس دینے لینے کو نہیں ہے۔ لیکن اتنا کہ کر اپنی سبکی کون کرائے اور لوگ ہمسائے واہ واہ کس طرح کریں۔ اس وقت شاباش مل جائے۔ بعد میں بوٹیاں نچتی رہیں۔ بلا سے "یہی قسمت میں لکھا تھا کہہ کر دل کو سی دے لیں گے۔"[۸۰]

اسلام میں دکھاوے کی سختی سے ممانعت ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ان معاشرتی خرابیوں کا حصہ نہ بنیں بل کہ اپنے عمل سے انھیں ختم کرنے کی کوشش کریں۔ تا کہ حب الٰہی کے حصول کے ساتھ ساتھ معاشرتی برائیوں کا خاتمہ بھی ہو سکے۔

۴۔ پردے کے مباحث:

ہندوستانی معاشرے میں عورت اس قدر دباؤ کا شکار تھی کہ اسے چار دیواری میں مقید رکھا جاتا تھا اور اگر وہ گھر سے باہر اپنی مصروفیت کا مشغلہ اپنانا بھی چاہے تو اسے سخت برا بھلا کہا جاتا اور روایات کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ ہندوستانی معاشرے میں عورت چار دیواری میں مقید گھر گرہستی کے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔ فطرتاً انسان کی بہتر نشوونما کے لیے ضروری ہے کہ اس کے لیے ایسے مقام کی ضرورت ہوتی ہے جہاں وہ کچھ وقت اپنے لیے نکال سکے اور تفریح کر سکے۔ لیکن یہاں کی خواتین کے لیے کھلی ہوا میں سانس لینے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ نا ہی اسے اس بات کی اجازت تھی کہ وہ سماجی تعمل کر سکے۔ اس سے ان خواتین کی سوچ محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اور وہ ذہنی طور پر انتشار کا شکار ہو گئی تھیں۔ تہذیب نسواں کی مستورات نے ہندوستانی مرد اور عورت کے معمولات زندگی کا تجزیہ کرتے ہوئے عورتوں کی تفریح کے لیے بھی گھر سے باہر کچھ سرگرمیوں کو ضروری سمجھا۔ انھیں اس بات کا ادراک تھا کہ ہندوستانی مرد کا حلقہ عورت کی نسبت زیادہ وسیع ہے۔ ان کے مطابق مرد اگر سینما چلا بھی جائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا جب کہ عورت کو گھر کی چار دیواری میں مقید رکھنا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اس غیر مساوی رویے کی مزاحمت کرتے ہوئے انھوں نے عورتوں کے لیے بھی تفریح کے مواقع فراہم کرنے کی حمایت کی۔ سلطانہ بیگم اپنے مضمون "سینما پر ایک تنقیدی نظر"[۸۱] میں انہی افکار کی ترسیل کرتی ہیں۔

ہندوستانی عورت ایک طرف اس قدر مقفل تھی تو دوسری طرف اسے اپنی جائز ضرورتوں کی تکمیل کے لیے بھی گھر سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ایسے میں تہذیب نسواں کی خواتین نے پردے کی سختی کو کم

کرنے کی حمایت میں اپنے افکار پیش کیے۔ مسز سید احمد مچھلی اس ضمن میں لکھتی ہیں:

میرے خیال میں پردے کو بالکل نیست و نابود کر دینا کسی طرح عقل مندی کی بات نہیں۔ اس میں بہت ترمیم کی ضرورت ہے۔ جس تشدد کے ساتھ ہمارے ملک اور خصوصاً یوپی میں پردہ رائج ہے۔ اس کا خواتین کی صحت اور معاشرتی زندگی پر بہت برا اثر پڑ رہا ہے۔ ان کی تندرستی خراب ہو رہی ہے اور وہ باوجود ہاتھ پاؤں کے بے دست و پا بنی ہوئی ہیں۔ اور ذرا ذرا سی باتوں میں دوسروں کی محتاج رہتی ہیں۔ [۸۲]

اس دور میں بہت سی خواتین کو اس بات کا احساس تھا کہ غیر ضروری پردے کی وجہ سے ان کی ترقی میں رکاوٹیں آ رہی ہیں اس لیے انھوں نے پردے کی رسم کو یکسر ختم کرنے کی فرمائش کی۔ جو کہ ہندوستانی روایات کے مخالف تھا۔ اسلام میں بھی ایک خاص نوعیت کے پردے کی اجازت ہے جو شرعی حدود و قیود میں عورت کی حفاظت کے لیے رائج ہے۔ اس لیے پردے کو ایک دم ختم کر دینا کسی طور درست نہیں ہے۔ شاہزادہ جہاں بیگم اپنے ایک مضمون "بد تہذیبی" میں اس حوالے سے لکھتی ہیں کہ:

مثلاً آج کل پردہ چھوڑنے کی ہوا چلی ہے۔ جس کو دیکھو۔ وہ اسی خیال میں مبتلا ہے۔ کہ پردہ ترک کیا جائے۔ تاکہ خواتین میں ترقی کی رکاوٹیں دور ہو جائیں۔ یہ سچ ہے کہ پردہ کی وجہ سے ہم ترقی جیسی کہ چاہیے۔ نہیں کر سکتے۔ لیکن پردہ چھوڑنے کے لیے بھی عقل چاہیے۔ اور تہذیب کو ہاتھ سے کبھی نہ جانے دینا چاہیے۔ آج کل خواتین پردہ چھوڑ کر بد تہذیبی کی بہت بری مثالیں قائم کر رہی ہیں۔۔۔۔" [۸۳]

حامدہ خیری نے "عورتوں کی عید" [۸۴] میں ہندوستانی معاشرے کے مسائل پر بات کی۔ انھوں نے اس سوچ کی مخالفت کی جو پدر سری معاشرے کے زیر اثر پروان چڑھی اور جس نے خواتین کو اس قدر محکوم کر دیا کہ وہ اپنی مرضی سے کوئی قدم نہیں اٹھا پاتی تھیں۔ اس ضمن میں انھوں نے ہندوستان میں رائج پردے کی بے جا پابندی کی مخالفت بھی کی جس سے عورتوں کو دباؤ میں رکھا جاتا تھا کہ وہ اپنے مذہبی فرائض بھی بخوبی انجام نہیں دے پاتی تھیں۔

ہندوستان میں رائج پردے کی روایت کے حوالے سے ان مصنفین نے مختلف قسم کے مسائل پر گفتگو کی۔ ایک طرف وہ پردہ تھا جس کی پابندی مذہب نے عورت کے لیے ضروری قرار دی تھی تو دوسری طرف وہ صورت تھی جو سماجی اجارہ داروں کے ذاتی مفادات کی وجہ سے پروان چڑھ رہی تھی۔ ایسے میں خواتین کا ایک ایسا گروہ بھی موجود تھا جو لڑکیوں کو اس قدر مقید کر دینے کا قائل تھا کہ وہ عزیز و اقارب سے بھی میل ملاپ نہ بڑھا پائیں۔ ایسی تمام سختیاں پردے کے اصل مقصد کے مخالف تھیں۔ اس لیے تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے ان بے جا بندشوں کے خاتمے کے لیے ایسے مضامین قلم بند کیے جن سے پردہ اسلامی شعار کے مطابق قائم رہ سکے اور غیر

ضروری سختی کا خاتمہ ہو۔ جمیلہ بیگم نے بھی ہندوستانی پردے کے نظام اور عام مغالطوں کا تذکرہ کرتے ہوئے برقع کو خاص طور پر موضوع بنایا۔ انھوں نے اپنے مضون "برقع "[۸۵] میں برقع کو ہندوستانی معاشرے کی محکومی اور اس کی غلامانہ سوچ کا نشان قرار دیا۔ ان کے مطابق رسول اکرم، صحابہ کرام اور خلفائے اسلام کے ادوار اور اس کے بھی بہت بعد تک بھی عورت کے لیے برقع کی کسی قسم کی پابندی لازمی نہیں تھی۔ بل کہ اس دوران برقع کا نام نشان تک نہ تھا۔ نہ ہی اس برقع پوشی کا حکم قرآن مجید میں دیا گیا ہے۔ اسلام میں تو محض نظریں نیچی رکھنے اور آرائش وزیبائش کو غیر محرم سے چھپا کر رکھنے کی تلقین بار بار کی گئی ہے۔ جمیلہ بیگم نے ہندوستانی معاشرے میں رائج برقع کے نظام کو یہاں کے اجارہ دار طبقے کی پست خیالی قرار دیا جو عورت کو حبس دوام میں مبتلا کر کے اسے محکوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لازم کرنے کو ایسے من گھڑت قصے بنتے ہیں، جن کا اسلام یا شریعت میں کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ امت الوحی اسی حوالے سے اپنے نظریات پیش کیے ان کے مطابق ہندوستان میں غیر شرعی پردے کی سختی اس قدر زیادہ ہے کہ خواتین کو اس سے بے جا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ سب سے بڑا نقصان تو وہ تعلیمی نقصان ہے جو پردے کی آڑ میں سماجی اجاری وار اسے پہنچا رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے مضمون "پردہ"[۸۶] میں اسلامی شعار کے مطابق پردے کی پابندی کو لازمی قرار دیتے ہوئے غیر شرعی پردے کی پابندی کی مخالفت کی۔

ہمشیرہ عبدالمالک نے اپنے مضمون "کنواری لڑکیوں کا پردہ"[۸۷] میں اسی معاملے پر اظہار خیال کیا ہے۔ انھوں نے لڑکیوں کے لیے سماجی میل ملاپ کے فوائد کے ضمن میں یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اس قدر اندھیرے میں رہنے سے لڑکیاں وہ ضروری معلومات حاصل نہیں کر سکتیں جو بہتر زندگی گزارنے کی خاطر ان کے لیے ضروری ہیں۔ زندگی کے بعض معاملات پر انسان کتاب سے وہ علم حاصل نہیں کر سکتا جو اسے سماجی تعامل سے حاصل ہوتا ہے۔ ہمشیرہ عبدالمالک نے عورت کے عورت سے پردے کی بھی مذمت کی۔ مس طیب رضا نہٹوری نے بھی اپنے مضمون "کنواری لڑکیوں کا پردہ سے پردہ"[۸۸] میں ہندوستانی معاشرے میں پائی جانے والی رسم کی رسم کو ہدفِ تنقید بنایا۔ اس ضمن میں وہ بتاتی ہیں کہ ان بیاہی لڑکیوں کو اپنی قریبی رشتہ دار خواتین سے ملنے کی اجازت بھی نہیں ہوتی انھیں کسی سے بات چیت کرنے اور میل جول کا کوئی موقع نہیں دیا جاتا، جس سے ان کی طبیعت میں ایسی شرم و حیا رچ بس جاتی ہے کہ وہ اپنی ہم عمر لڑکیوں سے ہم کلام ہونے میں بھی عجلت برتتی ہیں۔ اس رواج سے یہ لڑکیاں آداب گفت و شنید اور طرزِ معاشرت سے یکسر نابلد رہتی ہیں۔ مس طیب رضا ایک عورت سے دوسری عورت کے پردے کی رواج کی مذمت کرتی ہیں اور اسے انسانی اقدار کے خلاف ایک رسم سمجھتی ہیں، جس میں وہ مثل کسی بے بس ولاچار کے ایک حد میں مقید ہیں۔

مسز قطب الدین دسنوی کے ہاں بھی لڑکی اور لڑکے کی تربیت میں روا رکھے جانے والے افتراق پر افسردگی کا اظہار ملتا ہے۔ ان کے مطابق جب لڑکے کو ایک خاص عمر میں سماجی زندگی کے آداب سکھانے اور دنیاوی معاملات سمجھنے کے لیے آزادانہ میل ملاپ کے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں تو لڑکی کو کیوں محدود کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ گھر میں آنے والی خواتین اور لڑکیوں سے بھی پردہ کروایا جاتا ہے۔ اس فکر کا اظہار ان کے مضمون "پردہ کے اندر پردہ"[۸۹] میں ملتا ہے۔ مسز اے حمید نے بھی اپنے مضمون "پردہ"[۹۰] میں ہندوستانی معاشرے میں رائج پردے کے رواج اور اس سے متعلق عصری مسائل کا تذکرہ کیا ہے۔ تہذیبِ نسواں میں شامل پردے سے متعلق دیگر مضامین میں درج ذیل شامل ہیں:

مضمون نگار	مضمون کا عنوان
امت الوحی	پردے کی وجہ سے بچت"[۹۱]
ایضاً	پردہ"[۹۲]
صفیہ مدحت خانم	پردہ نشین و بے پردہ خواتین"[۹۳]
سعیدہ ہمشیرہ ڈاکٹر سید شفیع الدین	ڈاکٹر سے پردہ"[۹۴]
مبارک دلھن	موٹر کا سفر[۹۵]
خدیجۃ الکبریٰ	ہندوستان کا مروجہ پردہ"[۹۶]
ب۔ن آنسہ ابراہیم	برقع"[۹۷]
خاکسار بنت حفظ الکریم انصاری	لڑکیوں کا پردہ عورتوں سے[۹۸]
نذر سجاد حیدر	پردہ"[۹۹]
مسز ضیاالحسن	پردہ اور ہم"[۱۰۰]
ایضاً	پردہ اور ہم"[۱۰۱]
سیدہ اشرف	موجودہ پردہ"[۱۰۲]
ایضاً	موجودہ پردہ"[۱۰۳]
رضیہ سلطان	پردہ معاشرتی حیثیت سے"[۱۰۴]
اہلیہ سید ہمایوں مرزا	پردہ پر بحث[۱۰۵]
ادریس بیگم	پردہ"[۱۰۶]

گ۔ن	شرعی لباس[107]
زیب النسا بیگم	پردہ[108]
شاہزادجہاں بیگم	پردے کی نسبت میرا خیال[109]

۴۔ا۔نام کا پردہ:

ہندوستانی معاشرے میں عورت کے لیے پردے کی حدود محض سماجی میل ملاپ تک محدود نہ تھی بل کہ اکثر خواتین کو نام اور آواز تک کا پردہ رکھنے کی تلقین کی جاتی تھی۔ اس کی مثال تہذیب نسواں میں لکھنے والی متعدد مستورات کی تحریروں میں بھی ملتی ہیں جو اس قدر روشن خیال ہیں اور سماجی و ملکی معاملات و مسائل سے بخوبی واقف بھی ہیں لیکن اپنے افکار کی ترسیل کے لیے انھوں نے اپنے نام کا ظاہر نہ کرنا مناسب سمجھا اور اپنے والد، بھائی بیٹے یا شوہر کے ناموں کے ساتھ دختر، بنت، ہمشیرہ، دلھن، اہلیہ یا مسز لگا کر مضامین پیش کیے۔ جیسے اہلیہ سید احمد سبزواری، اہلیہ خواجہ حسین علی، اہلیہ محمد علی خاں منصوری۔ بیگم یار محمد خاں، بیگم اشفاق حسین، بیگم آباد احمد خاں، بیگم شارق، برجیس دلھن، مبارک دلھن، نفیس دلھن، مسز حامد علی، مسز داؤد الرحمن، مسز ملک، مسز محمود، بنت شیخ فضل الٰہی، دختر عبدالودود، صاحبزادی م۔ج، ہمشیرہ احمد مبین، ہمشیرہ سید آدم وغیرہ۔

ان میں سے بعض خواتین نے اردو یا انگریزی حروفِ تہجی کو بطور نام لکھا۔ جن میں و۔ا، ت، ت۔ن للی راج، ا۔ب۔ج، الف۔ف، ایس۔اے کرمانیہ، ایس۔آر کرمانیہ، ایس ۔آر ۔کے، ایم ۔جے بیگم ،ب۔ج، ب۔ز۔ب (بنت ڈاکٹر ولی محمد)، بی۔جے بیگم، ح۔ب، س۔الف، غ خانم، م۔ب۔ش، ن۔ب وغیرہ شامل ہیں۔ کچھ خواتین نے مردانہ ناموں کے ساتھ بیگم کا اضافہ کر کے اپنے خیالات کی پیشکش کی جیسے احمد بیگم۔ بلقیس بیگم نے ایسی ہی خواتین کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا کہ:

> محفل تہذیب میں ایک بہن "ب۔ف" صاحبہ کا خط میری نظر سے گزرا میری ناقص رائے میں بجائے انگریزی حروف لکھنے کے اپنا نام ہی صاف لکھنا بہتر ہے۔ بقول آپ کے " ہماری خاتون جنت (رضی اللہ) کو کوئی بنت محمدؐ یا مسز علی (رضی اللہ) نہیں کہتا۔ بل کہ سب زہرا فاطمہ (رضی اللہ) ہی کہتے ہیں۔" علاوہ ازیں ان کے بعد جو نامی گرامی بزرگ خواتین گزری ہیں۔ انھوں نے بھی اس قسم کا بیہودہ پردہ نہیں کیا۔ پھر ہمارا نام یا ہماری لیاقت کچھ ان سے بڑھ کر تو ہے نہیں۔ صاف لکھنے میں کسی بے پردگی کا احتمال نہیں۔ مزید براں "ف۔م"، "ق۔ب" ایسے حروف ہیں جو نام کی جگہ استعمال کرنے میں زبان کو غیر موزوں لگتے ہیں۔"[110]

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے اس حوالے سے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور خواتین میں یہ شعور پیدا

کرنے کی کوشش کی کہ نام کے ظاہر کرنے میں کسی بھی قسم کی کوئی خرابی نہیں ہے۔ بل کہ یہ تجویز بھی دی کہ نام کا ظاہر کرنا ضروری ہے۔ اس سے مضمون نگار اور قاری کے درمیان ایک رابطہ قائم ہو جاتا ہے یوں قاری کے لیے مفاہیم تک رسائی آسان ہو جاتی ہے اور مضمون نگار کے عہد اور معاشرتی احوال سے ہم آہنگی بھی ہوتی ہے۔ نام مخفی رکھنے سے قاری کا ذہن نام میں ہی الجھا رہتا ہے اور تحریر کا مقصد زائل ہو جاتا ہے۔ اس حوالے سے شاہزادجہاں بیگم نے اپنے خیالات کا اظہار اپنے مضمون "نام چھپانا"[۱۱] میں کیا۔

۵۔ قدامت پرستی کے نقصانات:

نوآبادیاتی ہندوستان میں خواتین کا ایسا گروہ بھی موجود تھا جو جدید رجحانات اور بدلتے وقتی تقاضوں سے بالکل ناآشنا تھا۔ یہ خواتین اس قدر روایت پسند تھی کہ کسی بھی تبدیلی کو قبول کرنے گے گریزاں تھیں۔ ایسے میں تہذیب نسواں کی مضمون نے ان کی تربیت کے لیے اقدامات کیے اور انھیں قدامت پرستی کے اندھیروں سے نکالنے کی کوشش کی۔ اس حوالے سے تفصیل ذیل میں ہے:

۵.۱۔ دیرینہ رسوم ورواج پر تنقید:

ہندوستانی تہذیب کا ایک تاریک پہلو یہ تھا کہ یہاں دیرینہ رسوم ورواج کی بے جا تقلید کی جاتی تھی اور یہاں کی خواتین خاص طور پر ایسی رسوم میں الجھی نظر آتی تھیں جن کی کوئی اہمیت اور فائدہ نہ تھا۔ بل کہ یہ رسوم سراسر پیسے اور وقت کا زیاں تھیں۔ جن میں شادی بیاہ کے موقع پر کی جانے والی رسوم، چھٹی چھلے کی رسوم اور خوشی و غمی کے موقع پر کی جانی والی رسوم شامل تھیں۔ جدید تعلیم سے فیض یاب ہونے پر بہت سے لوگوں نے ان رسوم کی پابندی کی مخالفت کی اور ان کے خاتمے کی کوششیں کیں۔ دختر نواب ممتاز یار الدولہ بہادر رسوم ورواج اور معاشرت ترقی کی ضمن میں لکھتی ہیں کہ:

> کسی ملک کی ترقی یا تنزلی کی اصلی حالت دریافت کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی رسموں پر گہری نظر ڈالی جائے۔ کیوں کہ ان سے قوم کے خیالات اور ان کا سچا مذاق بخوبی معلوم ہوتا ہے۔ گو کسی قوم کے لوگ بظاہر تعلیم یافتہ اور مہذب نظر آئیں مگر جب ان کے گھروں کی رسم و رواج پر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ترقی ابھی کوسوں دور ہے۔۔۔"[۱۲]

ثریا پروین اپنے مطالعے اور مشاہدے کے مطابق ان رسوم پر تنقید کرتے ہوئے لکھتی ہیں "یہ مشاہدے کی بات ہے کہ مرد کی نسبت عورت روحانی باتوں کی قائل زیادہ ہوتی ہے۔ اور یہی کمزوری ان تمام رسوم کی جڑ بن گئی ہے۔ جس نے ہمارے مذہب و قوم کو اس قدر پست بنا رکھا ہے۔ ان فضول رسوم جو شادی، مرگ یا پیدائش کے موقعوں پر کی جاتی ہیں۔ اب دور کر دینا چاہیے اور وہی پیسہ جو یہاں ضائع ہوتا ہے۔ کسی کار خیر یا یتیموں کی تعلیم کے

لیے خرچ کرنا چاہیے۔ حکومت کو اس طرف بھی اپنی توجہ مبذول کرنی چاہیے۔ ان رسوم کی پابندی ہم نے ہندوؤں میں رہ کر اختیار کر لی تھی۔ اب ہندوؤں سے تو ہم علیحدہ ہو گئے ہیں۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ان رسوم کو بھی چھوڑ دیں۔"[۱۱۳]

اہلیہ سید احمد سبزواری نے ہندوستانی معاشرے کی پستی کی ایک وجہ رسوم و رواج کی غیر ضروری تقلید قرار دی ہے۔ ان کے مطابق ہندوستانی قوم لغو اور فرسودہ رسوم کی شدت سے پابندی کر رہی ہے جس سے ان کی زندگی ایک حد میں مقید ہے، جدید رجحانات اور معاملات سے بے بہرہ ان افراد کسی طور اپنی بہتری کی فکر نہیں ہے۔ اس حوالے سے ان کے افکار کی عکاسی ان کے مضمون "ہماری مفلسی کی وجہ"[۱۱۴] میں ملتی ہے۔ نسیم بانو اپنے اپنے مضمون "جاہلوں میں رسمیں"[۱۱۵] میں ایسی ہی فرسودہ رسوم پر تنقید کرتی ہیں جو معاشرتی پستی اور راسخ الاعتقادی کا باعث بنتی ہیں۔ اس مضمون میں انھوں نے مرگ پر کی جانے والی رسومات پر تنقید کی ہے اور اس طبقے کو ہدفِ تنقید بنایا ہے جو شعور و آگہی نہ ہونے کی وجہ ایسے عمل سر انجام دے رہا ہے جو اسلامی عقائد کی کمزوری کا باعث بنتے ہیں۔

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے جہاں غیر ضروری رسموں کے اپنائے جانے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا وہیں انھوں نے ان فرسودہ رسوم پر ضائع کیے جانے والے روپے پیسے کے بہتر استعمال کی تجویز بھی پیش کی۔ آنسہ تنویر فاطمہ نے اپنے مضمون "رسموں پر فضول خرچی"[۱۱۶] میں اس فکر کا احاطہ کیا۔ ان کے مطابق وقتی شان و شوکت کے دکھاوے کے لیے استعمال کی جانے والی رسم اگر بہتر طریقے اور بہتر جگہ پر خرچ کی جائے تو اس سے محض ایک لمحے کی خوشی نہیں ملے گی بل کہ تمام عمر کا خوشحالی میسر آئے گی۔ انھوں نے رسوم پر ضائع کیے جانے والے پیسے کو تعلیم و تربیت پر خرچ کیے جانے کی حمایت کی تاکہ محض ایک نسل نہیں بل کہ آئندہ آنے والے نسلیں اس سے استفادہ حاصل کر سکیں۔

جمیلہ بیگم نے اپنے مضمون "فضول چیزیں"[۱۱۷] میں ہندوستانی معاشرے میں پائے جانے والے عیوب کے خاتمے کے لیے خواتین میں شعور و بیداری پیدا کرنی کی کوشش کی۔ انھوں نے سماجی رجعت پسندی کی مخالفت کی اور خواتین کو جدید فکر سے روشناس کروانے کی کوشش کی۔ اس ضمن میں انھوں نے یہ شعور دینے کی کوشش کی کہ روایات سے جڑا رہنا ایک اچھی خصلت ہے لیکن انھیں اس حد تک خود پر طاری کر لینا کہ قوم قدامت پرستی کے اندھیرے میں گم ہو جائے یہ کسی طور درست نہیں ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ جدید تقاضوں کے مطابق افکار میں ترمیم کی جائے اور ضروری چیزوں سے استفادہ کر کے اپنی حالت بہتر بنائی جائے۔

مبارک دلھن نے ہندوستانی معاشرے میں ہائی جانے والی فرسودہ خیالی اور غیر ضروری رسوم کی پابندی کے خاتمے کے لیے قانون ساز اداروں کو تنبیہ کی ہے کہ اگر ان کے ترک کرنے کے لیے کوئی مناسب اقدامات نہ کیے

گئے تو ہماری آئندہ آنے والی نسلیں اس کا نقصان اٹھائیں گی۔ انھوں نے ایسی انجمنوں کے قیام کی تجویز پیش کی جو ان رسومات کے نقائص سے عوام کو آگاہ کریں اور ان کی سوچ کو درست سمت عطا کریں۔ انھوں نے ایسے قانون نافذ کرنے کی ضرورت کو اجاگر کیا جن سے فضول اسراف کا خاتمہ کیا جاسکے۔ ان رسومات میں الجھے رہنے کی بجائے تعلیمی سہولیات کی فراہمی کی تجویز پیش کی تا کہ آئندہ آنے والی نسلیں اس دلدل میں دھنسنے کی بجائے دنیا کے نقشے پر کامیاب قوم کی طرح ابھر کر سامنے آئیں۔ اس سلسلے میں ان کا مضمون "قانوناً شادیوں میں اصلاح کی ضرورت"[۱۸] خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس حوالے سے لکھے گئے دیگر مضامین میں درج ذیل شامل ہیں:

مضمون نگار	مضمون کا عنوان
بیگم محمد فضائل	بری رسمیں[۱۹]
بیگم محمد حمایت اللہ خان	شادی اور غمی کی بیہودہ رسوم[۲۰]
ایضاً	شادی اور غمی کی بیہودہ رسوم[۲۱]
ایم بانو	بدایوں میں رسوم غمی[۲۲]

۲.۵۔ توہم پرستی کے نقائص:

تہذیب نسواں میں لکھنے والی خواتین نے ہندوستانی قدامت پرست خواتین میں شعور و آگہی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے انھیں جدید رویوں سے آگاہ کیا اور یہ باور کروایا کہ ان توہمات میں الجھ کر وہ صرف اپنے وقت کا زیاں کر رہی ہیں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اس سے ان کی ترقی کی راہیں مسدود ہوتی ہیں۔ آصفہ خاتون نے اس حوالے سے اپنے نظریات پیش کرتے ہوئے پڑھی لکھی باشعور خواتین کو بھی ہدف تنقید بنایا ہے کہ وہ علم و آگہی رکھنے کے باوجود ان توہمات میں الجھی ہوئی ہیں اور اس سے نکل نہیں پا رہی۔ ان کے مطابق پڑھے لکھے طبقے کا ان توہمات کا شکار ہو جانا سماج پر ایک ظلم ہے۔ کیوں کہ اس سے پورا سماجی نظام متاثر ہوتا ہے۔ اپنے مضمون "نافرمانی" میں وہ اس حوالے سے لکھتی ہیں کہ:

> ۔۔۔۔اب تک فضول وہم ہمارے دلوں سے نہیں گئے۔ اور غضب یہ کہ ان وہموں میں ابھی تعلیم یافتہ طبقہ بھی گرفتار ہے۔ جو روشن خیال سمجھا جاتا ہے۔۔۔۔ یہ تمام اچھے اور برے شگون جھوٹے وہم ہیں۔ دراصل ان کی اچھائی برائی کا کوئی اثر انسان کی زندگی پر نہیں پڑتا بل کہ ان کو ماننا زندگی میں مشکلات کو بڑھاتا ہے۔ اس لیے ان سے بچنا ہی ہمارے لیے مفید ہے۔[۲۳]

ان خواتین نے معاشرے میں پائی جانے والی توہم پرستی کی سخت مذمت کی۔ اور ان راسخ العقیدہ خواتین کو تنقید کا نشانہ بھی بنایا جو ان توہمات میں الجھی اپنی زندگیوں کو مشکل بنائے بیٹھی ہیں۔ ان کے نزدیک ان تمام اوہام کا

کوئی علاج نہیں ہے۔سب کچھ انسان کی سوچ پر موقوف ہے وہ جیسا سوچتا ہے ویسا ہوتا ہے، اگر وہ اللہ سے امید لگا کر اچھا سوچیں گی تو نتیجہ اچھا ہی آئے گا۔ صالحہ خاتون ہندوستانی معاشرے میں رائج توہمات کا احاطہ ان الفاظ میں کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> بہت سے توہمات ایسے ہیں جن پر لوگوں کا خواہ مخواہ عقیدہ ہو گیا۔ مثلاً بدھ کے روز سفر نہ کرنا، اللہ کے دن سب برابر ہیں، اس کے سب دن متبرک ہیں۔ جمعہ کے روز نہانا سنت ضرور ہے مگر جمعرات کے روز نہانا کس حساب سے منع ٹھہرا؟ باہر جاتے وقت خالی گھڑا دیکھ لینا، بھلا اس میں کیا رکھا ہے۔۔۔ کسی کام کو شروع کرتے وقت چھینک آجانا منحوس سمجھا جاتا ہے۔ آخر کون سی عقلی دلیل پر؟ اسی طرح بہت سی ایسی باتیں ہمارے اطراف میں رائج ہیں۔ جن کا اگر تذکرہ کیا جائے تو ایک دفتر ہو جائے گا اور جو رفتہ رفتہ اس قدر حد اعتدال سے بڑھ گئی ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ بعض تو سراسر گناہ اور شرک کے درجے پر پہنچ گئی ہیں۔"[۱۲۴]

ایس۔ اے۔ کرمانیہ نے اپنے مضمون "ضعیف الاعتقادی"[۱۲۵] میں ہندوستانی معاشرے میں پائے جانے والے مسائل اور تواہم کے حوالے سے بات کی۔ اس ضمن میں انھوں نے یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ ضعیف الاعتقادی سے انسان کا خدا پر اعتقاد کمزور پڑ جاتا ہے اور انسان بڑی مشکلات میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے پڑھے لکھے روشن خیال افراد کو بھی ہدف تنقید بنایا ہے جو علم و شعور رکھنے کے باوجود ان وہموں میں مبتلا ہیں اور زندگی کو مشکل بنائے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اس مسئلے کے حل کے لیے یہ تجویز پیش کی کہ بچپن میں ہی بچے کے ذہن میں اسلامی عقائد راسخ کیے جائیں اور اوہام پرستی کے نقائص بیان کیے جائیں تاکہ آئندہ نسل اس سے محفوظ رہ سکے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو خود ساختہ مشکلات میں گھرے ہوئے یہ لوگ اپنی زندگی کو الجھنوں کی بھینٹ چڑھا دیں گے۔ اسی ضمن میں آنسہ ع۔ب نے اپنے مضمون "پشاور میں ضعیف الاعتقادی"[۱۲۶] کے عنوان سے ہندوستانی معاشرے کے مسائل اور یہاں کے باشندوں کے تواہم کا تذکرہ کیا ہے۔

جمیلہ بیگم نے اپنے مضمون "شادی کا ہرجانہ"[۱۲۷] میں بین الاقوامی سطح پر پائے جانے والے تواہم کا تذکرہ کرتے ہوئے ہندوستانی مستورات کو ان سے باز رہنے کی تلقین کی ہے۔ ان کے مطابق تواہم پرستی انسان کی زندگی کو مشکل بنا دیتی ہے اور وہ بلاوجہ کی پریشانی میں مبتلا رہتا ہے۔

مسز سید احمد نے اپنے مضمون "جہالت اور توہم پرستی"[۱۲۸] میں ہندوستان کی تعلیمی صورت حال کے تناظر میں وہاں کے حالات و واقعات کا جائزہ لیا ہے۔ ان کے نزدیک تعلیم سے انسان میں بہتر شعور زندگی پیدا ہوتا ہے اور وہ مختلف قسم کی تواہمات اور فرسودہ خیالی سے محفوظ رہتا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے دیہی اور شہری زندگی کے

تقابل سے یہ باور کروانے کی کوشش کی ہے کہ چونکہ شہروں میں خواتین کے لیے تعلیمی سہولیات کا انتظام دیہات کی نسبت بہتر ہوتا ہے اسی لیے یہاں کی خواتین دیہی خواتین کی نسبت روشن خیال اور بہتر شعور و آگہی رکھتی ہیں۔ مسز سید احمد کے نزدیک شہری خواتین میں توہم پرستی کو رجحان بھی ان کی تعلیم کی بدولت بہت کم پایا جاتا ہے جب کہ گاؤں کی عورت کم فہمی اور لاعلمی کی وجہ سے قدیم فرسودہ روایات میں الجھی مختلف قسم کی توہمات سے خوف کھاتے اپنی زندگی بسر کر دیتی ہے۔ جب کہ باشعور عورت موقع محل کے مطابق اپنی دانش سے معاملات پر قابو پا لیتی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے توہم کا شکار ان عورتوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو اپنی جہالت اور توہم پرستی کی وجہ سے سخت سے سخت مشکل میں بھی کوئی تدبیر نہیں کرتے۔ ایسے لوگ سخت مرض میں بھی معالج سے رجوع نہیں کرتے اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ ایسے لوگ علاج سے اس قدر خائف رہتے ہیں کہ دوا کی نسبت تعویذ گنڈوں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور ان کا مکمل یقین اس تعویذ کے اثر پر منحصر ہوتا ہے اور وہی اسی کی جھاڑ پھونک میں وقت برباد کر دیتے ہیں یوں مسئلے کا مناسب حل نہ نکلنے کی وجہ سے حالت ابتر ہو جاتی ہے۔ مسز سید احمد کے مطابق جب تک ہندوستان میں تعلیم عام نہیں ہو گی توہمات کا خاتمہ ممکن نہیں ہے۔ اس ضمن میں لکھے گئے مضامین میں درج ذیل شامل ہیں:

مضمون نگار	مضمون کا عنوان
آنسہ جلیس	توہم اور باطل پرستی[۱۲۹]
محمدی بیگم	رسم و رواج کی پابندی[۱۳۰]
امینہ خاتون و فاطمہ خاتون	شادی میں بے جا رسوم[۱۳۱]
فرخندہ ایوب خاں	اصلاح طلب رسوم[۱۳۲]
حجاب اسماعیل	شگون پرستی اور نجوم[۱۳۳]
حمیدہ بیگم	شرک[۱۳۴]

متذکرہ بالا تمام عوامل کو مد نظر رکھا جائے تو یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کا سماجی ڈھانچہ اس قدر لچک دار تھا کہ ہر تہذیب، ثقافت اور سماج کے گروہ کی رسوم و رواج کا اثر ان پر واضح ہوا۔ یہ اثر اس حد تک پختہ تھا کہ بعد ازاں ان رسوم و رواج کو جو غیر سے مستعار لی گئی تھیں، انھیں اپنا سمجھ کر برتا جانے لگا۔ دوسری طرف یہ معاملہ بھی کھلتا ہے کہ ہندوستانی قوم ایک عرصہ تسلط میں رہنے کے بعد اپنی ریت رواج سے منحرف ہو گئی اور دوسروں کے رسوم و رواج کو دل سے اپنائے بیٹھی رہی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستانی قدیم تہذیب کے اپنے رنگ پھیکے پڑنے لگے

اور غیر تہذیب کا رنگ نکھر کر سامنے آگیا۔ اس سے ان کے تشخص کو بھی ٹھیس پہنچی اور اقدار بھی مجروح ہوئیں۔

ہندوستان میں ایک روشن خیال با شعور طبقہ ایسا بھی موجود تھا جنھوں نے ان مسائل کے حل کے لیے کوششیں کیں اور مستورات میں پائے جانے والے عام مسائل کی تلافی کے لیے حل تجویز کیا۔ ان کے مطابق اپنی روایات، رسوم ورواج، مذہبی عقائد سے جڑے رہنے میں ہی انسان کی اصل بھلائی پوشیدہ ہے۔ اگر کوئی قوم دنیا کے نقشے پر اپنا نام برقرار رکھنا چاہتی ہے تو اسے چاہیے کہ اپنی تہذیب و ثقافت اور رسوم ورواج کو کسی قیمت پر نہ چھوڑیں۔ دنیاوی تقاضوں اور وقتی ضرورتوں کے تحت ان میں ترمیم اور اضافے ضرور کریں لیکن اسے یکسر نظر انداز کر دینا ان کی سب سے بڑی شکست ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ادارہ مطبوعات،ہماری ثقافت(کراچی:اسلامی جمیعت طلبہ پاکستان):ص ۴۔ س ن
۲۔ فیض احمد فیض،ہماری قومی ثقافت(کراچی:ادارہ یادگار غالب،۱۹۷۶ء):ص ۱۵۔
۳۔ ایضاً ص ۲۱۔
۴۔ ادارہ مطبوعات،ہماری ثقافت(کراچی:اسلامی جمیعت طلبہ پاکستان):ص ۷،۸۔
۵۔ مبارک دلھن،"پرسا"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد ۳۱،نمبر ۲۰(۱۹ مئی ۱۹۲۸ء):ص ۴۷۶۔
۶۔ ایس۔ آر کرمانیہ،"ماتم پرسی کا لباس"، مشمولہ تہذیب نسواں،جلد ۳۶،نمبر ۱۸(۱۱ مارچ ۱۹۳۳ء): ص ۲۵-۲۵۱۔
۷۔ سیدہ تتھلی،"ہمارا لباس اور زیور"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد ۸،نمبر ۳۴(۲۶ اگست ۱۹۰۵ء): ص ۳۵۲تا۳۵۴۔
۸۔ امتہ الرؤف بیگم،"مسلم خواتین کا لباس"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد ۳۴،نمبر ۲۶،(۲۷جون ۱۹۳۱ء):ص ۵۹۸،۶۰۱۔
۹۔ فاطمہ بنت کے محمد حسین،"ہمارا لباس"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد ۳۱،نمبر ۲۰(۱۹ مئی ۱۹۲۸ء):ص ۴۶۹تا۴۷۲۔
۱۰۔ فاطمہ بنت کے محمد حسین،"قومی لباس کی ضرورت" مشمولہ تہذیب نسواں،جلد ۳۶،نمبر ۷(۱۸ فروری ۱۹۳۳ء):ص ۱۸۵تا۱۸۷۔
۱۱۔ مسز قاضی سید سناء الدین "مسلم خواتین کا لباس"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد ۳۴،نمبر ۳۷،(۱۲ ستمبر ۱۹۳۱ء):ص ۹۲۵تا۹۲۷۔
۱۲۔ جمیلہ سید حسن،"سنگھار کے لوازمات"، مشمولہ تہذیب نسواں،جلد ۵۲،نمبر ۳(۱۵ جنوری ۱۹۴۹ء):ص ۶۴تا۶۷۔
۱۳۔ آصف جہاں بیگم،"لباس اور زیور"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد ۳۳(۱۲ اگست ۱۹۳۹ء):ص ۷۸۵۔
۱۴۔ سلطانہ بیگم محولہ غ۔ج بیگم،"لباس"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد ۸،نمبر ۳۷(۱۶ ستمبر ۱۹۰۵ء): ص ۳۸۷۔

۱۵۔ فاطمہ بنت کے محمد حسین صاحب بنگلوسٹی، "ہمارا لباس"، مشمولہ تہذیب نسواں شمارہ ۲۰(۱۹ مئی ۱۹۲۸ء): ص ۴۶۹ تا ۴۷۲۔

۱۶۔ سلطانہ فیضی ، "، مشنری بیبیاں"، مشمولہ تہذیب نسواں ، جلد ۳۴، نمبر، ۴۳(۲۴ اکتوبر ۱۹۳۱ ء): ص ۱۱۰۳ تا ۱۱۰۶۔

۱۷۔ مسز نیاز صابر، "لڑکیوں کا لباس"، مشمولہ تہذیب نسواں ، جلد ۳۶، نمبر ۳۶(۱۳ نومبر ۱۹۳۳ء): ص ۷۳۹ تا ۷۴۰۔

۱۸۔ ثریا پروین، "لباس"، مشمولہ تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۱۰(۴ مارچ ۱۹۴۴ء): ص ۱۴۹ تا ۱۵۱۔

۱۹۔ مسز عبدالغنی، "مسلم خواتین کا لباس"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر، ۳۲(۸ اگست ۱۹۳۱ء): ص ۸۱۶ تا ۸۱۷۔

۲۰۔ صالحہ خاتون دسنوی، "لباس کی تخصیص"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر، ۱۲(۲۵ مارچ ۱۹۳۳ء): ص ۲۷۴ تا ۲۷۶۔

۲۱۔ سیدہ فضیلت، "ہمارا لباس"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۱۸، شمارہ ۳۴(۲۱ اگست ۱۹۱۵ء): ص ۴۰۴۔۴۰۲۔

۲۲۔ خورشید بیگم، "لباس"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۲۱، شمارہ ۳۲(۱۰ اگست ۱۹۱۸ء): ص ۵۴۳۔۵۴۱۔

۲۳۔ ادارہ مطبوعات، ہماری ثقافت (کراچی: اسلامی جمیعت طلبہ پاکستان): ص ۵، ۶۔

۲۴۔ خدیجۃ الکبریٰ، "اصلاح معاشرت"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۱۰، (۱۰ مارچ ۱۹۲۸ء): ص ۲۳۴ تا ۲۳۵۔

۲۵۔ جمیلہ بیگم، "عورتیں اور تمباکو نوشی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴(۲۹ جولائی ۱۹۳۹ء): ص ۳۸۷۔

۲۶۔ رضیہ دلشاد بیگم، "آج کل کی فیشن پرستی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر، ۱۹(۱۳ مئی ۱۹۳۳ء): ص ۴۴۴ تا ۴۴۶۔

۲۷۔ زرینہ خاتون، "ترک رسوم "، مشمولہ تہذیب نسواں ، جلد ۳۶، نمبر، ۲۸(۱۵ جولائی ۱۹۳۳ء): ص ۶۹۶ تا ۶۹۸

۲۸۔ م۔ رخ بدایونی، "پردہ کی عزت"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۸، نمبر ۳۷(۱۶ ستمبر ۱۹۰۵ء): ص ۳۸۸۔

۲۹۔ بیگم یار محمد خاں "بیجا انگریزی تقلید"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر، ۴۰(۳ اکتوبر ۱۹۳۱ء): ص ۹۹۵ تا ۹۹۷۔

۳۰۔ سردار محمدی بیگم، "معصوم بچوں کے حق پر ڈاکہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۲۰ (۱۶ مئی ۱۹۳۱ء): ص ۴۶۸ تا ۴۷۰۔

۳۱۔ زہرا بیگم "ہندوستانیوں کی بعض عادتیں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۲۱ (۲۳ مئی ۱۹۳۱ء): ص ۴۸۳ تا ۴۸۵۔

۳۲۔ امۃ الرؤف "مسلم خواتین کا لباس"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۲۶ (۲۷ جون ۱۹۳۱ء): ص ۵۹۸ تا ۶۰۰۔

۳۳۔ بلقیس صمد بیگم "مسلم خواتین کا لباس"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۲۹ (۱۸ جولائی ۱۹۳۱ء): ص ۷۳۶ تا ۷۳۸

۳۴۔ شاہزاد جہاں بیگم، "غیر مذہب کے لوگوں سے مراسم"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۵۰ (۱۶ دسمبر ۱۹۳۳ء): ص ۲۱۱۶ تا ۲۱۱۹۔

۳۵۔ فاطمہ صغرا بیگم، "ہماری معاشرت"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۱۷، نمبر ۴۷ (۲۱ نومبر ۱۹۱۴ء): ص ۵۵۷، ۵۵۸۔

۳۶۔ بلقیس بانو، "لڑکیوں کا سینما دیکھنا"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۲۶ (۲۶ جون ۱۹۳۷ء): ص ۵۸۹ تا ۵۹۰۔

۳۷۔ و۔ا، "ہنسیے نہیں"، مشمولہ نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۱۵ (۱۱ اپریل ۱۹۳۱ء): ص ۳۴۹ تا ۳۵۲۔

۳۸۔ آنسہ سروری مصطفیٰ، "تیز مزاج لڑکیاں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۴۲ (۱۷ اکتوبر ۱۹۳۱ء): ص ۱۰۴۴ تا ۱۰۴۵۔

۳۹۔ شاہزاد جہاں بیگم، "چھچھورپن"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۵، نمبر ۲ (۹ جنوری ۱۹۳۲ء): ص ۹ تا ۱۲۔

۴۰۔ آر۔کے، "حسن اخلاق"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۳۱، شمارہ ۴۹ (۸ دسمبر ۱۹۲۸ء): ص ۱۱۹۰۔۱۱۸۸۔

۴۱۔ م۔ن بیگم، "اسلامی زندگی"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۲۱، شمارہ ۱۹ (۱۱ مئی ۱۹۱۸ء): ص ۲۹۸۔ ۲۹۶۔

۴۲۔ میمونہ بیگم، "عجز و انکساری"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۲، نمبر ۱۴ (۱۵ اپریل ۱۹۱۹ء): ص ۲۱۵ تا ۲۱۶۔

۴۳۔ گیتی آرا بیگم ،"اسلام میں رواداری"،مشمولہ تہذیب نسواں ،جلد۲۳،نمبر۱ (۳جنوری ۱۹۲۰ء):
ص ۱۰ تا ۱۴۔

۴۴۔ اہلیہ خواجہ حسین علی،"تحمل"، مشمولہ تہذیب نسواں،جلد۲۳،نمبر۴۶(۱۳نومبر ۱۹۲۰ء):ص
۷۲۹ تا ۷۳۳۔

۴۵۔ بنت شیخ فضل الٰہی ،"ہماری اخلاقی کمزوری"، تہذیب نسواں ،جلد۱۷،نمبر۴۲(۱۷ اکتوبر ۱۹۱۴ء):
ص ۵۰۱۔

۴۶۔ و۔ا،"آداب گفتگو"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد۳۵،نمبر۲۲(۲۸مئی ۱۹۳۲ء):ص ۴۹۷۔

۴۷۔ صالحہ خاتون،"پل صراط"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد۳۶،نمبر۳(۲۱جنوری ۱۹۳۳ء):ص ۶۸۔

۴۸۔ ہمشیرہ فریدالدین احمد،"گرم مزاجی"، مشمولہ تہذیب نسواں ،جلد۱۸،نمبر۳۵(۲۸اگست
۱۹۱۵ء):ص ۴۲۱۔

۴۹۔ م۔ن بیگم،"گفتگو"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد۸،نمبر۴۳(۲۸اکتوبر ۱۹۰۵ء):ص ۴۶۳۔

۵۰۔ الف۔ن بیگم،"گفتگو کے آداب"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد۳۶،نمبر۴۷(۲۵ نومبر ۱۹۳۳ء):
ص ۲۰۳۴ تا ۲۰۳۶۔

۵۱۔ سلطانہ،"اخلاقی اصلاح"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد۳۴،نمبر۳۲(۸ اگست ۱۹۳۱ء):ص ۸۱۵ تا
۸۱۶۔

۵۲۔ صغرا ہمایوں مرزا،"کم سخنی"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد۳۷،نمبر۱(۶جنوری ۱۹۳۴ء):ص ۲۳ تا
۲۵۔

۵۳۔ بیگم ڈاکٹر ایوب خاں،"نقص نکالنا"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد۳۷،نمبر۱۶(۲۱اپریل ۱۹۳۴ء):
ص ۳۶۶ تا ۳۶۸۔

۵۴۔ حجاب امتیاز علی،"دورانِ ملاقات میں گفتگو"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد۳۹،نمبر۵۰(۱۲دسمبر
۱۹۳۶ء)ص ۱۱۹۰ تا ۱۱۹۲۔

۵۵۔ جمیلہ بیگم،"لوگوں سے حسن سلوک"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد۳۷،نمبر۲۵(۲۳جون ۱۹۳۴ء):
ص ۵۸۱ تا ۵۸۵۔

۵۶۔ جمیلہ بیگم،"بدمزاجی"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد۳۷،نمبر۷۶(۱۵ستمبر ۱۹۳۴ء):ص ۸۸۳ تا
۸۸۷۔

۵۷۔ آصفہ خاتون، "ملنا جلنا"، مشمولہ تہذیب نسواں جلد ۱۶(۲۶جون ۱۹۲۳ء): ص ۳۷۴ تا ۳۷۶۔

۵۸۔ بی۔ جے بیگم، "آگرہ میں زنانہ پردہ کلب کی ضرورت"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۳ (۲۱ جنوری ۱۹۲۸ء): ص ۶۷۔

۵۹۔ بنت فضل الرشید خاں، "شیریں زبانی"، مشمولہ تہذیب نسواں،

۶۰۔ شاہزادہ جہاں بیگم، "زنانہ تفریح گاہیں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۱۷(۲۸ مارچ ۱۹۳۱ء): ص ۳۹۴ تا ۳۹۵۔

۶۱۔ شاہزادہ جہاں بیگم، "طرف داری"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۱۸(۱ مئی ۱۹۳۱ء): ص ۴۲۹ تا ۴۳۰۔

۶۲۔ قرۃ العین، "شبہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۱۹(۹ مئی ۱۹۳۱ء): ص ۲۵۰ تا ۲۵۲۔

۶۳۔ ب۔ ج، "تبادلہ خیال"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۳۹(۲۶ ستمبر ۱۹۳۱ء): ص ۹۶۳ تا ۹۶۵

۶۴۔ "اکبر بانو، "دو قابل اصلاح باتیں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۲۵(۲۴ جون ۱۹۳۳ء): ص ۵۸۴

۶۵۔ شاہزادہ جہاں بیگم، "مہمان جانے میں لحاظ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۷، شمارہ نمبر ۷(۱۷ فروری ۱۹۳۴ء): ص ۱۶۱ تا ۱۶۳۔

۶۶۔ شاہزادہ جہاں بیگم، "میل جول کا زمانہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۱۹(۸ مئی ۱۹۳۷ء): ص ۴۴۹ تا ۴۵۱۔

۶۷۔ شاہزادہ جہاں بیگم، "اطلاع دے کر جانا"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۲۵(۱۹ جون ۱۹۳۷ء): ص ۵۷۸ تا ۵۷۹۔

۶۸۔ شاہزادہ جہاں بیگم، "ہمارا آپس میں برتاؤ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۲۸(۱۰ جولائی ۱۹۳۷ء): ص ۶۶۸ تا ۶۶۹۔

۶۹۔ جمیلہ بیگ، "بے موقع ہنسی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۳۵(۳۱ اگست ۱۹۳۵ء): ص ۸۳۶ تا ۸۳۸۔

۷۰۔ صفیہ مدحت خانم، "سیر و تفریح"، مشمولہ تہذیب نسواں جلد ۳۳، شمارہ ۲۶ (۲۸ جون ۱۹۳۰ء): ص ۲۶۵ تا ۲۶۷۔

۷۱۔ فاطمہ بیگم، "سادہ معاشرت"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۹، نمبر ۵۱، (۱۸ دسمبر ۱۹۲۶ء): ص ۸۴۰۔

۷۲۔ ہمشیرہ احمد مبین ،"خواتین ہند اور تمدن جدید"،مشمولہ تہذیب نسواں ،جلد ۲۷،نمبر ۱۹،(۱۰مئی ۱۹۲۴ء):ص۲۸۵تا۲۸۶۔

۷۳۔ رضیہ سلطانہ "کفایت شعاری"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد۳۴،نمبر۲۶(۲۷جون۱۹۳۱ء):ص۶۰۲تا ۶۰۳۔

۷۴۔ بیگم شارق،"اسراف بیجا"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد۳۹،نمبر۱۶،(۱۸اپریل ۱۹۳۶ء):ص۳۶۵تا ۳۶۷۔

۷۵۔ صغرا ہمایوں مرزا،"کفایت شعاری"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد۴۰،نمبر۳(۱۶جنوری۱۹۳۷ء): ص۶۲تا۶۳۔

۷۶۔ ہمشیرہ صدیقی ،"کفایت شعاری "،مشمولہ تہذیب نسواں ،جلد۲۱،نمبر۴۹(۷دسمبر۱۹۱۸ ء): ص۸۱۶تا۸۱۷۔

۷۷۔ ظفر جہاں،"ازدواجی زندگی اور اسراف"،مشمولہ تہذیب النسواں جلد۳۲،شمارہ۲۱(۲۵مئی۱۹۲۹ء): ص۴۸۷۔۴۸۴۔

۷۸۔ فرحت،"فضول خرچی"،مشمولہ تہذیب النسواں جلد۱۸،شمارہ۲۹(۱۷جولائی۱۹۱۵ء):ص۳۴۷۔

۷۹۔ زینب ربانی ،"ہماری معاشرت"،مشمولہ تہذیب نسواں ،جلد۳۳،نمبر۱۶ (۱۹،اپریل۱۹۳۰ء): ص۳۷۳۔

۸۰۔ مسز عزیز الدین،"جہیز"،مشمولہ نسواں،جلد۲۳،نمبر۲(۱۰،جنوری۱۹۲۰ء):ص۵۷۔

۸۱۔ سلطانہ بیگم،"سینما پر ایک تنقیدی نظر"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد۴۴،نمبر۲۶(۲۸جون۱۹۴۱): ص۵۸۳تا۵۸۶۔

۸۲۔ مسز سید احمد،"مچھلی شہری"ہماری بے بسی"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد۴۰،شمارہ نمبر۲۴،(۱۲جون ۱۹۳۷ء):ص۵۴۹۔

۸۳۔ شاہزاد جہاں بیگم، "بد تہذیبی "،مشمولہ تہذیب نسواں ،جلد۳۶،نمبر۱۵(۲۸جولائی ۱۹۳۳):ص ۶۹۵۔

۸۴۔ حامدہ خیری،"عورتوں کی عید"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد۳۴،نمبر۱۵(۲۵اپریل۱۹۳۱ء):ص۳۹۵ تا۳۹۷۔

۸۵۔ جمیلہ بیگم،"برقع"،مشمولہ تہذیب نسواں،جلد۳۸،نمبر۳۸،(۲۱ستمبر۱۹۳۵ء):ص۹۱۰تا۹۱۴۔

۸۶۔ امت الوحی، "پردہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۴۲(۱۶اکتوبر ۱۹۳۷ء): ص۹۸۹تا۹۹۱۔

۸۷۔ ہمشیرہ عبدالمالک ، "کنواری لڑکیوں کا پردہ "، مشمولہ تہذیب نسواں ، جلد ۳۴، نمبر ۴۲(۱۷اکتوبر ۱۹۳۱ء): ص۱۰۴۷تا۱۰۴۸۔

۸۸۔ مس طیب رضانہٹوری، "کنواری لڑکیوں کا پردہ سے پردہ"، تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۳۹(۲۶ ستمبر ۱۹۳۱ء): ص۹۷۰تا۹۷۱۔

۸۹۔ مسز قطب الدین دسنوی، "پردہ کے اندر پردہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۴۴(۳۱اکتوبر ۱۹۳۱ء): ص۱۱۱۷تا۱۱۱۹۔

۹۰۔ مسز اے حمید، "پردہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۵، نمبر ۱۳(۲۶مارچ ۱۹۳۲ء): ص۲۸۵تا۲۸۶۔

۹۱۔ امت الوحی، "پردے کی وجہ سے بچت"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۳۰، شمارہ ۳۷(۱۰ ستمبر ۱۹۲۷ء): ص۷۵۲-۷۵۰۔

۹۲۔ ایضاً، "پردہ"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۳۱، شمارہ ۵۰(۱۵دسمبر ۱۹۲۸ء): ص۱۲۰۲۔۱۲۰۱۔

۹۳۔ صفیہ مدحت خانم، "پردہ نشین و بے پردہ خواتین"، تہذیب نسواں ، جلد ۳۳، نمبر ۳۸، (۲۰ ستمبر ۱۹۳۰ء): ص۹۳۴۔

۹۴۔ سعیدہ ہمشیرہ ڈاکٹر سید شفیع الدین"،ڈاکٹر سے پردہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۱۵(۱۵، اپریل ۱۹۳۳ء): ص۳۵۶تا۳۵۷۔

۹۵۔ مبارک دلھن، "موٹر کا سفر"، مشمولہ تہذیب نسواں ، جلد ۳۳، نمبر ۳۳، (۱۶اگست ۱۹۳۰ء): ص ۸۶۷،۸۶۸۔

۹۶۔ خدیجۃ الکبریٰ، "ہندوستان کا مروجہ پردہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۵(۱۸مئی ۱۹۲۸ء): ص ۴۱۸۔

۹۷۔ ب۔ن آنسہ ابراہیم، "برقع"، مشمولہ تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۴۲(۱۴اکتوبر ۱۹۴۴ء): ص۶۱۶۔

۹۸۔ خاکسار بنت حفظ الکریم انصاری، "لڑکیوں کا پردہ عورتوں سے"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۵ (۲فروری ۱۹۲۴ء): ص۶۸تا۷۰۔

۹۹۔ نذر سجاد حیدر، "پردہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۹(۲۷فروری ۱۹۳۷ء): ص۱۹۳تا۱۹۵۔

۱۰۰۔ مسز ضیا الحسن، "پردہ اور ہم"، مشمولہ تہذیب نسواں ، جلد ۴۰، نمبر ۱۲(۲۰مارچ ۱۹۳۷ء): ص۲۶۹تا۲۷۱۔

۱۰۱۔ ایضاً، "پردہ اور ہم"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۱۳(۲۷ مارچ ۱۹۳۷ء): ص ۲۸۹ تا ۲۹۱۔

۱۰۲۔ سیدہ اشرف، "موجودہ پردہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۴، نمبر ۳۹، (۲۷ ستمبر ۱۹۴۱ء): ص ۸۳۰ تا ۸۳۲۔

۱۰۳۔ ایضاً، "موجودہ پردہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۴، نمبر ۴۰، (۴ اکتوبر ۱۹۴۱ء): ص ۸۴۴ تا ۸۴۶۔

۱۰۴۔ رضیہ سلطان، "پردہ معاشرتی حیثیت سے"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۳۱، شمارہ ۴۷ (۲۴ نومبر ۱۹۲۸ء): ص ۱۱۳۳۔۱۱۳۱۔

۱۰۵۔ اہلیہ سید ہمایوں مرزا، "پردہ پر بحث"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۲۱، شمارہ ۲۴ (۱۵ جون ۱۹۱۸ء): ص ۳۸۷۔۳۸۳۔

۱۰۶ ادریس بیگم، "پردہ"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۳۱، شمارہ ۵۱ (۲۲ دسمبر ۱۹۲۸ء): ص ۱۲۲۶۔۱۲۲۵

۱۰۷۔ گ۔ن، "شرعی لباس"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۳۱، شمارہ ۵۱ (۲۲ دسمبر ۱۹۲۸ء): ص ۱۲۲۹۔ ۱۲۲۸۔

۱۰۸۔ زیب النسا بیگم، "پردہ"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۳۲، شمارہ ۴ (۲۶ جنوری ۱۹۲۹ء): ص ۸۶-۸۵۔

۱۰۹ ۔شاہزاد جہاں بیگم، "پردے کی نسبت میرا خیال"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۳۳، شمارہ ۱۳ (۲۹ مارچ ۱۹۲۰ء): ص ۳۰۲۔۳۰۱۔

۱۱۰۔ بلقیس بیگم، اپنا نام کیونکر لکھیں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۴۵، (۱۰ نومبر ۱۹۱۷ء): ص ۷۱۸

۱۱۱۔ شاہزاد جہاں بیگم، "نام چھپانا"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۳۰ (۲۸ جولائی ۱۹۳۴ء): ص ۷۱۰ تا ۷۱۱۔

۱۱۲۔ دختر نواب ممتاز یار الدولہ بہادر، "ہندوستان میں چھٹی چھلا"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۹، نمبر ۴۱، (۱۳ اکتوبر ۱۹۰۶ء): ص ۴۸۴، ۴۸۵۔

۱۱۳۔ ثریا پروین، "پاکستان میں عورت کا درجہ اور فرائض"، مشمولہ تہذیب نسواں جلد ۵۱، نمبر ۱۸-۱۹، ۱-۸ مئی ۱۹۴۸ء) : ص ۲۳۴۔

۱۱۴۔ اہلیہ سید احمد سبزواری، "ہماری مفلسی کی وجہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۶، شمارہ نمبر ۲۳ (۱۰ جون ۱۹۳۳ء): ص ۵۴۴ تا ۵۴۵۔

۱۱۵۔ نسیم بانو، "جاہلوں میں رسمیں "، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۲ (۱۳ جنوری ۱۹۳۴ء): ص ۴۶ تا ۴۷۔

۱۱۶۔ آنسہ تنویر فاطمہ، "رسموں پر فضول خرچی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۷، شمارہ نمبر ۳۹، (۲۹ ستمبر ۱۹۳۴ء): ص ۹۳۱ تا ۹۳۳۔

۱۱۷۔ جمیلہ بیگم، "فضول چیزیں"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۹، نمبر ۴۱ (۱۰ اکتوبر ۱۹۳۶ء): ص ۹۸۵ تا ۹۸۹

۱۱۸۔ مبارک دلھن، "قانوناً شادیوں میں اصلاح کی ضرورت"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۳۸ (۱۸ ستمبر ۱۹۳۷ء): ص ۸۹۹ تا ۹۰۱۔

۱۱۹۔ بیگم محمد فضائل، "بری رسمیں"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۲۵، شمارہ ۵۱ (۲۳ دسمبر ۱۹۲۲ء): ص ۸۱۲-۸۱۰۔

۱۲۰۔ بیگم محمد حمایت اللہ خان، "شادی اور غمی کی بیہودہ رسوم"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۱، نمبر ۱ (۲۱ دسمبر ۱۹۱۸ء): ص ۸۴۸ تا ۸۴۵۔

۱۲۱۔ ایضاً، "شادی اور غمی کی بیہودہ رسوم"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۲، نمبر ۳ (۱۸ جنوری ۱۹۱۹ء): ص ۳۳ تا ۳۵۔

۱۲۲۔ ایم بانو، "بدایوں میں رسوم غمی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۲۲، نمبر ۱۸ (۳ مئی ۱۹۱۹ء): ص ۲۸۵ تا ۲۸۶۔

۱۲۳۔ آصفہ خاتون، "نافرمانی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۲۹، (۱۹ جولائی ۱۹۳۰ء): ص ۷۳۳ تا ۷۳۴۔

۱۲۴۔ صالحہ خاتون، "توہمات"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۵، نمبر ۴۹ (۳ دسمبر ۱۹۳۲ء): ص ۲۰۶۲، ۲۰۶۱۔

۱۲۵۔ ایس اے کرمانیہ، "ضعیف الاعتقادی" مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۵، نمبر ۱ (۲ جنوری ۱۹۳۲ء): ص ۹ تا ۱۲۔

۱۲۶۔ آنسہ ع۔ب، "پشاور میں ضعیف الاعتقادی"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۵، نمبر ۳۳ (۱۳ اگست ۱۹۳۲ء): ص ۵۸۲ تا ۵۸۵۔

۱۲۷۔ جمیلہ بیگم، "شادی کا ہرجانہ"، مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۱۳ (۱۳ مارچ ۱۹۳۴ء): ص ۲۹۸ تا ۲۹۹۔

۱۲۸۔ مسز سید احمد مچھلی شہری، "جہالت اور توہم پرستی" تہذیب نسواں، جلد ۳۹، نمبر ۱۵ (۱۱ اپریل ۱۹۳۶ء): ص ۳۴۸ تا ۳۵۱۔

۱۲۹۔ آنسہ جلیس، "توہم اور باطل پرستی" مشمولہ تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۲۰ (۱۵ مئی ۱۹۳۷ء):
ص ۴۵۷ تا ۴۵۹

۱۳۰۔ محمدی بیگم، "رسم و رواج کی پابندی"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۳۱، شمارہ ۲۸ (۱۴ جولائی ۱۹۲۸ء):
ص ۶۸۷۔ ۶۸۴۔

۱۳۱۔ امینہ خاتون و فاطمہ خاتون، "شادی میں بے جا رسوم"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۳۱، شمارہ ۲۸ (۱۴
جولائی ۱۹۲۸ء): ص ۶۹۵۔ ۶۹۲۔

۱۳۲۔ فرخندہ ایوب خاں، "اصلاح طلب رسوم" تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۴۵ (۱۰ نومبر ۱۹۳۴ء):
ص ۱۰۷۳ تا ۱۰۷۶۔

۱۳۳۔ حجاب اسماعیل، "شگون پرستی اور نجوم"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۳۱، شمارہ ۴۸ (یکم دسمبر ۱۹۲۸ء):
ص ۱۱۶۰۔ ۱۱۵۷۔

۱۳۴۔ حمیدہ بیگم، "شرک"، مشمولہ تہذیب النسواں جلد ۳۲، شمارہ ۱۶ (۲۰ اپریل ۱۹۲۹ء): ص ۳۷۶۔ ۳۷۵۔

ماحصل

ماحصل

یہ تحقیق تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین کے نسائی شعور کی تحقیق و تجزیے پر مشتمل ہے۔ دوران تحقیق کیفیتی طرز تحقیق کے مطابق متن کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین کے نسائی شعور کو پرکھنے کے لیے میر گوٹ بدران (Margot Badran) کو بطور تحقیقی ڈھانچا استعمال کیا گیا ہے۔ میر گوٹ بدران نے انیسویں صدی کے اواخر میں خواتین کی سماجی بیداری اور سماجی شعور کے حوالے سے کیے گئے اقدامات اپنی کتاب Feminism in Islam میں پیش کیے۔ جس میں شعور سے فعالیت تک (Consciousness to Activism) میں اسلامی ممالک بالخصوص مصر میں تحریک نسواں کے مباحث پر بات کی گئی ہے۔ میر گوٹ بدران کے فریم ورک کے انتخاب کی ایک اہم وجہ اس وقت کے مصر اور ہندوستان میں مسلم خواتین کی صورت حال کی مماثلتیں ہے۔ دونوں جانب خواتین ایک سے مسائل سے دوچار تھیں۔ جن میں بطور خاص پردے سے متعلق مسائل، عوامی مناصب میں حصہ داری نہ ہونا، تعلیمی سہولیات کی عدم دستیابی اور گھریلو زندگی کے مسائل وغیرہ شامل ہیں۔ تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین نے بھی اپنے مضامین میں انھی مسائل کا احاطہ کیا ہے، جو اس دور کے ہندوستانی سماج میں عورت کی حیثیت کی مکمل عکاسی کرتے ہیں۔

نو آبادیاتی ہندوستان کے سماجی حالات کسی بھی جدید رویے کو اپنانے کے لیے ساز گار نہیں تھے۔ دیگر اقوام جہاں جدید رویوں اور رجحانات سے متعارف ہو کر ترقی کر رہے تھے وہیں ہندوستانی قوم اپنی تہذیب اور روایات کو لپیٹے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی تھی۔ گویا انھوں نے تعلیم و ترقی کے تمام در اپنے اوپر خود بند کر لیے تھے۔ اس صورت میں سرسید اور ان کے رفقائے کار کی خدمات خصوصی طور پر توجہ کی متقاضی ہیں جنھوں نے کڑی تنقید برداشت کی اور ہندوستانی معاشرے کو دنیاوی معاملات میں بہتر کرنے کی سعی کی۔ ہندوستانی روایت پسندی کو مد نظر رکھتے ہوئے اوائل میں محض مردوں کے لیے تعلیم و آگہی کی کوششیں کی گئیں۔ بعد ازاں ایسا طبقہ پیدا ہوا جو جدید تقاضوں سے آگاہ تھا اور ہندوستانی خواتین کی زبوں حالی پر پریشان بھی تھا۔ ان میں سے چند نے یہاں کی خواتین میں بھی شعور و آگہی پیدا کرنا ضروری سمجھا اور ان کی تعلیم کے لیے مناسب اقدامات کیے۔ اس دور میں چوں کہ پردے کی خاص پابندی تھی اس لیے شروع میں ایسے رسائل کے اجرا کیا سلسلہ شروع کیا جو گھر بیٹھے خواتین کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کر سکیں۔ اس سلسلے میں مولوی ممتاز علی، علامہ راشد الخیری، شیخ اکرام اور شیخ عبداللہ کی خدمات قابل ستائش ہیں۔ بعد ازاں محمدی بیگم کی ادارت میں تہذیب نسواں کا اجرا کیا گیا تا کہ عورت عورتوں کے مسائل کو

سمجھتے ہوئے معاشرتی اصلاح کا کام جاری رکھ سکے۔ ابتدا میں یہ مرحلہ آسان نہ تھا لیکن آہستہ آہستہ ہندوستانی معاشرے میں اسے قبول کیا جانے لگا اور متعدد خواتین نے بھی اپنے خیالات کا اظہار شروع کیا۔ ان مستورات نے پردے کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے اصلی ناموں کے بجائے مخففات اور دیگر القابات سے اپنے نظریات پیش کیے جو موثر ثابت ہوئے۔

زیر تحقیق مقالے کی تکمیل پانچ ابواب کے تحت کی گئی ہے۔ جن میں ان خواتین کا عصری شعور، سماجی آگہی اور نسائی شعور کو پرکھا گیا ہے۔ پہلے باب میں ہندوستانی سماجی اور معاشرت صورت حال کے پیش نظر فروغِ تعلیم نسواں کے لیے کی گئی کوششوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں ابتدا سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کے خواتین کے لیے شائع کیے گئے رسائل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان میں اکثریت ایسے رسائل کی ہے جو حامیانِ تعلیم و شعورِ نسواں کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ ان رسائل میں بہت سے رسائل کی ادارت خواتین نے بھی کی جن سے اس دور کی عورت کے شعور و فکر سے اپنے عہد کی خواتین کو استادہ کرنے کا موقع مل سکا اور وہ اس قابل ہوئیں کہ اپنے شرعی، اسلامی اور انسانی حقوق سے واقف ہو سکیں اور ان کے حصول کے لیے کوشش کریں۔ علاوہ ازیں ان مستورات نے ہندوستانی عورت میں یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش بھی کی کہ وہ اپنے مسائل کا ادراک کرتے ہوئے ان کے حل کے لیے کوشش کر سکیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو خواتین کے لیے جاری کیے گئے تمام رسائل میں تقریباً ایک سے ہی موضوع ملتے ہیں جن میں سر فہرست تعلیم نسواں ہے۔ خواتین کی تعلیم اس دور کا سب سے اہم مسئلہ تھا اور اس کی اہمیت اجاگر کرنے کے لیے تمام رسائل نے کوشش کی کہ ہندوستانی خواتین کی تعلیم کی راہ میں آنے والی رکاوٹوں کا خاتمہ کیا جا سکے۔ اس ضمن میں بعض لوگوں نے خواتین کی رسمی تعلیم کی مخالفت بھی کی لیکن مصنفین کی بھرپور کوششوں سے بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں عورت کی رسمی تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان رسائل میں تربیتِ اطفال کے ضمن میں بھی عورت کی تعلیم کی اہمیت کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی اور پڑھی لکھی اور کم تعلیم یافتہ یا ان پڑھ خواتین کی اولادوں کے تقابل سے تعلیم کی اہمیت واضح کی گئی۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ پردے کے مباحث، جن میں بالخصوص غیر شرعی پردے کی مخالفت کے حوالے سے بہت سے رسائل نے خاص طور پر شعور و آگہی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان مصنفین نے اسلامی شعار کے مطابق زندگی کے گزر بسر کرنے اور عورت پر لادی گئی غیر شرعی پردے کی رکاوٹ کی مخالفت کرتے ہوئے یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ عورت کو بھی مرد کی آزاد پیدا کیا گیا ہے۔ سماجی اور معاشرتی دباؤ کی وجہ سے عورت چار دیواری میں مقید کرنا ان کی فکر اور صلاحیتوں کو ختم کرنے کے برابر ہے اور اگر عورت اپنی صلاحیتوں کا درست استعمال نہیں کر سکے گی تو معاشرہ ابتری کا شکار ہوتا چلا جائے گا۔ عورت کے سماجی میل ملاپ کی افادیت بھی ضروری قرار دی گئی جس

سے وہ اپنی ہم عصر خواتین سے بہتر شعورِ زندگی حاصل کر کے اپنے معمولات کو بہتر بنا سکتی ہے۔ ان رسائل نے عورتوں کو ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کیا جہاں وہ آزادانہ اپنی فکر کا اظہار کر سکیں تاکہ زندگی میں در پیش مسائل کے حوالے سے بھی ایک دوسرے کی باہمی مشاورت سے حالات کو بہتر بنانے کی سعی کر سکیں۔

عورت کی خانگی اور ازدواجی زندگی سے متعلق مسائل کو بھی بطور خاص موضوع بنایا گیا۔

تحقیق کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ اس دور کی خواتین اپنے دور کے مسائل سے بخوبی واقف تھیں اور بہتر سماجی شعور رکھتی تھیں۔ ان مصنفین نے ہندوستانی معاشرے میں عورت کے حقوق کے حوالے سے متعارف کروایا جو انھیں بحیثیت انسان تفویض کیے گئے ہیں۔ جن میں سماجی اور سیاسی حقوق شامل ہیں۔

تعلیم انسان کا بنیادی حق ہے جسے معاشرے کے کسی خاص طبقے تک محدود نہیں رکھا جا سکتا۔ اسلام میں بھی بارہا دونوں طبقوں کی تعلیم کی اہمیت کو باور کروایا گیا ہے۔ لیکن نو آبادیاتی ہندوستان میں محض مرد کی تعلیم کو ضروری سمجھا گیا اور عورت کو یکسر اس حق سے محروم کر دیا گیا۔ تہذیب نسواں کی مصنفین نے اس مسئلے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے یہ شعور دینے کی کوشش کی کہ تعلیم ہر انسان کے لیے یکساں اور ضروری ہے۔ اور عورت کی تعلیم تو اس لیے بھی زیادہ ضروری ہے کہ وہ آئندہ نسل کی تربیت کے فرائض سرانجام دے رہی ہوتی ہے۔ اگر بچے کی ابتدائی تربیت ہی مناسب خطوط پر نہیں کی جائے گی تو وہ معاشرے کا بہتر فرد نہیں بن پائے گا۔ ان مصنفین نے ہندوستانی مستورات کو تعلیم کی اہمیت سے روشناس کروایا اور انھیں اپنے حق کے حصول کے لیے کوشش کرنے کی تلقین کی۔

بحیثیت انسان عورت کو یہ اختیار ہے کہ وہ اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزار سکے۔ اس سلسلے میں کسی سماجی دباؤ کا کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے۔ وہ اپنے فیصلے لینے میں خود مختار ہے۔ ہندوستانی عورت کو پدر سری معاشرتی نظام کے تحت ہمیشہ حق رائے دہی سے محروم رکھا گیا۔ روایتی شرم و حیا اور پاسداری کی صفات کو اس سے منسوب کر کے کسی بھی فیصلے پر اس کے اختیارات ضبط کر لیے گئے۔ اسے اپنی زندگی کے کسی بھی معاملے میں کوئی رائے دینے، اپنی پسند نا پسند بتانے کا کوئی حق نہیں دیا گیا۔ تہذیب نسواں کی مصنفین نے عورت کے ان حقوق کے تحفظ کی خاطر مستورات کو ان کے حقوق سے متعارف بھی کروایا اور ان کے حصول کے لیے کوشش کرنے کی ترغیب بھی دی۔

اسلام نے عورت کو معاشی طور پر مستحکم بنایا ہے اور اسے یہ اختیار دیا ہے کہ وہ جائیداد رکھ سکتی ہے۔ اپنی مرضی سے خرید و فروخت کر سکتی ہے اور اپنے مال کو اپنی ضرورتوں کے مطابق خرچ کر سکتی ہے لیکن پدر سری نظام نے عورت کے اس حق کو بھی چھین لیا۔ اور عورت کو معاشی طور پر محکوم کر دیا۔ وہ اپنے معمولی خرچ کے لیے بھی مرد کی محتاج ہو گئی۔ ان مصنفین نے معاشی معاملات کی ذیل میں حق مہر کے مسئلے کو بھی موضوع بنایا گیا اور مرد پر اس کی ادائیگی لازمی قرار دی گئی۔

ان مصنفین نے ہندوستان میں رائج پردے کے قدیم اور فرسودہ نظام کو بھی ہدف تنقید بنایا۔ ان کے مطابق پردے کی اوٹ میں خواتین کو ان کے حقوق و فرائض سے محروم رکھا جاتا ہے کیوں کہ یہاں پردہ اسلامی شعار کے مطابق رائج نہیں ہے۔ اسلام میں پردے کے حوالے سے اتنی سخت تاکید نہیں کی گئی جتنی یہاں کی جاتی ہے۔ اسلام میں عورت کو سماجی زندگی کو بہتر طور پر گزارنے کی مکمل آزادی دی گئی ہے۔ لیکن یہاں پردہ انھیں محدود کرنے کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔

ازدواجی معاملات کے حوالے سے بھی اس دور کی عورت کی حالت خراب تھی۔ اسے گھر گرہستی، تربیت اطفال اور خانگی معاملات میں اتنا الجھادیا گیا تھا کہ وہ اسی کو کل کائنات سمجھے فرائض کی ادائیگی میں مگن تھی۔ تہذیب نسواں کی مصنفین نے ان تمام امور کی انجام دہی دونوں فریقین کے لیے لازمی قرار دی اور اسے قرآن و سنت سے ثابت کرنے کی کوشش بھی کی ہے کہ بچے کی تربیت مرد اور عورت دونوں کے ذمے ہے۔

ہندوستانی قانون میں عورت کو محکوم رکھنے کے لیے اسے خلع اور فسخ نکاح کے قوانین سے لاعلم رکھا جاتا تھا تا کہ وہ مرد کے مظالم سہہ سہہ کر اس کے پنجہ استبداد سے باہر نکلنے کی سعی نہ کر سکے۔ حالاں کہ شرعی طور پر عورت اس کی حقدار ہے کہ اگر اس کی اپنے شوہر سے کسی بات پر نہ بن رہی ہو تو وہ اپنے نکاح کو منسوخ کر لے یا پھر خلع کا مقدمہ کرے۔ لیکن ان مستورات کے لیے یہ الفاظ نئے تھے وہ اپنے اپنے حق کے لیے کوشش تو درکنار ان کے مفاہیم سے بھی ناواقف تھیں۔ تہذیب نسواں کی مصنفین نے انھیں ان کے حقوق سے متعارف کروایا تا کہ وہ ذہنی اذیتوں سے چھٹکارا پا کر سکون کی زندگی بسر کر سکیں۔

تہذیب نسواں کی مصنفین تعدد ازدواج اور کثرت اولاد سے ہونے والے معاشرتی مسائل پر گہری نظر رکھتی تھیں۔ ہندوستان میں عورت کو ہمیشہ دوسری بیوی کے نام پر دھمکایا جاتا تھا، جو شرع کے اعتبار سے غلط نہیں ہے۔ لیکن ان کے مطابق مرد اگر اسلامی حقوق کے تحت ایک سے زائد شادی کرنا چاہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ مساوات قائم رکھے۔ اگر اسے اس بات کا احتمال ہو کہ وہ مساوی سلوک نہیں رکھ پائے گا تو اس کے لیے ایک بیوی کافی ہے۔ انھوں نے مستوارت میں یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش کی کہ مرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ایک سے زیادہ شادی کر لے، اس سلسلے میں نہیں گھبرانے کی بجائے اپنے جائز حقوق کے مطالبے پر غور کرنا چاہیے۔

زیر نظر تحقیق سے یہ ثابت ہوا ہے کہ ان خواتین نے اپنی تعلیمات کا سلسلہ اسلامی نظام زندگی، اسلامی قوانین اور طرز حیات کو مد نظر رکھتے ہوئے جاری رکھا۔ وہ کہیں جدید مغربی افکار سے واقف تو تھیں لیکن انھوں نے زیادہ تر معلومات مذہبی اور شرعی حدود میں رہ کر پیش کیں۔ خواتین میں ان کے حقوق کے حوالے سے شعور و آگہی پیدا کی گئی اور ان حقوق کے حصول کے لیے کوشش کا جذبہ پیدا کیا گیا۔ تعلیم، پردہ، رسوم و رواج، گھر گرہستی اور ایسی

کئی بندشیں جو محض انھیں محدود کرنے کے لیے بنائی گئی تھی انھیں اسلام اور شریعت کی رو سے پرکھا گیا اور اسلام میں عورت کے لیے وضع کیے گئے نظام زندگی کے حوالے سے رہنمائی کی گئی۔ اس مقصد کے تحت بہت سی خواتین مصنفین نے بھی پنے نظریات کی عکاسی کی۔ اور مضامین کے ذریعے خواتین کو فرسودہ رسوم و رواج سے نکالنے کی کوشش کی۔ وہ چاہتی تھیں کہ ہندوستانی خواتین فرسودہ رسوم و رواج کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو کر اپنے لیے ایک ایسا لائحہ عمل تشکیل دیں جو انھیں ذہنی طور پر پختہ کریں بجائے اس کے کہ وہ جدید علوم و فنون سے متعارف ہو کر اپنی زندگیوں کو بہتر ڈگر پر لا سکیں وہ انھی رسوم کی زنجیروں میں جکڑی نظر آتی ہیں۔ اس کے لیے انھوں نے نا صرف خواتین بل کہ سماجی صورت حال کو بھی ان روایات سے نکل کر علم و عقل کو بروئے کار لاتے ہوئے زندگی کو بہتر بنانے کا درس دیا۔ وہ سماجی دائرہ کار میں رہتے ہوئے خواتین کی ذہنی آزادی چاہتی تھی جس سے وہ آزادانہ اپنی من مرضی کر کے اپنی زندگی کو بہتر طور پر گزار سکیں۔

تہذیب نسواں کی مضمون نگار خواتین کے نسائی شعور کے ماخذ کے حوالے سے بات کی جائے تو یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ انھوں نے اپنی فکر کی آبیاری اسی خاص ہندوستانی تہذیب میں رہتے ہوئے کی۔ ان مصنفین نے ہندوستانی ماحول اور معاشرے میں تربیت پائی اور وہاں کے سیاہ و سفید سے اچھی طرح واقف ہوئیں۔ ان مصنفین نے سماجی حالات و واقعات اور مسائل پر گہری نظر رکھی اور ان کے حل کے لیے کار بند ہوئیں۔ تہذیب کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے مذہب اور اس سے متعلقہ تعلیمات کو بھی اچھے سے سمجھا اور انھی تعلیمات کو مد نظر رکھتے ہوئے خواتین میں شعور و بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ہندوستانی معاشرے پر مغربی اثرات بھی مرتب ہو چکے تھے اور وہ تمام شعبہ ہائے زندگی کو منتشر کیے ہوئے تھے۔ ان مصنفین نے بھی ان سے کچھ اثر قبول کیا ان کے ضروری اجزا کو برتا لیکن زیادہ ترجیح اپنی روایات اور تہذیب سے جڑے رہنے کو دی۔ ان خواتین کے نسائی شعور کے ماخذ کی بات کی جائے تو ان کی فکر کا ماخذ ان کی اپنی ہندوستانی اور اسلامی تعلیمات ہی تھیں۔ انھوں نے کہیں بھی اس سے انحراف کی راہ نہیں اپنائی نا ہی کسی ایسی فکر کی آبیاری کی جو ان تعلیمات کے خلاف جائے۔

تہذیب نسواں کی مصنفین نے ہندوستانی خواتین میں شعور و آگہی پیدا کرنے کے لیے مذہبی تعلیمات کا سہارا لیا۔ انھوں نے جبر و قدر اور سزا و جزا کے تصور سے بھی ان مستورات کو آگاہ کیا۔ اور اپنی معاشرتی اقدار سے جڑے رہنے کو ضروری تصور کیا۔ انھوں نے انسانی اور قومی تشخص کے لیے روایات و اقدار کی پیروی اور مذہبی تعلیمات پر عمل کو ضروری قرار دیا۔ دیگر تحریوں میں انھوں نے ضرب المثال، کہاوتوں، روایتی اسلامی قصوں، سماجی کہانیوں کے ذریعے مستورات میں آگہی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

مختصراً دیکھا جائے تو تہذیب نسواں کی مصنفین نے اپنے دور کی خواتین کو زندگی کے ہر شعبے میں بہتر

بنانے کی سعی کی۔ اور انھیں ان کے حقوق و فرائض سے متعارف کروایا تا کہ معاشرہ عدم توازن کا شکار نہ ہو جائے۔ ان خواتین کا مقصد کسی خاص طبقے یا مکتب فکر پر تنقید ہر گز نہیں تھا۔ انھوں نے صرف اور صرف ہندوستانی عورت کو اس کا کھویا ہوا مقام دلانے اور اس کے حصول کے لیے عمل پیہم ہونے کی کوشش کی۔ ان خواتین نے مستورات کو ان کے جائز شرعی، مذہبی اور انسانی حقوق کے حصول کے لیے کوشش کرنے کی ترغیب دی اور بس۔ ان کا واحد مقصد ہندوستانی عورت کی تعلیم و ترقی تھا تا کہ ملک و قوم ترقی کے دھانے پر رواں ہو سکیں اور دنیا کے نقشے پر ان کے نقوش ہمیشہ باقی رہیں۔ وہ اپنی کم علمی کے سبب مٹ کر نا رہ جائیں۔

کتابیات

کتابیات

اثر، محمد علی۔"صغرا ہمایوں مرزا:سماجی اور صحافتی خدمات"۔تخلیقی ادب۲(۲۰۰۹ء)۔
احمد ،سیدہ جعفر ۔"حقوق نسواں کی عالمی تحریک:ایک اجمالی جائزہ"۔مشمولہ تاریخ میں عورت کا مقام۔ مرتبہ مبارک علی۔لاہور: تاریخ پبلی کیشنز،۲۰۱۷ء ص۸۵۔
احمد، لیلےٰ۔ عورت جنسی تفریق اور اسلام۔مترجم خلیل احمد۔لاہور:دستاویز مطبوعات،۱۹۹۵ء۔
اختر، جمیل۔" اردو صحافت اور صحافتِ نسواں"مشمولہ:اردو صحافت کے دو سو سال (حصہ دوم)، مرتب ارتضیٰ کریم، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی،۲۰۱۷ء، ص۵۸۷
اختر،نازنین۔شمس العلما سید ممتاز علی کی شخصیت اور علمی،ادبی و صحافتی خدمات۔مقالہ برائے پی ایچ ڈی،۔لاہور:پنجاب یونی ورسٹی، سن ندارد۔ ادارہ مطبوعات ہماری ثقافت،(کراچی:اسلامی جمیعت طلبہ پاکستان):سن ندارد
اشفاق، حمیرا ۔"نو آبادیاتی ہندوستان میں حقوق نسواں کا علمبردار :مولوی ممتاز علی"۔مشمولہ جرنل آف ریسرچ (اردو)،شمارہ۳۱(جون۲۰۱۷):ص۴۳۔
اشفاق، حمیرا،مجموعہ محمدی بیگم،(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،،۲۰۱۹ء)۔
اعظمی، نجم السحر۔علامہ راشد الخیری:شخصیت اور ادبی خدمات۔دہلی:ادارہ بزم خضرراہ،۲۰۰۰۔
اشرفی ،وہاب۔عالمی تحریکِ نسائیت :مضمرات و ممکنات۔دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ۲۰۱۲ء۔
اکرام، شیخ محمد۔انیس نسواں، دہلی، جلدا، نمبرا،۱۹۳۹، ص۵۔
البہی الخولی۔عورت:اسلام کی نظر میں۔مترجم جاوید احسن مجاہد فلاحی۔دہلی:ہندوستان پبلی کیشنز۔سن ندارد۔
القرآن ۔انڈکس مضامین قرآن کریم ۔پاکستان:اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن،۲۰۰۲۔
انیس نسواں۔جلدا، نمبرا،۱۹۳۹۔دہلی۔
انصاری،طیب۔حیدر آباد میں اردو صحافت(۱۸۵۷ تا۱۹۵۹)،(حیدرآباد:اعجاز پرنٹنگ پریس، ۱۹۸۰۔
انصاری،ضیاالدین۔تعلیمی مضامین۔پٹنہ:خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری،۲۰۰۱ء۔

انیس، ہارون۔ "فیمزم اور پاکستانی عورت"۔ مشمولہ اردو ادب اور تانیثیت۔ مرتبہ عابد قاضی۔ اسلام آباد:
پورب اکادمی، ۲۰۱۶ء۔ ص ۲۵۔
الخیری، حازق۔ "محمدی بیگم اور تہذیب نسواں"۔ مشمولہ سیدہ محمدی بیگم اور ان کا خاندان۔ لاہور:
سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸۔ ص ۱۶۔
انصاری، طیب۔ حیدر آباد میں اردو صحافت(۱۸۵۷ تا ۱۹۵۹)۔ حیدر آباد: اعجاز پرنٹنگ پریس،
۱۹۸۰۔
آرا، نسیم۔ اردو صحافت کے ارتقا میں خواتین کا حصہ۔ پاکستان: انجمن ترقی اردو۔ ۲۰۰۸ء۔
آرائیں، محمد کلیم۔ عورت اور ازدواجی زندگی :قرآن مجید کی نظر میں ۔ دہلی: مکتبہ الحسنات،
۱۹۹۸۔
بدران، میر گوٹ۔ (Margot Badran) *Feminism in Islam:Secular and Religious*
Convergences. The University of Minchigan :One world Publications
2009.
بنیاد۔ لاہور ۲۰۱۶۔ شمارہ نمبر ۷۔
بیگم، قیصری۔ النساء، جلد ۲، نمبر ۱۰ (حیدر آباد دکن، ۱۹۲۰ء): ص ۵۔
پاریکھ، رؤف۔ "The Literary Notes: Muhammadi Begum and Tehzeeb-i-Niswan"
DAWN، ۲ نومبر ۲۰۱۵ء۔
پٹیل، رشیدہ۔ پاکستانی عورت کی سماجی و قانونی حیثیت۔ کراچی: کل پاکستان انجمن خواتین،
۱۹۸۱۔
پردہ عصمت، جلد ۱، شمارہ ۲ (لکھنو، یکم رمضان ۱۳۱۸ھ)۔
پردہ نشین۔ جلد ۱، نمبر ۱، ۱۹۰۶۔
پروین، نغمہ۔ "عورتوں کے حقوق سیرت نبوی کی روشنی میں"۔ تاریخ ملاحظہ: ۳۱۔۰۸۔۲۰۲۱۔
http://darululoomdeoband.com/urdu/magazine/new/tmp/02-Auraton
10_Oct_14.htm__MDU%20Huquq%20Ke
تہذیب نسواں سال (۱۹۰۵ء تا ۱۹۴۹ء)۔ (دوران تحقیق جن رسائل سے استفادہ کیا گیا ہے ان کا اندراج ضمیمہ
میں کر دیا گیا ہے)۔

تھانوی، اشرف علی۔بہشتی زیور۔پاکستان: تاج کمپنی لمیٹڈ۔سن ندارد۔
جالبی، جمیل۔پاکستانی کلچر :قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ۔کراچی: مشتاق بک ڈپو، ۱۹۶۴ء۔
جعفر پھلواری، مولانا شاہ محمد۔چند ازدواجی مسائل۔لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۷۲ء۔
جلال الدین عمری، سید۔عورت اسلامی معاشرہ میں۔دہلی: مرکزی مکتبہ اسلامی، ۱۹۹۷ء۔
جہاں، فرحت۔بیسویں صدی میں خواتین کی غیر افسانوی نثر :ایک مطالعہ۔دہلی:
براؤن بک پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء۔
جمیل، خاور۔ادب ،کلچر اور مسائل۔کراچی: رائل بک کمپنی، ۱۹۸۶ء۔
جمیل، عصمت۔نسائی شعور کی تاریخ (اردو افسانہ اور عورت)۔پاکستان: مقتدرہ قومی زبان،
۲۰۱۲ء۔
جمیل، غزالہ۔ The Wire,Resurrecting Century-Old Muslim Women's Voices
From Urdu Magazines، مئی ۲۰۱۶ء۔
جہاں، فرحت۔بیسویں صدی میں خواتین کی غیر افسانوی نثر :ایک مطالعہ۔دہلی:
براؤن بک پبلی کیشنز، ۲۰۱۵۔
جین، جسبیر۔تحریک نسواں:ثقافت ،موضوعیت اور نمائندگی۔مترجم اعزاز باقر۔لاہور: مشعل
بکس، ۲۰۱۴ء۔
چندر، گربچن۔اردو صحافت کا سفر۔دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۷۔
چندر، گربچن۔ اردو صحافت پر ایک نظر۔دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۸۶۔
حاذق الخیری، "محمدی بیگم اور تہذیب نسواں" مشمولہ سیدہ محمدی بیگم اور ان کا خاندان۔لاہور:
سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸۔ص ۱۶۔
حسن، فاطمہ۔ ز۔خ۔ ش:حیات و شاعری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ۔پاکستان: انجمن ترقی اردو،
سن ندارد۔
حسن، فاطمہ۔ فرخی، آصف (مرتبین)۔خاموشی کی آواز:نسائی ادب پر خاتون قلم کاروں کا
اولیں اظہار خیال۔پاکستان: انجمن ترقی اردو، ۲۰۱۸۔
حنا، زاہدہ۔عورت زندگی کا زنداں (مضامین)۔کراچی: شہرزاد، ۲۰۰۴ء۔
حسین عامر۔ "Column:Muhammadi Begum's Lagacy".Dawn,Books and Authors،

۲۷دسمبر ۲۰۲۰ء۔
غلام شبیر رانا۔ "اردو ادب میں تانیثیت کی روایت"۔ مشمولہ پیغام آشنا، جلد ۱۴، شمارہ ۵۳-۵۴، (۲۰۱۳ء)۔
رشید، بینا۔ محمدی بیگم :حیات و خدمات۔ مقالہ برائے ایم فل اردو۔ اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، ۲۰۱۴ء۔
رضوی، حمیدہ معین۔ "فیمنسٹ تحریک کا ادبی منظر نامہ"۔ مشمولہ۔ تخلیقی تنقید:ایک انفرادی نکتہ نظر۔ اسلام آباد: کاروان ملت پبلیکیشنز، سن ندارد۔
رفیق نسواں، جلد ا، شمارہ ۶ (۲۴ اپریل ۱۸۸۵ء): ص ۲۔
ریاض، فہمیدہ۔ "فیمنزم اور ہم"۔ مشمولہ اردو ادب اور تانیثیت(منتخب مضامین)۔ مرتبہ قاضی عابد۔ اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۶ء، ص ۷۔
زبیری، محمد امین۔ مسلم خواتین کی تعلیم۔ کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۶۱ء۔
سالک، عبدالمجید۔ مسلم ثقافت ہندوستان میں۔ لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ پاکستان، سن ندارد۔
سدید، انور۔ پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ۔ پاکستان: اکادمی ادبیات، ۱۹۹۲ء۔
سلطانہ، رفیعہ۔ اردو ادب کی ترقی میں خواتین کا حصہ۔ حیدر آباد: مجلس تحقیقات اردو، سن ندارد۔
سلطانہ، نجمہ۔ "مسلم خواتین کی تعلیمی پسماندگی"۔ مشمولہ ماہانہ اردو دنیا (مارچ ۲۰۱۸ء)۔
سہیلی، جلد ۲، نمبر ۶ (دہلی، ماہ ذی الحجہ ۱۳۳۸ء): سرورق۔
سید احمد قادری۔ اردو صحافت بہار میں۔ بہار: مکتبہ غوثیہ، ۲۰۰۳ء۔
شریف بی بی۔ جلد ا۔ نمبر ۴۔ اکتوبر ۱۹۰۹۔ سرورق۔
شریف بیبیاں۔ لاہور: مطبع خادم التعلیم، جون ۱۸۹۵ء۔
شکیل الرحمٰن۔ زبان اور کلچر۔ سرینگر کشمیر: شاہین بکسٹال، ۱۹۵۸ء۔
شہاب، رفیع الدین۔ منصب حکومت اور مسلمان عورت۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء۔
شیر، انعم۔ اشاریہ ہفتہ وار تہذیب نسواں ۱۸۹۸ تا ۱۹۳۹۔ مقالہ برائے بی ایس اردو۔ اسلام آباد: بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، ۲۰۱۳ء۔
صابری، امداد۔ تاریخ صحافت اردو (جلد اول)۔ دہلی: جدید پرنٹنگ پریس، سن ندارد۔
صابری، امداد۔ تاریخ صحافت اردو (جلد دوم)۔ دہلی: جدید پرنٹنگ پریس، سن ندارد۔

صابری، امداد۔تاریخ صحافت اردو (جلد سوم)۔دہلی: جدید پرنٹنگ پریس، سن ندارد۔
صابری، امداد۔تاریخ صحافت اردو (جلد چہارم)۔دہلی: جدید پرنٹنگ پریس، سن ندارد۔
صدیقی، محمد حسین۔ہندوستان کی بیس بڑی خواتین۔کراچی: زمزم پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء۔
طاہر، نعیم۔سیدہ محمدی بیگم اور ان کا خاندان۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء۔
ظل السلطان، جلد ۱، نمبر ۱، ۱۹۱۲ء۔
عابد، قاضی۔ اردو ادب اور تانیثیت۔اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۶ء۔
عارف، نجیبہ۔"اردو ادب میں تانیثیت کی تحریک"۔مشمولہ رفتہ و آئندہ(اردو ادب کا منظر نامہ)۔
اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۸ء۔
عالم، محبوب(مولوی)۔ اردو صحافت کی ایک نادر تاریخ:فہرست اخبارات ہند۔مدون طاہر
مسعود۔لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۲ء۔
عباس، تہمینہ۔"محمدی بیگم: اردو کی پہلی خاتون مدیرہ"۔مشمولہ ایک روزن، ۱۲-۰۳-۲۰۱۷ء۔
عباس زیدی، افسر۔شمس العلما سید ممتاز علی مرحوم۔مقالہ برائے ایم اے اردو۔لاہور: اورینٹل
کالج۔۱۹۶۷ء۔
عبدالجبار خان، محمد۔اسلامی طرز معاشرت۔لاہور: مطبع شمس الہند، سن ندارد۔
عبدالعلیم خان، حافظ۔ثقافت اسلامی۔علی گڑھ: سرسید بک ڈپو، ۱۹۷۹ء۔
عبداللہ، شیخ۔خاتون ،جلد ۱، نمبر ۱(علی گڑھ، جولائی ۱۹۰۴)۔ص ۳
عبداللہ، شیخ محمد۔اسلام میں عورت کا درجہ ۔علی گڑھ: خدمت پریس، سن ندارد۔
علی، اشرف(مولانا)۔آداب معاشرت۔دہلی: علمی کتاب خانہ، ۱۹۵۳ء۔
علی خان، نادر۔ اردو صحافت کی تاریخ : ۵۷-۱۸۲۲۔علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۵۷ء۔
عصمت۔جلد ۱۔نمبر ۱(جون ۱۹۰۸ء): دہلی۔
عمر، محمد زاہد۔تبسم، فہمیدہ۔"تانیثیت کے ابتدائی نقوش"۔مشمولہ الحمد شمارہ ۱۱(۲۰۱۹ء)۔
فاروقی، شمس الرحمٰن۔"تانیثیت(Feminism) کی تفہیم"،مشمولہ اردو ادب اور تانیثیت۔مرتبہ قاضی
عابد۔اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۶ء۔ص ۴۷۔
فاروقی، عظمیٰ فرمان۔اردو ادب میں نسائی تنقید: روایت ،مسائل و مباحث۔کراچی: سعید پبلی
کیشنز، ۲۰۱۰ء۔

فیض، احمد فیض۔ہماری قومی ثقافت۔کراچی: ادارہ یادگار غالب، ۱۹۷۶ء۔
کوثر، ریحانہ۔"محمدی بیگم کی علمی وادبی تصانیف کا تحقیقی جائزہ" مشمولہ۔خیابان شمارہ ۲۷(۲۰۱۲ء)۔
گوہر، ممتاز۔منتخبات تہذیب نسواں۔لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۸ء۔
مرادآبادی، معصوم۔اردو صحافت کا ارتقا(تاریخی،فنی ،تکنیکی)۔دہلی: اردو اکادمی، ۲۰۱۳ء۔
نائک،ذاکر۔"اسلام میں عورت کے معاشی حقوق"۔مشمولہ۔اسلام میں خواتین کے حقوق۔مترجم سید امتیاز احمد۔لاہور: دارالنوادر، ۲۰۰۶ء۔
مسعود، طاہر۔اردو صحافت انیسویں صدی میں ۔لاہور: فضلی سنز، ۲۰۰۲ء۔
مشیر مادر، جلد۱(۱۹۰۵ء): ص ۲-۱۔
مظہر، نعیم۔"سرسید کا تعلیم نسواں"۔تخلیقی ادب، شمارہ ۶(۲۰۰۹ء)۔
معلم نسواں، جلد ۱۱، نمبر ۴(ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ)۔
مہدی، صغرا مترجم۔ہندوستان میں عورت کی حیثیت۔مرتبہ انڈین کونسل آس سوشل سائنس اینڈ ریسرچ۔ نئی دہلی: ترقی اردو بیورو۔ ۱۹۸۰ء۔
مینو، گیل(Mainualt,Gail)، Secluded Scholars:Women's Education and Muslim Social Reforms in Colinial India.Dehli:Oxfird University press,1998.
سلطانہ، نجمہ ،"مسلم خواتین کی تعلیمی پسماندگی"، مشمولہ ماہانہ اردو دنیا(مارچ ۲۰۱۸ء) تاریخ ملاحظہ ۱ ستمبر ۲۰۲۰ء۔
ندیم، روش۔"نوآبادیاتی دور میں ادب کا فیمینیاتی پس منظر"۔مشمولہ تخلیقی ادب شمارہ ۱۱(۲۰۱۶ء)۔
نعیم، چودھری محمد۔"محمدی بیگم: ایک شعلہ مستعجل"۔مشمولہ امروز۔نمبر ۸(اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۸ء) مترجم ارجمند آرا علی۔گڑھ، ص ۵۷ تا ۸۸۔
ہفتہ وار عورتوں کا اخبار، جنوری ۱۹۳۰ء، دہلی۔
*Women's Education in Colonial India: Transformation of Women's Identity by Colonial, Nationalist and Community reforms(*Education: In and Out!*)*, Tuesday,27 January,2015, http://tiss-toss.blogspot.com/2015/01/womens-education-in-colonial-india.html

ضميمه

ضمیمہ

تہذیبِ نسواں کا اجرا ۱۸۹۸ء میں ہوا اور یہ ۱۹۴۹ء تک جاری رہا۔ نصف صدی تک اس اخبار کے ذریعے ہندوستانی خواتین کی فکری آبیاری کی گئی اور انھیں جدید وقتی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے شرعی اور انسانی حقوق کے بارے میں شعور و آگہی دی گئی تاکہ وہ اپنی حالتِ زار کو سنوارنے کے لائق ہو سکیں۔ زیرِ نظر تحقیق میں تہذیبِ نسواں کی مضمون نگار خواتین کے نسائی شعور کو پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دورانِ تحقیق آج سے قریباً ایک صدی اور دو دہائیاں پہلے جاری والے اس اخبار کے تمام تر شماروں تک رسائی ممکن نہیں ہو سکی، جس میں بالخصوص ۱۸۹۸ء تا ۱۹۰۴ء تک کا کوئی شمارہ دستیاب نہیں ہوا جب کہ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۴۹ء تک کے رسائل سے مشفق خواجہ آن لائن لائبریری، ساؤتھ ایشین ریسرچ اینڈ ریسورس سینٹر اور دیال سنگھ لائبریری کے ذریعے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ دورانِ تحقیق تہذیبِ نسواں کے جن شماروں سے استفادہ کیا گیا ہے ان کی سن وار تفصیل حسبِ ذیل ہے۔:

۱۹۰۵ء:

تہذیب نسواں، جلد ۸، نمبر ۱ (۷ جنوری ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۸، نمبر ۳ (۲۱ جنوری ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۸، نمبر ۱۲ (۲۵ مارچ ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۸، نمبر ۱۴ (۸ اپریل ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۸، نمبر ۱۵ (۱۵ اپریل ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۸، نمبر ۱۶ (۲۲ اپریل ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۸، نمبر ۱۷ (۲۹ اپریل ۱۹۰۵ء)۔ لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۸، نمبر ۱۸ (۶ مئی ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۸، نمبر ۱۹ (۱۳ مئی ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۸، نمبر ۲۰ (۲۰ مئی ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۸، نمبر ۲۱ (۲۷ مئی ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۸، نمبر ۲۲ (۳ جون ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۸، نمبر ۲۳ (۱۰ جون ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۸، نمبر ۲۴ (۱۷ جون ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۸، نمبر ۲۵ (۲۴جون ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۸، نمبر ۲۶ (۱جولائی ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۸، نمبر ۲۷ (۸جولائی ۱۹۰۵)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۸، نمبر ۲۸ (۱۵جولائی ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۸، نمبر ۲۹ (۲۲جولائی ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۸، نمبر ۳۰ (۲۹جولائی ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۸، نمبر ۳۱ (۵اگست ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۸، نمبر ۳۲ (۱۲اگست ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۸، نمبر ۳۳ (۱۹اگست ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۸، نمبر ۳۴ (۲۶اگست ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۸، نمبر ۳۵ (۲ستمبر ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۸، نمبر ۳۶ (۹ستمبر ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۸، نمبر ۳۷ (۱۶ستمبر ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۸، نمبر ۳۸ (۲۳ستمبر ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۸، نمبر ۳۹ (۳۰ستمبر ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۸، نمبر ۴۰ (۷اکتوبر ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۸، نمبر ۴۱ (۱۴اکتوبر ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۸، نمبر ۴۲ (۲۱اکتوبر ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۸، نمبر ۴۳ (۲۸اکتوبر ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۸، نمبر ۴۴ (۴نومبر ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۸، نمبر ۴۵ (۱۱نومبر ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۸، نمبر ۴۶ (۱۸نومبر ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۸، نمبر ۴۷ (۲۵نومبر ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۸، نمبر ۴۸ (۲دسمبر ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۸، نمبر ۴۹ (۹دسمبر ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۸، نمبر ۵۰ (۱۶دسمبر ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۸، نمبر ۵۱ (۲۳دسمبر ۱۹۰۵ء)، لاہور۔

۱۹۰۶ء:

تہذیب نسواں، جلد۹، نمبر۱۹(۱۲مئی۱۹۰۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۹، نمبر۲۹(۲۱جولائی۱۹۰۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۹، نمبر۳۰(۲۸جولائی۱۹۰۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۹، نمبر۳۱(۴اگست۱۹۰۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۹، نمبر۳۲(۱۱اگست۱۹۰۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۹، نمبر۳۳(۱۸اگست۱۹۰۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۹، نمبر۴۱(۱۳اکتوبر۱۹۰۶ء)،لاہور۔

۱۹۰۷ء:

تہذیب نسواں، جلد۱۰، نمبر۱۰(۹مارچ۱۹۰۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۰، نمبر۱۴(۶اپریل۱۹۰۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۰، نمبر۱۵(۱۳اپریل۱۹۰۷)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۰، نمبر۱۶(۲۰اپریل۱۹۰۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۰، نمبر۱۷(۳۰اپریل۱۹۰۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۰، نمبر۱۸(۴مئی۱۹۰۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۰، نمبر۱۹(۱۱مئی۱۹۰۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۰، نمبر۲۰(۱۸مئی۱۹۰۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۰، نمبر۲۱(۲۵مئی۱۹۰۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۰، نمبر۲۲(یکم جون۱۹۰۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۰، نمبر۲۳(۸جون۱۹۰۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۰، نمبر۲۴(۱۵جون۱۹۰۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۰، نمبر۲۶(۲۹جون۱۹۰۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۰، نمبر۲۷(۶جولائی۱۹۰۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۰، نمبر۲۸(۱۳جولائی۱۹۰۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۰، نمبر۲۹(۲۰جولائی۱۹۰۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۰، نمبر۳۰(۲۷جولائی۱۹۰۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۰، نمبر۳۱(۳اگست۱۹۰۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۰، نمبر۳۲(۱۰اگست۱۹۰۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۱۰، نمبر ۳۳ (۱۷ اگست ۱۹۰۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۱۰، نمبر ۳۴ (۲۴ اگست ۱۹۰۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۱۰، نمبر ۳۵، ۳۱ اگست ۱۹۰۷۔ لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۱۰، نمبر ۳۶ (۷ ستمبر ۱۹۰۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۱۰، نمبر ۳۷ (۱۴ ستمبر ۱۹۰۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۱۰، نمبر ۳۸ (۲۱ ستمبر ۱۹۰۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۱۰، نمبر ۳۹ (۲۸ ستمبر ۱۹۰۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۱۰، نمبر ۴۰ (۵ اکتوبر ۱۹۰۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۱۰، نمبر ۴۲ (۱۹ اکتوبر ۱۹۰۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۱۰، نمبر ۴۳ (۲۶ اکتوبر ۱۹۰۷ء)، لاہور۔

۱۹۱۲ء:

تہذیب نسواں، جلد ۱۵، نمبر ۶ (۲۷، جولائی ۱۹۱۲ء)، لاہور۔

۱۹۱۴ء:

تہذیب نسواں، جلد ۱۷، نمبر، ۳۲ (۲۷ جولائی ۱۹۱۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۱۷، نمبر ۴۲ (۱۷ اکتوبر ۱۹۱۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۱۷، نمبر ۴۳ (۲۴ اکتوبر ۱۹۱۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۱۷، نمبر ۴۴ (۳۱ اکتوبر ۱۹۱۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۱۷، نمبر ۴۵ (۷ نومبر ۱۹۱۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۱۷، نمبر ۴۶ (۱۴ نومبر ۱۹۱۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۱۷، نمبر ۴۷ (۲۱ نومبر ۱۹۱۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۱۷، نمبر ۴۸ (۲۸ نومبر ۱۹۱۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۱۷، نمبر ۴۹ (۵ دسمبر ۱۹۱۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۱۷، نمبر ۵۰ (۱۲ دسمبر ۱۹۱۴ء)لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۱۷، نمبر ۵۲ (۲۶ دسمبر ۱۹۱۴ء)، لاہور۔

۱۹۱۵ء:

تہذیب نسواں، جلد ۱۸، نمبر ۱ (۲ جنوری ۱۹۱۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۱۸، نمبر ۲ (۹ جنوری ۱۹۱۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۱۸، نمبر ۳ (۱۶ جنوری ۱۹۱۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۴(۲۳جنوری ۱۹۱۵لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۶(۶فروری ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۷(۱۳فروری ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۸(۲۰فروری ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۹(۲۷فروری ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۱۲(۲۰مارچ ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۱۳(۲۷مارچ ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۱۴(۳اپریل ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۱۵(۱۰اپریل ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۱۶(۱۷اپریل ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۱۷(۲۴اپریل ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۱۸(۱مئی ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۱۹(۸مئی ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۲۰(۱۵مئی ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۲۱(۲۲مئی ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۲۲(۲۹مئی ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۲۳(۵جون ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۲۴(۱۲جون ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۲۶(۲۶جون ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۲۷،(۳جولائی ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۲۸(۱۰جولائی ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۲۹(۱۷جولائی ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۳۰(۲۴جولائی ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۳۲(۷اگست ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۳۳(۱۴اگست ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۳۴(۲۱اگست ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۳۵(۲۸اگست ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۳۶(۴ستمبر ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۳۷(۱۱ستمبر ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۳۸(۱۸ستمبر ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۳۹(۲۵ستمبر ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۴۰(۲اکتوبر ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۴۱(۹اکتوبر ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۴۲(۱۶اکتوبر ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۴۳(۲۳اکتوبر ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۴۴(۳۰اکتوبر ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۴۵(۶نومبر ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۴۶(۱۳نومبر ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۴۷(۲۰نومبر ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۴۸(۲۷نومبر ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۴۹(۴دسمبر ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۵۰(۱۱دسمبر ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۵۱(۱۸دسمبر ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۸، نمبر۵۲(۲۵دسمبر ۱۹۱۵ء)،لاہور۔

۱۹۱۶ء:

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۱(۱جنوری ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۲(۸جنوری ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۳(۱۵جنوری ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۴(۲۲جنوری ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۵(۲۹جنوری ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۶(۵فروری ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۷(۱۲فروری ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۸(۱۹فروری ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۹(۲۶فروری ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۱۰(۴مارچ ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۱۲(۱۸مارچ ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۱۳(۲۵مارچ ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۱۴(۱اپریل ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۱۵(۸اپریل ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۱۶(۱۵اپریل ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۱۷(۲۲اپریل ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۱۸(۲۹اپریل ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۱۹(۶مئی ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۲۱(۲۰مئی ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۲۲(۲۷مئی ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۲۳(۳جون ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۲۴(۱۰جون ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۲۵(۱۷جون ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۲۶(۲۴جون ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۲۷(۱جولائی ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۲۸(۸جولائی ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۲۹(۱۵جولائی ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۳۰(۲۲جولائی ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۳۱(۲۹جولائی ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۳۲(۵اگست ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۳۳(۱۲اگست ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۳۴(۱۹اگست ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۳۵(۲۶اگست ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۳۶(۲ستمبر ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۳۷(۹ستمبر ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۳۸(۱۶ستمبر ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۳۹(۲۳ستمبر ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۴۰(۳۰ستمبر ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۱۹، نمبر۴۱(۷اکتوبر ۱۹۱۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۱۹، نمبر ۴۲ (۱۴ اکتوبر ۱۹۱۶ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۱۹، نمبر ۴۳ (۲۱ اکتوبر ۱۹۱۶ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۱۹، نمبر ۴۴ (۲۸ اکتوبر ۱۹۱۶ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۱۹، نمبر ۴۵ (۴ نومبر ۱۹۱۶ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۱۹، نمبر ۴۶ (۱۱ نومبر ۱۹۱۶ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۱۹، نمبر ۴۷ (۱۸ نومبر ۱۹۱۶ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۱۹، نمبر ۴۸ (۲۵ نومبر ۱۹۱۶ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۱۹، نمبر ۴۹ (۲ دسمبر ۱۹۱۶ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۱۹، نمبر ۵۰ (۹ دسمبر ۱۹۱۶ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۱۹، نمبر ۵۲ (۲۳ دسمبر ۱۹۱۶ء)، لاہور۔

۱۹۱۷ء:

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۱ (۱ جنوری ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۲ (۶ جنوری ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۳ (۱۳ جنوری ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۴ (۲۰ جنوری ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۵ (۲۷ جنوری ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۶ (۳ فروری ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۷ (۱۰ فروری ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۸ (۱۷ فروری ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۹ (۳ مارچ ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۱۰ (۱۰ مارچ ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۱۱ (۱۷ مارچ ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۱۲ (۲۴ مارچ ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۱۳ (۳۱ مارچ ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۱۴ (۷ اپریل ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۱۵ (۱۴ اپریل ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۱۶ (۲۱ اپریل ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۱۷ (۲۸ اپریل ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۱۸ (۵ مئی ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۱۹ (۱۲ مئی ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۲۰ (۱۹ مئی ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۲۱ (۲۶ مئی ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۲۲ (۲ جون ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۲۳ (۹ جون ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۲۴ (۱۶ جون ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۲۵ (۲۳ جون ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۲۶ (۳۰ جون ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۲۷ (۷ جولائی ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۲۸ (۱۴ جولائی ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۲۹ (۲۱ جولائی ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۳۰ (۲۸ جولائی ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۳۱ (۴ اگست ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۳۲ (۱۱ اگست ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۳۳ (۱۸ اگست ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۳۴ (۲۵ اگست ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۳۵ (۱ ستمبر ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۳۶ (۸ ستمبر ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۳۷ (۱۵ ستمبر ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۳۸ (۲۲ ستمبر ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۳۹ (۲۹ ستمبر ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۴۱ (۱۳ اکتوبر ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۴۲ (۲۰ اکتوبر ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۴۳ (۲۷ اکتوبر ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۴۴ (۳ نومبر ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۴۵ (۱۰ نومبر ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۴۶ (۱۷ نومبر ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۴۷ (۲۴ نومبر ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۴۸ (۱ دسمبر ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۴۹ (۸ دسمبر ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۵۰ (۱۵ دسمبر ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۵۱ (۲۲ دسمبر ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۰، نمبر ۵۲ (۲۹ دسمبر ۱۹۱۷ء)، لاہور۔

۱۹۱۸ء:

تہذیب نسواں، جلد ۲۱، نمبر ۶ (۹ فروری ۱۹۱۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۱، نمبر ۸ (۲۳ فروری ۱۹۱۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۱، نمبر ۹ (۲ مارچ ۱۹۱۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۱، نمبر ۱۲ (۲۳ مارچ ۱۹۱۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۱، نمبر ۱۴ (۶ اپریل ۱۹۱۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۱، نمبر ۱۷ (۲۷ اپریل ۱۹۱۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۱، نمبر ۱۹ (۱۱ مئی ۱۹۱۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۱، نمبر ۲۲ (۱ جون ۱۹۱۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۱، نمبر ۲۴ (۱۵ جون ۱۹۱۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۱، نمبر ۲۵ (۲۶ جون ۱۹۱۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۱، نمبر ۲۶ (۲۹ جون ۱۹۱۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۱، نمبر ۲۷ (۶ جولائی ۱۹۱۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۱، نمبر ۲۹ (۲۰ جولائی ۱۹۱۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۱، نمبر ۳۰ (۲۷ جولائی ۱۹۱۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۱، نمبر ۳۱ (۲ اگست ۱۹۱۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۱، نمبر ۳۲ (۱۰ اگست ۱۹۱۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۱، نمبر ۳۳ (۱۷ اگست ۱۹۱۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۱، نمبر ۳۴ (۲۴ اگست ۱۹۱۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۱، نمبر ۳۵ (۳۱ اگست ۱۹۱۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۱، نمبر ۳۷ (۱۴ ستمبر ۱۹۱۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۱، نمبر ۳۸ (۲۱ ستمبر ۱۹۱۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۱، نمبر۴۱(۱۲اکتوبر۱۹۱۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۱، نمبر۴۲(۱۹اکتوبر۱۹۱۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۱، نمبر۴۳(۲۶اکتوبر۱۹۱۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۱، نمبر۴۴(۲نومبر۱۹۱۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۱، نمبر۴۵(۹نومبر۱۹۱۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۱، نمبر۴۶(۱۶نومبر۱۹۱۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۱، نمبر۴۷(۲۳نومبر۱۹۱۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۱، نمبر۴۸(۳۰نومبر۱۹۱۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۱، نمبر۴۹(۷دسمبر۱۹۱۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۱، نمبر۵۱(۲۱دسمبر۱۹۱۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۱، نمبر۵۲(۲۷دسمبر۱۹۱۸ء)،لاہور۔

۱۹۱۹ء:

تہذیب نسواں، جلد۲۲، نمبر۳(۱۸جنوری۱۹۱۹ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۲، نمبر۱۱(۱۵مارچ۱۹۱۹ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۲، نمبر۱۴(۵اپریل۱۹۱۹ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۲، نمبر۱۸(۳مئی۱۹۱۹ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۲، نمبر۴۲(۱۸اکتوبر۱۹۱۹ء)،لاہور۔

۱۹۲۰ء:

تہذیب نسواں، جلد۲۳، نمبر۱(۳جنوری۱۹۲۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۳، نمبر۲(۱۰جنوری۱۹۲۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۳، نمبر۴(۲۴جنوری۱۹۲۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۳، نمبر۴۶(۱۳نومبر۱۹۲۰ء)،لاہور۔

۱۹۲۲ء:

تہذیب نسواں، جلد۲۵، نمبر۱۸(۶مئی۱۹۲۲ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۵، نمبر۱۹(۱۳مئی۱۹۲۲ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۵، نمبر۲۰(۲۰مئی۱۹۲۲ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۵، نمبر۲۱(۲۷مئی۱۹۲۲ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۵، نمبر۲۲(۳جون۱۹۲۲ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۵، نمبر۲۵(۲۴جون ۱۹۲۲ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۵، نمبر۲۶(۱جولائی ۱۹۲۲ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۵، نمبر۲۷(۸جولائی ۱۹۲۲ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۵، نمبر۲۸(۱۵جولائی ۱۹۲۲ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۵، نمبر۲۹(۲۲جولائی ۱۹۲۲ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۵، نمبر۳۱(۵اگست ۱۹۲۲ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۵، نمبر۳۲(۱۲اگست ۱۹۲۲ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۵، نمبر۳۳(۱۹اگست ۱۹۲۲ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۵، نمبر۳۴(۲۶اگست ۱۹۲۲ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۵، نمبر۳۶(۹ستمبر ۱۹۲۲ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۵، نمبر۳۷(۱۶ستمبر ۱۹۲۲ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۵، نمبر۳۸(۲۳ستمبر ۱۹۲۲ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۵، نمبر۴۸(۲دسمبر ۱۹۲۲ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۵، نمبر۴۹(۹دسمبر ۱۹۲۲ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۵، نمبر۵۰(۱۶دسمبر ۱۹۲۲ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۵، نمبر۵۱(۲۳دسمبر ۱۹۲۲ء)،لاہور۔

۱۹۲۳ء:

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر۱(۳جنوری ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر۲(۱۳جنوری ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر۳(۲۱جنوری ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر۴(۲۷جنوری ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر۵(۳فروری ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر۶(۱۰فروری ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر۷(۱۷فروری ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر۸(۲۴فروری ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر۹(۳مارچ ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر۱۰(۱۰مارچ ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر۱۱(۱۷مارچ ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر ۱۲(۲۴مارچ ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر ۱۳(۳۱مارچ ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر ۱۴(۷اپریل ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر ۱۵(۱۴اپریل ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر ۱۶(۲۱اپریل ۱۹۲۳ء)لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر ۱۷(۲۸اپریل ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر ۱۸(۵مئی ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر ۱۹(۱۲مئی ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر ۲۰(۱۹مئی ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر ۲۱(۲۶مئی ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر ۲۲(۲جون ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر ۲۳(۹جون ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر ۲۴(۱۶جون ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر ۲۵(۲۳جون ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر ۲۶(۳۰جون ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر ۲۷(۷جولائی ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر ۲۸(۱۴جولائی ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر ۲۹(۲۱جولائی ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر ۳۰(۲۸جولائی ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر ۳۱(۴اگست ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر ۳۲(۱۱اگست ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر ۳۳(۱۸اگست ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر ۳۴(۲۵اگست ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر ۳۶(یکم ستمبر ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر ۳۷(۸ستمبر ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر ۳۸(۱۵ستمبر ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر ۳۹(۲۲ستمبر ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۶، نمبر ۴۰(۲۹ستمبر ۱۹۲۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۶، نمبر ۴۱ (۱۳ اکتوبر ۱۹۲۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۶، نمبر ۴۲ (۲۰ اکتوبر ۱۹۲۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۶، نمبر ۴۳ (۲۷ اکتوبر ۱۹۲۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۶، نمبر ۴۴ (۳ نومبر ۱۹۲۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۶، نمبر ۴۵ (۱۰ نومبر ۱۹۲۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۶، نمبر ۴۶ (۱۷ نومبر ۱۹۲۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۶، نمبر ۴۷ (۲۴ نومبر ۱۹۲۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۶، نمبر ۴۸ (یکم دسمبر ۱۹۲۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۶، نمبر ۴۹ (۸ دسمبر ۱۹۲۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۶، نمبر ۵۰ (۱۵ دسمبر ۱۹۲۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۶، نمبر ۵۱ (۲۲ دسمبر ۱۹۲۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۶، نمبر ۵۲ (۲۹ دسمبر ۱۹۲۳ء)، لاہور۔

۱۹۲۴ء:

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۱ (۵ جنوری ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۲ (۱۲ جنوری ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۳ (۱۹ جنوری ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۴ (۲۶ جنوری ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۵ (۲ فروری ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۶ (۹ فروری ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۷ (۱۶ فروری ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۸ (۲۳ فروری ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۹ (یکم مارچ ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۱۰ (۸ مارچ ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۱۱ (۱۵ مارچ ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۱۲ (۲۲ مارچ ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۱۳ (۲۹ مارچ ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۱۷ (۲۶ اپریل ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۱۸ (۳ مئی ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۱۹ (۱۰ مئی ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۲۰ (۱۷ مئی ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۲۱ (۲۴ مئی ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۳۱ (۲۲ مئی ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۲۳ (۷ جون ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۲۴ (۱۴ جون ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۲۵ (۲۱ جون ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۲۶ (۲۸ جون ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۲۷ (۴ جولائی ۱۹۲۴ء)، (چھبیسواں سالگرہ نمبر) لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۲۸ (۱۲ جولائی ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۲۹ (۲۰ جولائی ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۳۰ (۲۶ جولائی ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۳۱ (۲ اگست ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۳۲ (۹ اگست ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۳۳ (۱۶ اگست ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۳۴ (۲۳ اگست ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۳۵ (۳۰ اگست ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۳۶ (۶ ستمبر ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۳۷ (۱۳ ستمبر ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۴۰ (۴ اکتوبر ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۴۱ (۱۱ اکتوبر ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۴۲ (۱۸ اکتوبر ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۴۳ (۲۵ اکتوبر ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۴۴ (۸ نومبر ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۴۵ (۱۵ نومبر ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۴۸ (۶ دسمبر ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۴۹ (۱۳ دسمبر ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۲۷، نمبر ۵۰ (۲۰ دسمبر ۱۹۲۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۷، نمبر۵۱(۲۷دسمبر۱۹۲۴ء)،لاہور۔

۱۹۲۵ء:

تہذیب نسواں، جلد۲۸، نمبر۲(۱۰جنوری۱۹۲۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۸، نمبر۳(۱۷جنوری۱۹۲۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۸، نمبر۸(۲۱فروری۱۹۲۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۸، نمبر۹(۲۸فروری۱۹۲۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۸، نمبر۱۱(۱۴مارچ۱۹۲۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۸، نمبر۱۲(۲۱مارچ۱۹۲۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۸، نمبر۱۳(۲۸مارچ۱۹۲۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۸، نمبر۲۰(۱۶مئی۱۹۲۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۸، نمبر۲۱(۲۳مئی۱۹۲۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۸، نمبر۲۲(۳۰مئی۱۹۲۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۸، نمبر۶(۲۳جون۱۹۲۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۸، نمبر۱۳(۲۴جون۱۹۲۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۸، نمبر۴(۲۷جولائی۱۹۲۵لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۸، نمبر۳۷(۱۲ستمبر۱۹۲۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۸، نمبر۴۱(۱۰اکتوبر۱۹۲۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۸، نمبر۴۵(۷نومبر۱۹۲۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۸، نمبر۴۸(۲۸نومبر۱۹۲۵ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۸، نمبر۵۱(۱۹دسمبر۱۹۲۵ء)،لاہور۔

۱۹۲۶ء:

تہذیب نسواں، جلد۲۹، نمبر۲۱(۲۲مئی۱۹۲۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۹، نمبر۲۶(۲۶جون۱۹۲۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۹، نمبر۳۰،۲۴جولائی۱۹۲۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۹، نمبر۳۱(۳۱جولائی۱۹۲۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۹، نمبر۳۲(۷اگست۱۹۲۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۹، نمبر،۴۱(۱۹اکتوبر۱۹۲۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۹، نمبر۴۲(۱۶اکتوبر ۱۹۲۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۹، نمبر۴۵(۶نومبر ۱۹۲۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۹، نمبر۴۷(۲۰نومبر ۱۹۲۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۹، نمبر۴۸(۲۷نومبر ۱۹۲۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۹، نمبر۴۹(۴دسمبر ۱۹۲۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۹، نمبر۵۰(۱۱دسمبر ۱۹۲۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۹، نمبر۵۱(۱۸دسمبر ۱۹۲۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۲۹، نمبر۵۲(۲۵دسمبر ۱۹۲۶ء)،لاہور۔

۱۹۲۷ء:

تہذیب نسواں، جلد۳۰، نمبر۱(۱جنوری ۱۹۲۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۰، نمبر۲(۸جنوری ۱۹۲۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۰، نمبر۳(۱۵جنوری ۱۹۲۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۰، نمبر۴(۲۲جنوری ۱۹۲۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۰، نمبر۵(۲۹جنوری ۱۹۲۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۰، نمبر۶(۵فروری ۱۹۲۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۰، نمبر۷(۱۲فروری ۱۹۲۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۰، نمبر۸(۱۹فروری ۱۹۲۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۰، نمبر۹(۲۶فروری ۱۹۲۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۰، نمبر۱۰(۵مارچ ۱۹۲۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۰، نمبر۱۱(۱۲مارچ ۱۹۲۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۰، نمبر۱۲(۱۹مارچ ۱۹۲۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۰، نمبر۱۳(۲۶مارچ ۱۹۲۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۰، نمبر۱۴،(۲۹مارچ ۱۹۲۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۰، نمبر۱۵(۲اپریل ۱۹۲۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۰، نمبر۱۶(۹اپریل ۱۹۲۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۰، نمبر۱۷(۱۶اپریل ۱۹۲۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۰، نمبر۱۸(۲۳اپریل ۱۹۲۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۰، نمبر۱۹(۳۰اپریل ۱۹۲۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۰، نمبر ۲۰ (۷ مئی ۱۹۲۷ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۰، نمبر ۲۱ (۱۴ مئی ۱۹۲۷)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۰، نمبر ۲۲ (۲۸ مئی ۱۹۲۷ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۰، نمبر ۲۳ (۴ جون ۱۹۲۷ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۰، نمبر ۲۴ (۱۱ جون ۱۹۲۷ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۰، نمبر ۲۵ (۱۸ جون ۱۹۲۷ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۰، نمبر ۲۷ (۲ جولائی ۱۹۲۷ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۰، نمبر ۲۸ (۹ جولائی ۱۹۲۷ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۰، نمبر ۲۹ (۱۶ جولائی ۱۹۲۷ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۰، نمبر ۳۰ (۲۳ جولائی ۱۹۲۷ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۰، نمبر ۳۱ (۳۰ جولائی ۱۹۲۷ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۰، نمبر ۳۲ (۶ اگست ۱۹۲۷ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۰، نمبر ۳۳ (۱۳ اگست ۱۹۲۷ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۰، نمبر ۳۴ (۲۰ اگست ۱۹۲۷ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۰، نمبر ۳۵ (۲۷ اگست ۱۹۲۷ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۰، نمبر ۳۶ (۳ ستمبر ۱۹۲۷ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۰، نمبر ۳۷ (۱۰ ستمبر ۱۹۲۷ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۰، نمبر ۳۸ (۱۷ ستمبر ۱۹۲۷ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۰، نمبر ۳۹ (۲۴ ستمبر ۱۹۲۷ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۰، نمبر ۴۰ (۱ اکتوبر ۱۹۲۷ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۰، نمبر ۴۱ (۸ اکتوبر ۱۹۲۷ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۰، نمبر ۴۲ (۱۵ اکتوبر ۱۹۲۷ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۰، نمبر ۴۳ (۲۲ اکتوبر ۱۹۲۷ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۰، نمبر ۴۴ (۲۹ اکتوبر ۱۹۲۷ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۰، نمبر ۴۵ (۵ نومبر ۱۹۲۷ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۰، نمبر ۴۶ (۱۲ نومبر ۱۹۲۷ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۰، نمبر ۴۷ (۱۹ نومبر ۱۹۲۷ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۰، نمبر ۴۸ (۲۶ نومبر ۱۹۲۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۰، نمبر ۴۹(۳دسمبر ۱۹۲۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۰، نمبر ۵۰(۱۰دسمبر ۱۹۲۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۰، نمبر ۵۱(۱۷دسمبر ۱۹۲۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۰، نمبر ۵۲(۲۴دسمبر ۱۹۲۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۰، نمبر ۵۳(۳۱دسمبر ۱۹۲۷ء)،لاہور۔

۱۹۲۸ء:

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۱(۷جنوری ۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۲(۱۴جنوری ۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۳(۲۱جنوری ۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۴(۲۸جنوری ۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۵(۴فروری ۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۶(۱۱فروری ۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۷(۱۸فروری ۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۸(۲۵فروری ۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۹(۳مارچ ۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۱۰(۱۰مارچ ۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۱۱(۱۷مارچ ۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۱۲(۲۴مارچ ۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۱۳(۳۱مارچ ۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۱۴(۷اپریل ۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۱۵(۱۴اپریل ۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۱۶(۲۱اپریل ۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۱۷(۲۸اپریل ۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۱۸(۵مئی ۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۱۹(۱۲مئی ۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۲۰(۱۹مئی ۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۲۱(۲۶مئی ۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۲۲(۲جون ۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۲۳(۹جون۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۲۴(۱۶جون۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۲۵(۲۳جون۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۲۶(۳۰جون۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، سالگرہ نمبر، جلد ۳۱، نمبر ۲۷(۷جولائی۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۲۸(۱۴جولائی۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۲۹(۲۱جولائی۱۹۲۸ء)لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۳۰(۲۸جولائی۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۳۱(۴اگست۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۳۲(۱۱اگست۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۳۳(۱۸اگست۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۳۴(۲۵اگست۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۳۵(یکم ستمبر۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۳۶(۸ستمبر۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۳۷(۱۵ستمبر۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۳۸(۲۲ستمبر۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۳۹(۲۹ستمبر۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۴۰(۶اکتوبر۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۴۱(۱۳اکتوبر۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۴۲(۲۰اکتوبر۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۴۳(۲۷اکتوبر۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۴۴(۳نومبر۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۴۵(۱۰نومبر۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۴۶(۱۷نومبر۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۴۷(۲۴نومبر۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۴۸(یکم دسمبر۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۴۹(۸دسمبر۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۵۰(۱۵دسمبر۱۹۲۸ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۵۱ (۲۲ دسمبر ۱۹۲۸ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۱، نمبر ۵۲ (۲۹ دسمبر ۱۹۲۸ء)، لاہور۔

۱۹۲۹ء:

تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۱ (۵ جنوری ۱۹۲۹ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۲ (۱۲ جنوری ۱۹۲۹ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۳ (۱۹ جنوری ۱۹۲۹ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۴ (۲۶ جنوری ۱۹۲۹ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۵ (۲ فروری ۱۹۲۹ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۶ (۹ فروری ۱۹۲۹ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۷ (۱۶ فروری ۱۹۲۹ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۸ (۲۳ فروری ۱۹۲۹ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۹ (۲ مارچ ۱۹۲۹ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۱۰ (۹ مارچ ۱۹۲۹ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۱۱ (۱۶ مارچ ۱۹۲۹ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۱۳ (۳۰ مارچ ۱۹۲۹ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۱۴ (۶ اپریل ۱۹۲۹ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۱۵ (۱۳ اپریل ۱۹۲۹ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۱۶ (۲۰ اپریل ۱۹۲۹ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۱۷ (۲۷ اپریل ۱۹۲۹ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۱۸ (۴ مئی ۱۹۲۹ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۱۹ (۱۱ مئی ۱۹۲۹ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۲۰ (۱۸ مئی ۱۹۲۹ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۲۱ (۲۵ مئی ۱۹۲۹ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۲۲ (۱ جون ۱۹۲۹ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۲۳ (۸ جون ۱۹۲۹ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۲۴ (۱۵ جون ۱۹۲۹ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۲۶ (۲۹ جون ۱۹۲۹ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۲۷ (۶ جولائی ۱۹۲۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۲۸ (۱۳ جولائی ۱۹۲۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۳۰،۲۷ (جولائی ۱۹۲۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۳۱ (۳ اگست ۱۹۲۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۳۲ (۱۰ اگست ۱۹۲۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۳۳ (۱۷ اگست ۱۹۲۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۳۴ (۲۴ اگست ۱۹۲۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۳۵ (۳۱ اگست ۱۹۲۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۳۶ (۷ ستمبر ۱۹۲۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۳۷ (۱۴ ستمبر ۱۹۲۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۳۸ (۲۱ ستمبر ۱۹۲۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۳۹ (۲۸ ستمبر ۱۹۲۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۴۰ (۵ اکتوبر ۱۹۲۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۴۱ (۱۲ اکتوبر ۱۹۲۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۴۲ (۱۹ اکتوبر ۱۹۲۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۴۳ (۲۶ اکتوبر ۱۹۲۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۴۴ (۲ نومبر ۱۹۲۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۴۵ (۹ نومبر ۱۹۲۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۴۶ (۱۶ نومبر ۱۹۲۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۴۷ (۲۳ نومبر ۱۹۲۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۴۸ (۲۹ نومبر ۱۹۲۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۴۹ (۷ دسمبر ۱۹۲۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۵۰ (۱۴ دسمبر ۱۹۲۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۵۱ (۲۱ دسمبر ۱۹۲۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۲، نمبر ۵۲ (۲۸ دسمبر ۱۹۲۹ء)، لاہور۔

۱۹۳۰ء:

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۱ (۴ جنوری ۱۹۳۰ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۲ (۱۱ جنوری ۱۹۳۰ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۳ (۱۸ جنوری ۱۹۳۰ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۴(۲۵جنوری ۱۹۳۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۵(۱فروری ۱۹۳۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۶(۸فروری ۱۹۳۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۷(۱۵فروری ۱۹۳۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۸(۲۲فروری ۱۹۳۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۹(۱مارچ ۱۹۳۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۱۰(۸مارچ ۱۹۳۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۱۱(۱۵مارچ ۱۹۳۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۱۲(۲۲مارچ ۱۹۳۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۱۳(۲۹مارچ ۱۹۳۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۱۴(۵اپریل ۱۹۳۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۱۵(۱۲اپریل ۱۹۳۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۱۶(۱۹اپریل ۱۹۳۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۱۷(۲۶اپریل ۱۹۳۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۱۸(۳مئی ۱۹۳۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۱۹(۱۰مئی ۱۹۳۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۲۰(۱۷مئی ۱۹۳۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۲۱(۲۴مئی ۱۹۳۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۲۲(۳۱مئی ۱۹۳۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۲۳(۷جون ۱۹۳۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۲۴(۱۴جون ۱۹۳۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۲۵(۲۱جون ۱۹۳۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۲۶(۲۸جون ۱۹۳۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۲۷(۵جولائی ۱۹۳۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۲۸(۱۲جولائی ۱۹۳۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۲۹(۱۹جولائی ۱۹۳۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۳۰(۲۶جولائی ۱۹۳۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۳۱(۲اگست ۱۹۳۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۳۲(۹ اگست ۱۹۳۰ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۳۳(۱۶ اگست ۱۹۳۰ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۳۴(۲۳ اگست ۱۹۳۰ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۳۵(۳۰ اگست ۱۹۳۰ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۳۶(۶ ستمبر ۱۹۳۰ء)لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۳۷(۱۳ ستمبر ۱۹۳۰ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۳۸(۲۰ ستمبر ۱۹۳۰ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۳۹(۲۷ ستمبر ۱۹۳۰ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۴۰(۴ اکتوبر ۱۹۳۰ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۴۱(۱۱ اکتوبر ۱۹۳۰ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۴۲(۱۸ اکتوبر ۱۹۳۰ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۴۳(۲۵ اکتوبر ۱۹۳۰ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۴۴(یکم نومبر ۱۹۳۰ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۴۵(۷ نومبر ۱۹۳۰ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۴۶(۱۴ نومبر ۱۹۳۰ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۴۷(۲۱ نومبر ۱۹۳۰ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۴۸(۲۸ نومبر ۱۹۳۰ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۳، نمبر ۴۹(۶ دسمبر ۱۹۳۰ء)، لاہور۔

۱۹۳۱ء:

تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۳(۱۷ جنوری ۱۹۳۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۴(۲۴ جنوری ۱۹۳۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۵(۳۱ جنوری ۱۹۳۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۶(۷ فروری ۱۹۳۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۷(۱۴ فروری ۱۹۳۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۹(۲۸ فروری ۱۹۳۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۱۰(۷ مارچ ۱۹۳۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۱۱(۱۴ مارچ ۱۹۳۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۱۲(۲۱ مارچ ۱۹۳۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۱۳(۲۸مارچ ۱۹۳۱ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۱۴(۴اپریل ۱۹۳۱ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۱۵(۱۱اپریل ۱۹۳۱ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۱۶(۱۸اپریل ۱۹۳۱ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۱۷(۲۵اپریل ۱۹۳۱ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۱۸(۱مئی ۱۹۳۱ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۱۹(۹مئی ۱۹۳۱ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۲۰(۱۶مئی ۱۹۳۱ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۲۱(۲۳مئی ۱۹۳۱ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۲۲(۳۰مئی ۱۹۳۱ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۲۳(۶جون ۱۹۳۱ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۲۴(۱۳جون ۱۹۳۱ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۲۵(۲۰جون ۱۹۳۱ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۲۶(۲۷جون ۱۹۳۱ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۲۷(۴جولائی ۱۹۳۱ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۲۸(۱۱جولائی ۱۹۳۱ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۲۹(۱۸جولائی ۱۹۳۱ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۳۰(۲۵جولائی ۱۹۳۱ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۳۱(۱اگست ۱۹۳۱ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۳۲(۸اگست ۱۹۳۱ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۳۳(۱۵اگست ۱۹۳۱ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۳۶(۵ستمبر ۱۹۳۱ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۳۷(۱۲ستمبر ۱۹۳۱ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۳۸(۱۹ستمبر ۱۹۳۱ـء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۳۹(۲۶ستمبر ۱۹۳۱ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۴۰(۳اکتوبر ۱۹۳۱ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۴۱(۱۰اکتوبر ۱۹۳۱ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۴۲،(۱۷اکتوبر ۱۹۳۱ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۴۳(۲۴اکتوبر ۱۹۳۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۴۴(۱۳اکتوبر ۱۹۳۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۴(۷نومبر ۱۹۳۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۴۶(۱۴نومبر ۱۹۳۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۴۷(۲۱نومبر ۱۹۳۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۴۸(۲۸نومبر ۱۹۳۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۴۹(۵دسمبر ۱۹۳۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۵۰(۱۲دسمبر ۱۹۳۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۴، نمبر ۵۱(۱۹دسمبر ۱۹۳۱ء)، لاہور۔

۱۹۳۲ء:

تہذیب نسواں، جلد ۳۵، نمبر ۱(۲جنوری ۱۹۳۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۵، نمبر ۲(۹جنوری ۱۹۳۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۵، نمبر ۳(۱۶جنوری ۱۹۳۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۵، نمبر ۴(۲۳جنوری ۱۹۳۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۵، نمبر ۵(۳۰جنوری ۱۹۳۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۵، نمبر ۶(۶فروری ۱۹۳۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۵، نمبر ۷(۱۳فروری ۱۹۳۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۵، نمبر ۸(۲۰فروری ۱۹۳۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۵، نمبر ۹(۲۷فروری ۱۹۳۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۵، نمبر ۱۰(۵مارچ ۱۹۳۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۵، نمبر ۱۱(۱۲مارچ ۱۹۳۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۵، نمبر ۱۲(۱۹مارچ ۱۹۳۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۵، نمبر ۱۳(۲۶مارچ ۱۹۳۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۵، نمبر ۱۴(۲اپریل ۱۹۳۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۵، نمبر ۱۵(۹اپریل ۱۹۳۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۵، نمبر ۱۶(۱۶اپریل ۱۹۳۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۵، نمبر ۱۷(۲۳اپریل ۱۹۳۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۵، نمبر ۱۸(۳۰اپریل ۱۹۳۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۵، نمبر۱۹(۷مئی ۱۹۳۲ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد۳۵، نمبر۲۰(۱۴مئی ۱۹۳۲ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد۳۵، نمبر۲۱(۲۱مئی ۱۹۳۲ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد۳۵، نمبر۲۲(۲۸مئی ۱۹۳۲ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد۳۵، نمبر۲۳(۴جون ۱۹۳۲ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد۳۵، نمبر۲۵(۱۸جون ۱۹۳۲ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد۳۵، نمبر۲۶(۲۵جون ۱۹۳۲ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد۳۵، نمبر۳۳(۱۳اگست ۱۹۳۲ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد۳۵، نمبر۳۴(۲۰اگست ۱۹۳۲ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد۳۵، نمبر۳۵(۲۷اگست ۱۹۳۲ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد۳۵، نمبر۳۶(۳ستمبر ۱۹۳۲ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد۳۵، نمبر۳۷(۱۰ستمبر ۱۹۳۲ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد۳۵، نمبر۳۸(۱۷ستمبر ۱۹۳۲ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد۳۵، نمبر۳۹(۲۴ستمبر ۱۹۳۲ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد۳۵، نمبر۴۵(۵نومبر ۱۹۳۲ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد۳۵، نمبر۴۹(۳دسمبر ۱۹۳۲ء)،لاہور۔

۱۹۳۲ء:

تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۱(۷جنوری ۱۹۳۳ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۲(۱۴جنوری ۱۹۳۳ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۳(۲۱جنوری ۱۹۳۳ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۴(۲۸جنوری ۱۹۳۳ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۵(۴فروری ۱۹۳۳ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۶(۱۱فروری ۱۹۳۳ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۷(۱۸فروری ۱۹۳۳ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۸(۲۵فروری ۱۹۳۳ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۹(۴مارچ ۱۹۳۳ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۱۰(۱۱مارچ ۱۹۳۳ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۱۱(۱۸مارچ ۱۹۳۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۱۲ (۲۵ مارچ ۱۹۳۳ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۱۳ (یکم اپریل ۱۹۳۳ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۱۴ (۸ اپریل ۱۹۳۳ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۱۵ (۱۵ اپریل ۱۹۳۳ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۱۶ (۲۲ اپریل ۱۹۳۳ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۱۷ (۲۹ اپریل ۱۹۳۳ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۱۸ (۶ مئی ۱۹۳۳ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۱۹ (۱۳ مئی ۱۹۳۳ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۲۰ (۲۰ مئی ۱۹۳۳ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۲۱ (۲۷ مئی ۱۹۳۳ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۲۲ (۳ جون ۱۹۳۳ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۲۳ (۱۰ جون ۱۹۳۳ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۲۴ (۱۷ جون ۱۹۳۳ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۲۵ (۲۴ جون ۱۹۳۳ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۲۶ (یکم جولائی ۱۹۳۳,)Uلاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۲۷ (۸ جولائی ۱۹۳۳,)Uلاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۲۸ (۱۵ جولائی ۱۹۳۳ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۲۹ (۲۲ جولائی ۱۹۳۳ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۳۰ (۲۹ جولائی ۱۹۳۳ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۳۱ (۵ اگست ۱۹۳۳ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۳۲ (۱۲ اگست ۱۹۳۳ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۳۳ (۱۹ اگست ۱۹۳۳ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۳۴ (۲۶ اگست ۱۹۳۳ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۳۵ (۲ ستمبر ۱۹۳۳ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۳۶ (۹ ستمبر ۱۹۳۳ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۳۷ (۱۶ ستمبر ۱۹۳۳ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۳۸ (۲۳ ستمبر ۱۹۳۳ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۶، نمبر ۳۹ (۳۰ ستمبر ۱۹۳۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۴۰(۷اکتوبر۱۹۳۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۴۱(۱۴اکتوبر۱۹۳۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۴۲(۲۱اکتوبر۱۹۳۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۴۳(۲۸اکتوبر۱۹۳۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۴۴(۴نومبر۱۹۳۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۴۵(۱۱نومبر۱۹۳۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۴۶(۱۸نومبر۱۹۳۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۴۷(۲۵نومبر۱۹۳۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۴۸(۲دسمبر۱۹۳۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۴۹(۹دسمبر۱۹۳۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۵۰(۱۶دسمبر۱۹۳۳ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۶، نمبر۵۱(۲۳دسمبر۱۹۳۳ء)،لاہور۔

۱۹۳۴ء:

تہذیب نسواں، جلد۳۷، نمبر۱(۶جنوری۱۹۳۴ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۷، نمبر۲(۱۳جنوری۱۹۳۴ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۷، نمبر۳(۲۰جنوری۱۹۳۴ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۷، نمبر۴(۲۷جنوری۱۹۳۴ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۷، نمبر۵(۳فروری۱۹۳۴ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۷، نمبر۶(۱۰فروری۱۹۳۴ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۷، نمبر۷(۱۷فروری۱۹۳۴ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۷، نمبر۸(۲۴فروری۱۹۳۴ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۷، نمبر۹(۳مارچ۱۹۳۴ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۷، نمبر۱۰(۱۰مارچ۱۹۳۴ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۷، نمبر۱۱(۱۷مارچ۱۹۳۴ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۷، نمبر۱۲(۲۴مارچ۱۹۳۴ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۷، نمبر۱۳(۳۱مارچ۱۹۳۴ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۷، نمبر۱۴(۷اپریل۱۹۳۴ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۷، نمبر۱۵(۱۴اپریل۱۹۳۴ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۱۶ (۲۱ اپریل ۱۹۳۴ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۱۷ (۲۸ اپریل ۱۹۳۴ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۱۸ (۵ مئی ۱۹۳۴ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۲۰ (۱۹ مئی ۱۹۳۴ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۲۱ (۲۶ مئی ۱۹۳۴ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۲۲ (۲ جون ۱۹۳۴ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۲۳ (۹ جون ۱۹۳۴ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۲۴ (۱۶ جون ۱۹۳۴ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۲۵ (۲۳ جون ۱۹۳۴ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۲۶ (۳۰ جون ۱۹۳۴ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۲۷ (۷ جولائی ۱۹۳۴ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۲۸ (۱۴ جولائی ۱۹۳۴ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۲۹ (۲۱ جولائی ۱۹۳۴ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۳۰ (۲۸ جولائی ۱۹۳۴ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۳۱ (۱ اگست ۱۹۳۴ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۳۳ (۱۸ اگست ۱۹۳۴ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۳۴ (۲۵ اگست ۱۹۳۴ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۳۶ (۸ ستمبر ۱۹۳۴ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۳۷ (۱۵ ستمبر ۱۹۳۴ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۳۹ (۲۹ ستمبر ۱۹۳۴ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۴۰ (۱ اکتوبر ۱۹۳۴ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۴۱ (۱۳ اکتوبر ۱۹۳۴ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۴۳ (۲۷ اکتوبر ۱۹۳۴ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۴۴ (۳ نومبر ۱۹۳۴ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۴۵ (۱۰ نومبر ۱۹۳۴ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۴۶ (۱۷ نومبر ۱۹۳۴ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۴۸ (۱ دسمبر ۱۹۳۴ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۴۹ (۸ دسمبر ۱۹۳۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۵۰ (۱۵ دسمبر ۱۹۳۴ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۷، نمبر ۵۱ (۲۲ دسمبر ۱۹۳۴ء)، لاہور۔

۱۹۳۵ء:

تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۱۰ (۹ مارچ ۱۹۳۵ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۱۱ (۱۶ مارچ ۱۹۳۵ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۱۲ (۲۳ مارچ ۱۹۳۵ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۱۳ (۳۰ مارچ ۱۹۳۵ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۱۴ (۶ اپریل ۱۹۳۵ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۱۵ (۱۳ اپریل ۱۹۳۵ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۱۶ (۲۰ اپریل ۱۹۳۵ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۱۷ (۲۷ اپریل ۱۹۳۵ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۲۳ (۸ جون ۱۹۳۵ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۲۷ (۶ جولائی ۱۹۳۵ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۲۸ (۱۳ جولائی ۱۹۳۵ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۲۹ (۲۰ جولائی ۱۹۳۵ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۳۰ (۲۷ جولائی ۱۹۳۵ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۳۱ (۳ اگست ۱۹۳۵ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۳۲ (۱۰ اگست ۱۹۳۵ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۳۳ (۱۷ اگست ۱۹۳۵ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۳۴ (۲۴ اگست ۱۹۳۵ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۳۵ (۳۱ اگست ۱۹۳۵ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۳۶ (۷ ستمبر ۱۹۳۵ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۳۷ (۱۴ ستمبر ۱۹۳۵ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۳۸ (۲۱ ستمبر ۱۹۳۵ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۳۹ (۲۸ ستمبر ۱۹۳۵ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۴۰ (۵ اکتوبر ۱۹۳۵ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۴۱ (۱۲ اکتوبر ۱۹۳۵ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۳۸، نمبر ۴۲ (۱۹ اکتوبر ۱۹۳۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۸، نمبر۴۳(۲۶اکتوبر۱۹۳۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۸، نمبر۴۴(۲نومبر۱۹۳۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۸، نمبر۴۵(۹نومبر۱۹۳۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۸، نمبر۴۶(۱۲نومبر۱۹۳۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۸، نمبر۴۷(۲۳نومبر۱۹۳۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۸، نمبر۴۸(۳۰نومبر۱۹۳۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۸، نمبر۴۹(۷دسمبر۱۹۳۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۸، نمبر۵۰(۱۴دسمبر۱۹۳۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۸، نمبر۵۱(۲۱دسمبر۱۹۳۵ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۸، نمبر۵۲(۲۸دسمبر۱۹۳۵ء)، لاہور۔

۱۹۳۶ء:

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۱(۴جنوری۱۹۳۶ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۲(۱۱جنوری۱۹۳۶ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۳(۱۸جنوری۱۹۳۶ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۴(۲۵جنوری۱۹۳۶ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۵(۱فروری۱۹۳۶ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۶(۸فروری۱۹۳۶ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۷(۱۵فروری۱۹۳۶ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۸(۲۲فروری۱۹۳۶ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۹(۲۹فروری۱۹۳۶ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۱۰(۷مارچ۱۹۳۶ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۱۱(۱۴مارچ۱۹۳۶ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۱۲(۲۱مارچ۱۹۳۶ء)لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۱۳(۲۸مارچ۱۹۳۶ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۱۴(۴اپریل۱۹۳۶ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۱۵(۱۱اپریل۱۹۳۶ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۱۶(۱۸اپریل۱۹۳۶ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۱۷(۲۵اپریل۱۹۳۶ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۱۸(۲مئی۱۹۳۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۱۹(۹مئی۱۹۳۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۲۰(۱۶مئی۱۹۳۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۲۱(۲۳مئی۱۹۳۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۲۲(۳۰مئی۱۹۳۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۲۳(۶جون۱۹۳۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۲۴(۱۳جون۱۹۳۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۲۵(۲۰جون۱۹۳۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۲۶(۲۷جون۱۹۳۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۲۷(۴جولائی۱۹۳۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۲۸(۱۱جولائی۱۹۳۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۲۹(۱۸جولائی۱۹۳۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۳۰(۲۵جولائی۱۹۳۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۳۱(۱اگست۱۹۳۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۳۲(۸اگست۱۹۳۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۳۳(۱۵اگست۱۹۳۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۳۴(۲۲اگست۱۹۳۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۳۵(۲۹اگست۱۹۳۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۳۶(۵ستمبر۱۹۳۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۳۷(۱۲ستمبر۱۹۳۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۳۹(۲۶ستمبر۱۹۳۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۴۰(۳اکتوبر۱۹۳۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۴۱(۱۰اکتوبر۱۹۳۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۴۲(۱۷اکتوبر۱۹۳۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۴۳(۲۴اکتوبر۱۹۳۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۴۴(۳۱اکتوبر۱۹۳۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۴۵(۷نومبر۱۹۳۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۴۶(۱۴نومبر۱۹۳۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۴۷(۲۱نومبر ۱۹۳۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۴۸(۲۸نومبر ۱۹۳۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۴۹(۵دسمبر ۱۹۳۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۵۰(۱۲دسمبر ۱۹۳۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۵۱(۱۹دسمبر ۱۹۳۶ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۳۹، نمبر۵۲(۲۶دسمبر ۱۹۳۶ء)،لاہور۔

۱۹۳۷ء:

تہذیب نسواں، جلد۴۰، نمبر۱(۲جنوری۱۹۳۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۴۰، نمبر۲(۹جنوری۱۹۳۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۴۰، نمبر۳(۱۶جنوری۱۹۳۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۴۰، نمبر۴(۲۳جنوری۱۹۳۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۴۰، نمبر۵(۳۰جنوری۱۹۳۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۴۰، نمبر۶(۶فروری۱۹۳۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۴۰، نمبر۷(۱۳فروری۱۹۳۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۴۰، نمبر۸(۲۰فروری۱۹۳۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۴۰، نمبر۹(۲۷فروری۱۹۳۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۴۰، نمبر۱۰(۶مارچ۱۹۳۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۴۰، نمبر۱۱(۱۳مارچ۱۹۳۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۴۰، نمبر۱۲(۲۰مارچ۱۹۳۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۴۰، نمبر۱۳(۲۷مارچ۱۹۳۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۴۰، نمبر۱۴(۳اپریل۱۹۳۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۴۰، نمبر۱۵(۱۰اپریل۱۹۳۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۴۰، نمبر۱۶(۱۷اپریل۱۹۳۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۴۰، نمبر۱۷(۲۴اپریل۱۹۳۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۴۰، نمبر۱۸(۱مئی۱۹۳۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۴۰، نمبر۱۹(۸مئی۱۹۳۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۴۰، نمبر۲۰(۱۵مئی۱۹۳۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد۴۰، نمبر۲۱(۲۲مئی۱۹۳۷ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۲۲ (۲۹ مئی ۱۹۳۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۲۳ (۵ جون ۱۹۳۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۲۴ (۱۲ جون ۱۹۳۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۲۵ (۱۹ جون ۱۹۳۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۲۶، (۲۶ جون ۱۹۳۷م)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۲۷ (۳ جولائی ۱۹۳۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۲۸ (۱۰ جولائی ۱۹۳۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۲۹ (۱۷ جولائی ۱۹۳۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۳۰ (۲۴ جولائی ۱۹۳۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۳۱ (۳۱ جولائی ۱۹۳۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۳۲ (۷ اگست ۱۹۳۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۳۳ (۱۴ اگست ۱۹۳۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۳۴ (۲۱ اگست ۱۹۳۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۳۵ (۲۸ اگست ۱۹۳۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۳۶ (۴ ستمبر ۱۹۳۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۳۷ (۱۱ ستمبر ۱۹۳۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۳۸ (۱۸ ستمبر ۱۹۳۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۳۹ (۲۵ ستمبر ۱۹۳۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۴۰ (۲ اکتوبر ۱۹۳۷م)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۴۱ (۹ اکتوبر ۱۹۳۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۴۲ (۱۶ اکتوبر ۱۹۳۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۴۳ (۲۳ اکتوبر ۱۹۳۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۴۴ (۳۰ اکتوبر ۱۹۳۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۴۵ (۶ نومبر ۱۹۳۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۴۶ (۱۳ نومبر ۱۹۳۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۴۷ (۲۰ نومبر ۱۹۳۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۴۸ (۲۷ نومبر ۱۹۳۷م)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۴۹ (۴ دسمبر ۱۹۳۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۵۰ (۱۱ دسمبر ۱۹۳۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۵۱ (۱۸ دسمبر ۱۹۳۷ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۰، نمبر ۵۲ (۲۵ دسمبر ۱۹۳۷ء)، لاہور۔

۱۹۳۸ء:

تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۶ (۸ فروری ۱۹۳۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۸ (۱۹ فروری ۱۹۳۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۱۱ (۱۲ مارچ ۱۹۳۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۱۸ (۳۰ اپریل ۱۹۳۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۱۹ (۷ مئی ۱۹۳۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۲۲ (۲۸ مئی ۱۹۳۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۲۳ (۴ جون ۱۹۳۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۲۴ (۱۱ جون ۱۹۳۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۲۵ (۱۸ جون ۱۹۳۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۲۸ (۹ جولائی ۱۹۳۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۳۰ (۲۳ جولائی ۱۹۳۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۳۱ (۳۰ جولائی ۱۹۳۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۳۲ (۶ اگست ۱۹۳۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۳۳ (۱۳ اگست ۱۹۳۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۳۴ (۲۰ اگست ۱۹۳۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۳۵ (۲۸ اگست ۱۹۳۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۳۶ (۳ ستمبر ۱۹۳۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۳۷ (۱۰ ستمبر ۱۹۳۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۳۸ (۱۷ ستمبر ۱۹۳۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۳۹ (۲۴ ستمبر ۱۹۳۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۴۰ (۱ اکتوبر ۱۹۳۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۴۱ (۸ اکتوبر ۱۹۳۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۴۲ (۱۵ اکتوبر ۱۹۳۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۴۳ (۲۲ اکتوبر ۱۹۳۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۴۴ (۲۹ اکتوبر ۱۹۳۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۴۶ (۱۲ نومبر ۱۹۳۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۴۷ (۱۹ نومبر ۱۹۳۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۴۸ (۲۶ نومبر ۱۹۳۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۴۹ (۳ دسمبر ۱۹۳۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۵۰ (۱۰ دسمبر ۱۹۳۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۵۱ (۱۷ دسمبر ۱۹۳۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۱، نمبر ۵۲ (۲۴ دسمبر ۱۹۳۸ء)، لاہور۔

۱۹۳۹ء:

تہذیب نسواں، جلد ۴۲، نمبر ۶ (۱۱ فروری ۱۹۳۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۲، نمبر ۷ (۱۸ فروری ۱۹۳۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۲، نمبر ۸ (۲۵ فروری ۱۹۳۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۲، نمبر ۹ (۴ مارچ ۱۹۳۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۲، نمبر ۱۰ (۱۱ مارچ ۱۹۳۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۲، نمبر ۱۱ (۱۸ مارچ ۱۹۳۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۲، نمبر ۱۵ (۱۵ اپریل ۱۹۳۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۲، نمبر ۱۶ (۲۲ اپریل ۱۹۳۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۲، نمبر ۲۱ (۲۷ مئی ۱۹۳۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۲، نمبر ۲۲ (۳ جون ۱۹۳۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۲، نمبر ۲۳ (۱۰ جون ۱۹۳۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۲، نمبر ۲۴ (۱۷ جون ۱۹۳۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۲، نمبر ۲۵ (۲۴ جون ۱۹۳۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۲، نمبر ۲۶ (۱ جولائی ۱۹۳۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۲، نمبر ۲۷ (۱۵ جولائی ۱۹۳۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۲، نمبر ۲۸ (۲۲ جولائی ۱۹۳۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۲، ۴۲ (۱۱۲ اگست ۱۹۳۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۲، (۱۹ اگست ۱۹۳۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۲، ۴۲ (۷، اکتوبر ۱۹۳۹ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۲(۱۴،اکتوبر ۱۹۳۹ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۲(۲۱،اکتوبر ۱۹۳۹ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۲(۲۸اکتوبر ۱۹۳۹ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۲(۲دسمبر ۱۹۳۹ء)،لاہور۔

۱۹۴۰ء:

تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۱(۶جنوری ۱۹۴۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۲(۱۳، جنوری ۱۹۴۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۳(۲۰، جنوری ۱۹۴۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۴(۲۷، جنوری ۱۹۴۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۵(۳فروری ۱۹۴۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۶(۱۰فروری ۱۹۴۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۷(۱۷فروری ۱۹۴۰ء)لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۸(۲۴، فروری ۱۹۴۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۹(۲مارچ ۱۹۴۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۱۰(۹مارچ ۱۹۴۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۱۱(۱۶مارچ ۱۹۴۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۱۲(۲۳،مارچ ۱۹۴۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۱۳(۳۰مارچ ۱۹۴۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۱۴(۶اپریل ۱۹۴۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۱۵(۱۳اپریل ۱۹۴۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۱۶(۲۰اپریل ۱۹۴۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۱۷(۲۷اپریل ۱۹۴۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۱۸(۴مئی ۱۹۴۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۱۹(۱۱مئی ۱۹۴۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۲۰(۱۸مئی ۱۹۴۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۲۱(۲۵مئی ۱۹۴۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۲۲(۱جون ۱۹۴۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۲۳(۸جون ۱۹۴۰ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۲۴ (۱۵جون ۱۹۴۰ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۲۵ (۲۲جون ۱۹۴۰ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۲۶ (۲۹جون ۱۹۴۰ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۲۷ (۶جولائی ۱۹۴۰ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۲۸ (۱۳جولائی ۱۹۴۰ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۳۰ (۲۷جولائی ۱۹۴۰ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۳۱ (۳اگست ۱۹۴۰ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۳۲ (۱۰اگست ۱۹۴۰ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۳۳ (۱۷اگست ۱۹۴۰ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۳۴ (۲۴اگست ۱۹۴۰ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۳۵ (۳۱اگست ۱۹۴۰ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۳۶ (۷ستمبر ۱۹۴۰ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۳۷ (۱۴ستمبر ۱۹۴۰ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۳۸ (۲۱ستمبر ۱۹۴۰ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۳۹ (۲۸ستمبر ۱۹۴۰ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۴۰ (۵اکتوبر ۱۹۴۰ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۴۱ (۱۲اکتوبر ۱۹۴۰ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۴۲ (۱۹اکتوبر ۱۹۴۰ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۴۳ (۲۶اکتوبر ۱۹۴۰ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۴۴ (۲نومبر ۱۹۴۰ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۴۵ (۹نومبر ۱۹۴۰ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۴۶ (۱۶نومبر ۱۹۴۰ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۴۷ (۲۳نومبر ۱۹۴۰ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۴۸ (۳۰نومبر ۱۹۴۰ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۴۹ (۷دسمبر ۱۹۴۰ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۵۰ (۱۴دسمبر ۱۹۴۰ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۵۱ (۲۱دسمبر ۱۹۴۰ء)،لاہور۔
تہذیب نسواں، جلد ۴۳، نمبر ۵۲ (۲۸دسمبر ۱۹۴۰ء)،لاہور۔

۱۹۴۱ء:

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۱ (۴ جنوری ۱۹۴۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۲ (۱۱ جنوری ۱۹۴۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۳ (۱۸ جنوری ۱۹۴۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۴ (۲۵ جنوری ۱۹۴۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۵ (۱ فروری ۱۹۴۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۶ (۱۵ فروری ۱۹۴۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۸ (۲۲ فروری ۱۹۴۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۹ (۱ مارچ ۱۹۴۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۱۲ (۲۲ مارچ ۱۹۴۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۱۳ (۲۹ مارچ ۱۹۴۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۱۴ (۵ اپریل ۱۹۴۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۱۵ (۱۲ اپریل ۱۹۴۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۱۶ (۱۹ اپریل ۱۹۴۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۱۸ (۳ مئی ۱۹۴۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۱۹ (۱۰ مئی ۱۹۴۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۲۰ (۱۷ مئی ۱۹۴۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۲۱ (۲۴ مئی ۱۹۴۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۲۲ (۳۱ مئی ۱۹۴۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۲۳ (۷ جون ۱۹۴۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۲۴ (۱۴ جون ۱۹۴۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۲۵ (۲۱ جون ۱۹۴۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۲۶ (۲۸ جون ۱۹۴۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۲۷ (۵ جولائی ۱۹۴۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۲۸ (۱۲ جولائی ۱۹۴۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۲۹ (۲۶ جولائی ۱۹۴۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۳۰ (۲ اگست ۱۹۴۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۳۱ (۹ اگست ۱۹۴۱ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۳۲(۱۶اگست ۱۹۴۱ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۳۴(۲۳اگست ۱۹۴۱ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۳۷(۱۳ ستمبر ۱۹۴۱ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۳۸(۲۰ ستمبر ۱۹۴۱ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۳۹(۲۷ ستمبر ۱۹۴۱ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۴۰(۴اکتوبر ۱۹۴۱ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۴۱(۱۱اکتوبر ۱۹۴۱ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۴۲(۱۸اکتوبر ۱۹۴۱ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۴۳،(۲۵اکتوبر ۱۹۴۱م)،لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۵۱(۲۰دسمبر ۱۹۴۱ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۴، نمبر ۵۲(۲۷دسمبر ۱۹۴۱ء)،لاہور۔

۱۹۴۲ء:

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۲(۱۰جنوری ۱۹۴۲ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۳(۱۷جنوری ۱۹۴۲ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۴(۲۴جنوری ۱۹۴۲ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۵(۳۱جنوری ۱۹۴۲ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۶(۷فروری ۱۹۴۲ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۷(۱۴فروری ۱۹۴۲ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۸(۲۱فروری ۱۹۴۲ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۹(۲۸فروری ۱۹۴۲ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۱۰(۷مارچ ۱۹۴۲ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۱۱(۱۴مارچ ۱۹۴۲ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۱۲(۲۱مارچ ۱۹۴۲ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۱۳(۲۸مارچ ۱۹۴۲ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۱۴(۴اپریل ۱۹۴۲ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۱۵(۱۱اپریل ۱۹۴۲ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۱۶(۱۸اپریل ۱۹۴۲ء)،لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۱۷(۲۵اپریل ۱۹۴۲م)،لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۱۸ (۲ مئی ۱۹۴۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۱۹ (۹ مئی ۱۹۴۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۲۰ (۱۶ مئی ۱۹۴۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۲۱ (۲۳ مئی ۱۹۴۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۲۲ (۳۰ مئی ۱۹۴۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۲۳ (۶ جون ۱۹۴۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۲۴ (۱۳ جون ۱۹۴۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۲۵ (۲۰ جون ۱۹۴۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۲۶ (۲۷ جون ۱۹۴۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۲۷ (۴ جولائی ۱۹۴۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۲۸ (۱۱ جولائی ۱۹۴۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۲۹ (۱۸ جولائی ۱۹۴۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۳۰ (۲۵ جولائی ۱۹۴۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۳۱ (۱ اگست ۱۹۴۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۳۲ (۸ اگست ۱۹۴۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۳۳ (۱۵ اگست ۱۹۴۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۳۴ (۲۲ اگست ۱۹۴۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۳۵ (۲۹ اگست ۱۹۴۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۳۶ (۵ ستمبر ۱۹۴۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۳۷ (۱۲ ستمبر ۱۹۴۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۳۸ (۱۹ ستمبر ۱۹۴۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۳۹ (۲۶ ستمبر ۱۹۴۲ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۵، نمبر ۴۰ (۳۱ اکتوبر ۱۹۴۲ء)، لاہور۔

۱۹۴۳ء:

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۱ (۲ جنوری ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۲ (۹ جنوری ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۳ (۱۶ جنوری ۱۹۴۳,U)لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۴ (۲۳ جنوری ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۵(۳۰ جنوری ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۶(۶ فروری ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۷(۱۳ فروری ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۸(۲۰ فروری ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۹(۲۷ فروری ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۱۰(۶ مارچ ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۱۱(۱۳ مارچ ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۱۲(۲۰ مارچ ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۱۳(۲۷ مارچ ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۱۴(۳ اپریل ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۱۵(۱۰ اپریل ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۱۶(۱۷ اپریل ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۱۷(۲۴ اپریل ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۱۸(یکم مئی ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۱۹(۸ مئی ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۲۰(۱۵ مئی ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۲۱(۲۲ مئی ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۲(۲۹ مئی ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۲۳(۵ جون ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۲۴(۱۲ جون ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۲۵(۱۹ جون ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۲۶(۲۶ جون ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۲۷(۳ جولائی ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۲۸(۱۰ جولائی ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۲۹(۱۷ جولائی ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۳۰(۲۴ جولائی ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۳۱(۳۱ جولائی ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۳۲(۷ اگست ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۳۳ (۱۴ اگست ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۳۴ (۲۱ اگست ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۳۵ (۲۸ اگست ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۳۶ (۴ ستمبر ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۳۷ (۱۱ ستمبر ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۳۸ (۱۸ ستمبر ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۳۹ (۲۵ ستمبر ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۴۰ (۲ اکتوبر ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۴۱ (۹ اکتوبر ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۴۲ (۱۶ اکتوبر ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۴۳ (۲۳ اکتوبر ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۴۴ (۳۰ اکتوبر ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۴۵ (۶ نومبر ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۴۶ (۱۳ نومبر ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۴۷ (۲۰ نومبر ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶ نمبر ۴۸ (۲۷ نومبر ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۴۹ (۴ دسمبر ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۵۰ (۱۱ دسمبر ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۵۱ (۱۸ دسمبر ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۶، نمبر ۵۲ (۲۵ دسمبر ۱۹۴۳ء)، لاہور۔

۱۹۴۴ء:

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۱ (۱ جنوری ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۲ (۸ جنوری ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۳ (۱۵ جنوری ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۵ (۲۹ جنوری ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۶ (۵ فروری ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۷ (۱۲ فروری ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۸ (۱۹ فروری ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۱۰(۴مارچ ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۱۱(۱۱مارچ ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۱۲(۱۸مارچ ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۱۳(۲۵مارچ ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۱۴(۱اپریل ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۱۵(۸اپریل ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۱۶(۱۵اپریل ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۱۷(۲۲اپریل ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۱۸(۲۹اپریل ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۱۹(۶مئی ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۲۰(۱۳مئی ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۲۱(۲۰مئی ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۲۲(۲۷مئی ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۲۳(۳جون ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۲۴(۱۰جون ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۲۵(۱۷جون ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۲۸(۸جولائی ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۲۹(۱۵جولائی ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۳(۲۲جولائی ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۳۱(۲۹جولائی ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۳۲(۵اگست ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۳۳(۱۲اگست ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۳(۱۹اگست ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۳۵(۲۶اگست ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۳۶(۲ستمبر ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۳۷(۹ستمبر ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۳۸(۱۶ستمبر ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۳۹(۲۳ستمبر ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۴۰(۳۰ ستمبر ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۴۱(۷ اکتوبر ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۴۲(۱۴ اکتوبر ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۴۴(۲۸ اکتوبر ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۵۱(۱۶ دسمبر ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۵۲(۲۳ دسمبر ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۴۷، نمبر ۵۳(۳۰ دسمبر ۱۹۴۴ء)، لاہور۔

۱۹۴۸ء:

تہذیب نسواں جلد ۵۱، نمبر ۱(۳ جنوری ۱۹۴۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۵۱، نمبر ۲(۱۰ جنوری ۱۹۴۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۵۱، نمبر ۳-۴(۱۷-۲۴ جنوری ۱۹۴۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۵۱، نمبر ۵-۶(۳۱ جنوری-۷ فروری ۱۹۴۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۵۱، نمبر ۷-۸(۱۴-۲۱ فروری ۱۹۴۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۵۱، نمبر ۱۰(۶ مارچ ۱۹۴۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۵۱، نمبر ۱۱(۱۳ مارچ ۱۹۴۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۵۱، نمبر ۱۲(۲۰ مارچ ۱۹۴۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۵۱، نمبر ۱۴-۱۵(۳-۱۰ اپریل ۱۹۴۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۵۱، نمبر ۱۶-۱۷، ۲۴(۱۷ اپریل ۱۹۴۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۵۱، نمبر ۱۸-۱۹(۱-۸ مئی ۱۹۴۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۵۱، نمبر ۲۰(۱۵ مئی ۱۹۴۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۵۱، نمبر ۲۱(۲۲ مئی ۱۹۴۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۵۱، نمبر ۲۲(۲۹ مئی ۱۹۴۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۵۱، نمبر ۲۳(۵ جون ۱۹۴۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۵۱، نمبر ۲۴(۱۲ جون ۱۹۴۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۵۱، نمبر ۲۵(۱۹ جون ۱۹۴۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۵۱، نمبر ۲۶(۲۶ جون ۱۹۴۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۵۱، نمبر ۲۷(۳ جولائی ۱۹۴۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۵۱، نمبر ۲۹(۱۷ جولائی ۱۹۴۸ء)، لاہور۔

تہذیب نسواں جلد ۵۱، نمبر ۳۰ (۲۴ جولائی ۱۹۴۸ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں جلد ۵۱، نمبر ۳۱ (۳۱ جولائی ۱۹۴۸ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں جلد ۵۱، نمبر ۳۲ (۷ اگست ۱۹۴۸ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں جلد ۵۱، نمبر ۳۳ (۱۴ اگست ۱۹۴۸ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں جلد ۵۱، نمبر ۳۶ (۴ ستمبر ۱۹۴۸ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں جلد ۵۱، نمبر ۳۷ (۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں جلد ۵۱، نمبر ۳۸ (۱۸ ستمبر ۱۹۴۸ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں جلد ۵۱، نمبر ۳۹ (۲۵ ستمبر ۱۹۴۸ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں جلد ۵۱، نمبر ۴۰ (۲ اکتوبر ۱۹۴۸ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں جلد ۵۱، نمبر ۴۱ (۹ اکتوبر ۱۹۴۸ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں جلد ۵۱، نمبر ۴۹ (۴ دسمبر ۱۹۴۸ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں جلد ۵۱، نمبر ۵۰ (۱۱ دسمبر ۱۹۴۸ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں جلد ۵۱، نمبر ۵۱ (۱۸ دسمبر ۱۹۴۸ء)، لاہور۔

۱۹۴۹ء:

تہذیب نسواں جلد ۵۲، نمبر ۴ (۲۲ جنوری ۱۹۴۹ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں جلد ۵۲، نمبر ۵ (۲۹ جنوری ۱۹۴۹ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں جلد ۵۲، نمبر ۱۰ (۵ مارچ ۱۹۴۹ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں جلد ۵۲، نمبر ۱۱ (۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں جلد ۵۲، نمبر ۱۲ (۱۹ مارچ ۱۹۴۹ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں جلد ۵۲، نمبر ۱۳ (۲۶ مارچ ۱۹۴۹ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں جلد ۵۲، نمبر ۱۴ (۲ اپریل ۱۹۴۹ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں جلد ۵۲، نمبر ۱۵ (۹ اپریل ۱۹۴۹ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں جلد ۵۲، نمبر ۱۶ (۱۶ اپریل ۱۹۴۹ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں جلد ۵۲، نمبر ۱۷ (۲۳ اپریل ۱۹۴۹ء)، لاہور۔
تہذیب نسواں جلد ۵۲، نمبر ۱۸ (۳۰ اپریل ۱۹۴۹ء)، لاہور۔

Internat...
CENTRAL
LIBRARY
ISLAMABAD